MAUR201DST

علامہ اقبال

ایم۔اے۔اردو

(دوسرا سمسٹر)

آٹھواں پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : Allama Iqbal

ISBN: 978-93-95203-47-0

First Edition: December, 2022

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	June, 2023
Copies	:	7000
Price	:	225/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students.)
Copy Editing	:	Dr. Md. Nehal Afroz, DDE, MANUU, Hyderabad
Title Page	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Karshak Art Printers, Hyderabad

Allama Iqbal

Paper VIII

For M. A. Urdu 2nd semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر و پروگرام کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلسِ اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں
(پروفیسر اردو)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس
سابق صدر، شعبۂ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر ارشاد احمد
اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد نہال افروز
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد اکمل خان
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد جعفر
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کورس کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر محمد امین میر، اقبال انسی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر	اکائی 1, 2, 3, 4
ڈاکٹر محمد شاہد، پنڈت دین دیال اپادھیائے ماڈل انٹر کالج، علی گنج، اتر پردیش	اکائی 5, 6
ڈاکٹر فیاض الدین، اقبال انسی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر	اکائی 7, 8, 12
ڈاکٹر طلعت جہاں، صدر شعبۂ اردو و وائس پرنسپل، شادان ڈگری کالج فار وومن، خیریت آباد، حیدرآباد	اکائی 9
ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 10
ڈاکٹر محمد نہال افروز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 11
ڈاکٹر وسیم اقبال نحوی، اقبال انسی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر	اکائی 13, 16
پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 14
ڈاکٹر محمد جعفر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 15

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	07
پیغام	ڈائرکٹر	08
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	09
بلاک I اقبال کی سوانح اور شخصیت		
اکائی 1۔	علامہ اقبال: حالات زندگی	11
اکائی 2۔	اقبال کی علمی وادبی خدمات	31
اکائی 3۔	اقبال کا فکری ارتقا: اہم تصورات	48
اکائی 4۔	کلام اقبال کا فنی ارتقا	65
بلاک II اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ		
اکائی 5۔	نظم ''خضر راہ'' کا تجزیاتی مطالعہ	80
اکائی 6۔	نظم ''مسجد قرطبہ'' کا تجزیاتی مطالعہ	100
اکائی 7۔	نظم ''طلوع اسلام'' کا تجزیاتی مطالعہ	116
اکائی 8 ۔	نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا تجزیاتی مطالعہ	136
بلاک III اقبال کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ		
اکائی 9۔	بانگ درا کی شامل نصاب غزلیں	152

☆ ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

☆ الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے

☆ نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی

☆ کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

اکائی 10۔ بال جبریل کی شامل نصاب غزلیں 170

☆ اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟

☆ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

☆ پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

☆ عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم

اکائی 11۔ ضرب کلیم کی شامل نصاب غزلیں 191

☆ دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ

☆ نہ میں اعجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی

☆ ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سراغ

☆ دریا میں موتی! اے موجِ بیباک!

اکائی 12۔ ارمغان حجاز کی شامل نصاب رباعیاں 204

☆ فراغت دے اسے کارِ جہاں سے

☆ دگرگوں عالمِ شام و سحر کر

☆ خِرد کی تنگ دامانی سے فریاد

☆ کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے

☆ نہ کر ذِکر فراق و آشنائی

☆ ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟

بلاک IV اقبال کی نثری خدمات

اکائی 13۔ خطوطِ اقبال کا موضوعاتی مطالعہ 216

اکائی 14۔ خطوطِ اقبال کا فکری و فنی مطالعہ 231

اکائی 15۔ خطبات اقبال کا موضوعاتی مطالعہ 248

اکائی 16۔ خطبات اقبال کا فکری و فنی مطالعہ 270

نمونہ امتحانی پرچہ 295

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج وترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد ومنشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد وپیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی پچیسویں سالگرہ منا رہی ہے مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامت فاصلاتی تعلیم از سرنو اپنی کارکردگی کے نئے سنگ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامت فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورت حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل وابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن
وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرزِ تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس (SMS) کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

زبان انسانی خیالات وجذبات کے اظہار کا موثر وسیلہ اور معاشرتی عمل ہے۔اس کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر واضح کرتا ہے اور یہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔زندگی کی دلکشی اور رنگینی زبان کی بدولت ہے۔ہندوستانی زبانوں کی فہرست میں اردو کا نمایاں اور تاریخی مقام ہے۔اگر چہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی تاہم اس کی وسعت اور بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہوجاتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اسے بولا اور سمجھا جارہا ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اسے پڑھایا جارہا ہے۔عالمی سطح پر اردو گیارہویں نمبر پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔اردو کا پیرایہ اظہار خوش گوار نزاکت کا آئینہ دار ہے۔اردو کا لہجہ دل آویز اور شیرینی کا شاہ کار ہے۔یہ زبان ان چند زبانوں میں سے ایک ہے، جو اپنے اندر تمام انسانی آوازوں کی بہ خوبی ادائیگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی زبان کو روزمرہ کے کام تک ہی محدود رکھنا کافی نہیں ہوتا۔بول چال کے علاوہ اس کا لکھنا، پڑھنا اور اس میں موجود ادب سے واقف ہونا بھی از حد ضروری ہے۔تخلیقی اعتبار سے ادب کی مختلف نوعیتیں ہیں، جہاں ادب شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے وہیں اپنے قاری کو مسرت سے بصیرت تک پہنچانے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور سب سے اہم درس وتدریس کی دنیا میں طلبا کی تربیت اور معلومات کی ترسیل کا بھی اہم وسیلہ ہے۔اسی مقصد کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا نے کے لیے نصابی کتابوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا تعلیمی معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبہ کے لیے دوران تعلیم ایک نظامِ تعلیم سے دوسرے نظامِ تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یو جی سی کے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے تمام مضامین میں نصابی کتابوں کی تخلیق واشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ان کتابوں کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ اکتسابی مواد نہ صرف معیاری اور ہمہ گیر ہو بلکہ مضمون کے تمام اہم موضوعات کی نمائندگی بھی کرتا ہو اور مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے معاون ومددگار بھی ہوسکے۔

ایم۔اے اردو کا یہ کورس چار سمسٹرز پر محیط ہے۔ہر سمسٹر میں چار، چار پرچے ہیں۔سب ہی پرچوں میں چار بلاک ہیں، جنہیں سولہ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے تحت موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آپ تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو چاروں پرچوں کے امتحانات دینے کے علاوہ تفویضات کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے، تبھی وہ اس کورس میں کامیاب قرار دیے جائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم۔اے اردو کے آٹھویں پرچے کی یہ کتاب پیش کررہے ہیں، جس کا عنوان ''علامہ اقبال'' ہے۔طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوسکے تجویز کردہ کتابوں اور مشاورتی جماعتوں سے بھی بھرپور استفادہ کریں گے۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کوآرڈی نیٹر

علامہ اقبال

بلاک I: اقبال کی سوانح اور شخصیت

اکائی 1: علامہ اقبال: حالات زندگی

اکائی کے اجزا

1.0		تمہید
1.1		مقاصد
1.2		علامہ اقبال کے حالات زندگی
	1.2.1	آباواجداد
	1.2.2	پیدائش اور خاندان
	1.2.3	ابتدائی اور اعلیٰ تعلیمی سرگرمیاں
	1.2.4	ازدواجی زندگی
1.3		اقبال کے اسفار
	1.3.1	یورپ کا سفر
	1.3.2	حیدرآباد کا سفر
	1.3.3	مدراس کا سفر
	1.3.4	بھوپال کا سفر
1.4		علامہ اقبال کی شخصیت
1.5		اکتسابی نتائج
1.6		کلیدی الفاظ
1.7		نمونہ امتحانی سولات
	1.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	1.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	1.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
1.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

علامہ اقبال کا شمار دنیا کے عظیم فن کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اُردو اور فارسی کے عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ برصغیر کے بڑے مفکر بھی تھے۔ اپنی بے مثال فن مہارت اور منفرد فکری عظمت کی بنا پر علامہ اقبال کو اُردو ادب میں ایک اونچا مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے جو کام لیا ہے اس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اقبال جتنی قدرت اردو و فارسی پر رکھتے تھے اتنی ہی دسترس ان کو انگریزی زبان پر بھی تھی۔ انہوں نے اردو اور فارسی ادب میں گہرائی، وسعت اور توانائی پیدا کی اور خصوصاً اردو زبان کو بڑی بننے اور دنیا کے مہذب زبانوں میں کھڑی ہونے کے قابل بنایا۔ انہوں نے جس طرح علمی و ادبی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ قابل قدر ہی نہیں بلکہ دستاویزی حیثیت کا حامل بھی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے اُردو ادب کے طلباء کے لیے برصغیر کے مقبول اور معروف شاعر علامہ اقبال کی حیات اور شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- ☆ اقبال کی شخصیت کی گوناگوں خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ اقبال کے عہد کا مکمل احاطہ کر سکیں۔
- ☆ یورپ کے سفر و قیام کے بارے میں واضح گفتگو کر سکیں۔
- ☆ اقبال کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیمی سرگرمیوں پر سیر حاصل گفتگو کر سکیں۔

1.2 علامہ اقبال کے حالات زندگی

1.2.1 آباواجداد:

علامہ اقبال کے آباواجداد کا تعلق کشمیری برہمن کے ایک قدیم خاندان سے تھا۔ ان کے جداعلیٰ بابا لول حج یا لولی حاجی پندرویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب کے زمانے میں حضرت شیخ نورالدین نورانی (جو علمدارِ کشمیر کے نام سے مشہور ہیں) کے خلیفہ کے ہاتھ پر مشرف بااسلام ہوئے۔ گوت (ذات) ان کی ''سپرو'' تھی۔ ''پرو'' (کشمیری میں پڑھنے کے معنٰی میں آتا ہے) س (تعظیم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے (سپرو) یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے تعظیماً اپنے ان ہندوں بھائیوں کو دیا تھا۔ جنہوں نے قدیم رسوم و تعصّباتِ قومی و مذہبی چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم سیکھنا شروع کیا تھا۔ یہ طبقہ رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت (ذات) کی طرح مشہور ہو گیا۔ اقبال کے اجداد نے کشمیر چھوڑ سیالکوٹ میں سکونت اختیار کر لی اور وہاں پر کشمیری لوئیوں اور دُسوں (یہ ایک قسم کی چادریں ہوتی ہیں) کی فروخت کا کاروبار شروع کیا۔ اقبال برہمن زاد ہونے کا اعتراف اپنے کلام میں مختلف جگہوں پر کرتے ہیں۔ ضرب کلیم میں ایک جگہ کسی سید ذات سے مخاطب ہو کر یوں فرماتے ہیں۔

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی

تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد

1.2.2 پیدائش اور خاندان:

اقبال کی پیدائش سے کچھ روز قبل ان کے صوفی منش والد نے خواب میں دیکھا کہ کسی وسیع میدان میں بہت سے لوگ فضا میں ایک سفید کبوتر کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کبوتر کبھی نیچے اترتا اور کبھی ایسی اونچائی پکڑتا کہ تارا بن کر آسمان سے جڑ جاتا۔ اسے پکڑنے کے لیے سب کے سب دیوانے ہو رہے تھے کہ یہ پرندہ میری جھولی میں ہی آ کر گرے۔ بالآخر کچھ وقت گذرنے کے بعد وہ پرندہ اقبال کے والد کی جھولی میں آ گرا۔ شیخ نور محمد (والد اقبال) نے اسے اشارہ غیبی سمجھا اور اپنے دل کو اس یقین سے بھرا ہوا پایا کہ خدا انہیں بیٹا عطا کرے گا جو دین اسلام کی خدمت میں بڑا نام پیدا کرے گا پھر اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی اور علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء جمعہ کے دن فجر کے وقت سیالکوٹ کے ایک بازار چوڑیگراں کے ایک چھوٹے سے مکان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب کا نام شیخ نور محمد تھا۔ دادا کا نام شیخ رفیق تھا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے ایک شیخ نور محمد (والد اقبال) اور دوسرے شیخ غلام قادر۔ شیخ نور محمد کی شادی ''امام بی بی'' (والدہ اقبال) سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔، شیخ عطا محمد (بھائی) اور شیخ محمد اقبال جو آگے چل کر حکیم الامت اور شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے مشہور ہوئے۔ شیخ نور محمد عالی ظرف، نیک، شفیق، حلیم اور بردبار انسان تھے۔ انہوں نے کسی مکتب میں تعلیم تو نہیں پائی تھی البتہ حروف شناسی ہونے کے سبب اردو اور فارسی کتابیں پڑھ لیتے تھے۔ تصوف کی پیچیدگیوں سے بھی آشنا تھے۔ بعض لوگ تصوف کے کتابوں کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے ان سے رجوع کرتے اس لیے بعض ہم عصر اکابر علم انہیں ان پڑھ فلسفی کہتے تھے۔ صوفیہ اور علما کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے شریعت اور طریقت کے نکات و رموز سے پوری طرح آگاہ تھے۔ بزرگان دین کی طرح نہایت سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کی اسی درویشانہ زندگی کی وجہ سے آپ کے یہاں کئی غیر معمولی کشف و کرامات بھی دیکھے گئے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم اپنی بیش بہا تصنیف میں ایک واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ''علامہ اقبال نے ایک روز ہم سے فرمایا کہ والد مرحوم کو غیر معمولی روحانی مشاہدات بھی ہوتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ والدہ مرحومہ کا بیان ہے کہ اندھیری رات تھی، کمرے میں چراغ نہ تھا آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمرہ تمام روشن ہے۔ حالاں کہ نہ باہر چاندنی تھی اور نہ چراغ '' کلام اللہ کی تلاوت اکثر کرتے اور اسی کو دین و دنیا کی ترقی کا سبب سمجھتے تھے۔ ان کی یہ تاکید اپنی اولاد کو بھی تھی۔ اقبال خود بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اُٹھ کر تلاوت قرآن کیا کرتے۔ ایک دن صبح سویرے ان کے والد ان کے قریب سے گذرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی، تو تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انہوں نے کچھ مدت بعد اقبال کے اصرار پر وہ بات بتا دی۔ ایک دن صبح جب اقبال حسب دستور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ تو وہ ان کے پاس آئے اور شفقت سے فرمایا، بیٹا! مجھے کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہم کلام ہے۔ علامہ کی زندگی کے اوراق شاہد ہیں کہ انہوں نے اس نصیحت پر شدت سے عمل کیا۔ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اکثر اشکبار ہو جاتے تھے اور وجد میں آ جاتے تھے۔ اقبال نے بارگاہِ رسالت مآب میں یہاں تک اپنے کلام کے حوالے سے دعویٰ کیا تھا کہ اگر میرا کلام قرآن سے باہر ہو تو مجھے قیامت کے روز اپنے پیروں کے بوسے سے محروم رکھنا اس حوالے سے اقبال کا یہ شعر قابل غور ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا
گر در اسرار قرآن سفتہ ام
با مسلمانان اگر حق گفتہ ام

(رموز بے خودی)

ایک اور جگہ بال جبریل کی غزل کا یہ شعر بھی قابل غور ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی، نہ صاحب کشاف

علامہ اقبال کی والدہ (امام بی بی) کو سب ''بے جی' کہتے تھے۔ وہ لکھنا پڑھنا تو نہیں جانتی تھی لیکن اَن پڑھ ہونے کے باوجود بڑی سمجھ دار، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں۔ اپنے حسن سلوک کے باعث محلے کی عورتوں میں بڑی مقبول تھی۔ برادری اور محلّہ داری کے جھگڑوں کا نہایت خوش اسلوبی سے تصفیہ کراتی تھیں۔ اکثر مستورات اپنے زیور یا نقدی ان کے پاس بطور امانت رکھواتیں۔ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت غرباء پروری تھی۔ کئی حاجتمند خواتین کو خفیہ طور پر مدد کرتیں اور امداد کرنے کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ محلے کے غریب گھرانوں کی دس بارہ سال کی تین چار بچیاں اپنے یہاں لے آتیں اور ان کی کفالت کرتیں۔ ان سب کو قرآن مجید، ضروری دینی تعلیم اور کام کاج سکھاتی۔ کچھ مدت بعد ان کے لیے خود اچھا رشتہ تلاش کر کے ان کی شادی کروا دیتیں۔ ان کے اس جذبہ ایثار اور تربیت کی جھلک ہمیں اقبال کی شخصیت میں نمایاں نظر آتی ہے۔ والدین کی روحانی تربیت کے اثرات اقبال کی ساری زندگی پر طاری رہے۔ علامہ اقبال نے اپنی والدہ کی یاد میں ایک پوری نظم لکھ دی ہیں۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا

والدہ مرحوم کی یاد میں (بانگ درا)

1.2.3 ابتدائی اور اعلیٰ تعلیمی سرگرمیاں:

علامہ اقبال کا بچپن فطری کشادگی اور تنوع کے ساتھ گذرا۔ اقبال کی ذہنی و فکری تشکیل میں والدین اور اساتذہ کا فیضان شامل ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مولانا غلام حسن کے مکتب میں حاصل کی۔ ایک دن مولانا سید میر حسن (1844۔1929ء) درس گاہ میں آئے اور اقبال کی کشادہ پیشانی، متین صورت اور بھورے بالوں سے بے حد متاثر ہوئے اور مولانا غلام حسن سے پوچھا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا بیٹا ہے۔ ان کے پاس گئے اور انہیں سمجھایا کہ اس بچے کو محض دینی تعلیم دلوانا کافی نہیں بلکہ اسے جدید تعلیم سے بھی آراستہ کرنا ضروری ہے۔ مولانا میر حسن کی

خواہش پر اقبال کو ان کے سپرد کر دیا گیا۔ اقبال نے ان کے ہی مکتب واقع کوچہ میر حسام الدین میں اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور قرآن مجید کا درس بھی لیتے رہے۔ اسی دوران سید میر حسن نے اسکاچ مشن اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ انہوں نے شیخ نور محمد (والد اقبال) کی رضامندی حاصل کر کے اقبال کو 1884ء میں اسکاچ مشن اسکول میں داخل کرایا۔ اقبال کی ابتدائی طالب علمانہ زندگی پر سید میر حسن (1844ء تا 1929ء) کی شخصیت حاوی نظر آتی ہے۔ سید میر حسن ایک روشن فکر اہل علم تھے، جو مصالح دین اور مصالح دنیا کو پیش نظر رکھ کر شاگردوں کی تربیت کرتے تھے۔ انہوں نے اقبال کو عربی، فارسی اردو ادبیات، علم و حکمت اور تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کے دل میں علوم قدیمہ اور اسلامیہ کے لیے بے پناہ شیفتگی پیدا کر دی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے اقبال ان کی خدمت میں حاضر ہو کر علمی مسائل میں ان سے ہدایت و رہبری لیتے رہے۔ اقبال ان کا بے حد احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کو جب 1923ء میں ''سر'' کے خطاب کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے گورنر پنجاب سے کہا کہ جب تک ان کے استاد سید میر حسن کی علمی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے تب تک خطاب قبول نہیں کریں گے گورنر نے پوچھا کہ کیا سید میر حسن کی کوئی تصنیف ہے؟ اقبال نے جواب دیا، میں خود ان کی تصنیف ہوں۔ چناں چہ اقبال کو خطاب کی پیش کش کے موقع پر سید میر حسن کو بھی شمس العلما کا خطاب ملا۔

سولہ برس کی عمر یعنی 1893ء میں اقبال نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور اسی سال ان کی شادی گجرات (پنجاب) کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی۔ اسکاچ مشن اسکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں بھی شروع ہو چکی تھی لہٰذا اقبال کو ایف۔اے کے لیے کہیں اور نہیں جانا پڑا۔ 1890 میں اقبال نے ایف۔اے کا امتحان 2nd division میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے لاہور کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں ستمبر 1890ء میں گورنمنٹ کالج میں بی۔اے۔ کی کلاس میں داخلہ لیا۔ اور ہاسٹل میں رہنے لگے۔ اپنے لیے انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین منتخب کیے انگریزی اور فلسفہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے اور عربی زبان و ادب کا مطالعے کے لیے اورینٹل کالج جاتے تھے، جہاں مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی محمد دین جیسے استاد درس و تدریس کا کام انجام دے رہے تھے۔

1897ء میں اقبال نے بی۔اے پاس کیا اور ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا یہاں پروفیسر آرنلڈ جیسے جید استاد موجود تھے۔ اقبال کی عملی اور فکری زندگی کی تشکیل میں ان کا اہم رول ہے۔ علامہ اقبال اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ان کی فکری زندگی کی تشکیل میں ان کا کیا رول رہا۔ اس کا اندازہ بانگ درا میں شامل اس نظم سے لگایا جا سکتا ہے جو اقبال نے آرنلڈ کی یاد میں لکھی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سر زمیں

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

تو کہاں ہے اے کلیم ذرہ سینائے علم
تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

اقبال نے 1899ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کی ڈگری مکمل کی۔اسی دوران شاعری کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔انہیں استاد داغ دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔اس طرح تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور شاعری بھی، مگر مشاعروں میں نہیں جاتے تھے۔ایم۔اے پاس کرنے کے بعد اقبال 13 مئی 1899ء اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے متعین ہوگئے۔اسی سال آرنلڈ بھی عارضی طور پر کالج کے قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے۔اقبال تقریباً چار سال تک اورینٹل کالج میں پڑھاتے رہے البتہ بیچ میں چھ ماہ کی رخصت لے کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھائی۔

1890ء سے لیے کر 1899ء تک اقبال کو لاہور کی مختلف انجمنوں نے اپنی طرف کھینچا اور یہاں کے ایک مخصوص باذوق طبقہ سے ان کی شناسائی ہوئی ایک طرف وہ انجمن مشاعرہ کے رکن کی حیثیت سے مشاعروں میں شریک ہوکر روایتی غزلیں پڑھتے تھے تو دوسری طرف ادبی انجمن کے جلسوں میں اپنی تحریر کردہ نئے انداز کی نظمیں سناتے تھے۔نومبر 1899 کی ایک شام کو کچھ بے تکلف ہم جماعت انہیں حکیم امتیاز الدین کے مکان پر ایک محفل مشاعرہ میں کھینچ لے گئے۔بڑے بڑے اساتذہ اس مشاعرہ میں جمع تھے۔اقبال بالکل نئے تھے اس لیے ان کا نام پہلے پکارا گیا۔ غزل پڑھنی شروع کی، جب اس شعر پر پہنچے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

محفل میں موجود مرزا ارشد گورگانی بہت متاثر ہوئے۔بے اختیار ہوکر داد دینے لگے اور ایک بڑے شاعر ہونے کی پیشن گوئی کی جو سچ ثابت ہوئی۔میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اقبال اورینٹل کالج میں بی۔او۔ایل اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو تاریخ، اقتصادیات اور فلسفہ پڑھاتے تھے۔اس چار سال کے عرصے میں انہوں نے مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے یا تالیف کا کام بھی انجام دیا۔

1۔ نظریہ توحید مطلق، پیش کردہ شیخ عبدالکریم الجیلی (انگریزی)
2۔ ولیم اسٹبس (William Stubbs) کی تصنیف کا اردو میں تلخیص وترجمہ۔
3۔ علم الاقتصادیات کے موضوع پر واکر (Walker) کی تصنیف ''پولیٹکل اکانومی'' Political Economy کا اردو میں تلخیص وترجمہ۔
4۔ علم الاقتصاد 1904ء

اقبال اورینٹل کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج میں بھی پڑھاتے تھے۔4 جنوری 1901ء کو انہوں نے لالہ جیارام کی جگہ گورنمنٹ کالج میں عارضی طور پر اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی کی خدمات انجام دینا شروع کیں۔سر عبدالقادر ان دنوں اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔انہیں کچھ عرصے کے لیے رخصت لینا پڑی اور اس دوران میں ان کی جگہ اقبال اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھانے کے فرائض انجام

دیتے رہے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج میں اسی منصب پران کا تقرر 31 مارچ 1903ء تک رہا جب اورینٹل کالج میں بطور میکلوڈ عربک ریڈران کی مدت ملازمت ختم ہوئی تو ان کا تقرر دوبارہ بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (انگریزی) گورنمنٹ کالج میں ہوا یہ مدت 3 جون 1903ء سے 30 ستمبر 1903ء تک تھی لیکن مدت ختم ہونے سے پہلے اس میں چھ ماہ یعنی مارچ 1904ء تک کی توسیع کر دی گئی۔ اس مدت کے اختتام پر انہیں مزید توسیع دی گئی اور وہ فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اسی دوران یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے انہوں نے یکم اکتوبر 1905ء سے تین سال کی بلا تنخواہ رخصت حاصل کی۔

1.2.4 ازدواجی زندگی:

1893 میں اقبال کی کریم بی کے ساتھ شادی رواج کے مطابق ان کے بزرگوں نے طے کی تھی گرچہ کم عمری کی وجہ سے وہ اس شادی پر رضامند نہ ہوئے تھے لیکن بزرگوں کے آگے انکار کی ہمت نہ ہوئی۔ چوں کہ اقبال حصول تعلیم کے لیے مختلف مقامات کو جاتے رہتے تھے اسی لیے کریم بی بی کا بیشتر وقت اپنے والدین کے ساتھ گزرتا تھا۔ بعض اوقات چند ماہ کے لیے سیالکوٹ آجاتیں۔ اقبال گرمی کی چھٹیاں عموماً سیالکوٹ میں اپنے والدین کے ساتھ گزارتے اور کبھی کبھار چند ہفتوں کے لیے اپنے سسرال گجرات بھی چلے جاتے۔ اس دوران ان کے یہاں دو اولادیں پیدا ہوئیں۔ ایک بیٹی معراج بیگم جو کہ 1896 میں پیدا ہوئی اور بیٹا آفتاب اقبال 1898 میں پیدا ہوا، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اور زوجین کے طبیعت کی عدم مناسبت کی وجہ سے یہ شادی ناکام رہی۔ کریم بی بی بچوں سمیت اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں، لیکن ان کی کفالت کی ذمہ داری اقبال خود اٹھاتے۔

ان کی دوسری شادی کشمیری خاندان کی لڑکی سردار بیگم سے ہوئی۔ اس موقع پر صرف نکاح ہی ہوا اور رخصتی عمل میں نہ آئی تھی کہ اقبال کو دو ایک خط موصول ہوئے۔ جن میں سردار بیگم کی چال چلن پر نکتہ چینی کی گئی تھی اسی وجہ سے رخصتی کا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ اقبال اس دوران شدید تذبذب میں تھے کیوں کہ ایک بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی دوسری کے متعلق یہ صورت پیدا ہوگئی۔ بہر حال اقبال نے ارادہ کر لیا کہ سردار بیگم کو طلاق دے کر کسی دوسری جگہ شادی کرنے کی کوشش کریں گے اسی تذبذب میں تین سال گزر گئے۔ ان کی تیسری شادی لدھیانہ کے ایک متمول کشمیری خاندان کی صاحبزادی مختار بیگم سے تقریباً 1913 کے ابتدا میں ہوئی۔

اسی اثنا میں سردار بیگم کے گمنام خطوط کے سلسلے میں اقبال کے احباب نے تحقیق کرائی تو یہ راز منظر عام پر آیا کہ گمنام خطوط تحریر کرنے والا کوئی وکیل تھا جو سردار بیگم کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کروانا چاہتا تھا۔ سردار بیگم نے خود بھی جرات کر کے ایک خط اقبال کو بھجوایا۔ جس میں لکھا تھا کہ انہیں اس بہتان پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب جب کہ میرا نکاح آپ کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روز قیامت آپ کی دامن گیر ہوں گی۔ اقبال یہ خط پڑھ کر اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوئے۔ بالآخر اقبال سردار بیگم کو گھر لانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن چوں کہ پہلے دل میں ارداہ کر لیا تھا سردار بیگم کو طلاق دینے کا تو اسی لیے دوبارہ نکاح پڑھوالیا گیا۔ اور اس سردار بیگم کے بطن سے دو بچے ہوئے جاوید اقبال اور بیٹی منیرہ اقبال۔ مختار بیگم اور سردار بیگم قریب قریب ایک ہی عمر کی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہی پیار سے رہتی تھیں۔ ان دونوں بیویوں او بہن کے اصرار پر اقبال نے اپنی پہلی منکوحہ کو بھی بلوالیا تھا لیکن وہ زیادہ دنوں تک ان کے

ساتھ نہیں رہیں۔الغرض پورا گھرانہ ہنسی خوشی رہنے لگا۔

1.3 اقبال کے اسفار

تاریخ بشریت میں سفر کا عمل اتنا ہی قدیم ہے کہ جتنا خود انسان۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کرہ ارض پر ابتدائے حیات سے ہی سفر شروع ہو گیا تھا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''حضرت آدمؑ کی داستانِ حیات میں شجرِ ممنوعہ کو چکھنے کا واقعہ بظاہر احکامِ ربانی کی خلاف ورزی اور آدمؑ کی اولین بغاوت سے عبارت ہے، تاہم اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس گناہ کی پاداش میں آدمؑ کو جنت سے نکل کر کرہ ارض کی طرف مائل بہ سفر ہونا پڑا۔ چناں چہ آدمؑ کا پہلا سفر ارتقائے نسل انسانی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ابن آدم کے پاؤں سے چکر نہیں نکل سکا۔''

مگر انسانی زندگی میں بعض سفر فقط سیر و تفریح کے لیے ہوتے ہیں لیکن کچھ شخصیات کے سفر علمی و ادبی اور قومی و ملی مسائل کے حل کے لیے، اتحادِ امت کی دعوت، سیاسی و سماجی ضروریات کے مدِ نظر انجام پاتے ہیں ایسی ہی شخصیات میں علامہ اقبال کا بھی شمار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے دوستوں اور ہم نشینوں کے مطابق آپ سفر سے گریزاں رہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقبال بہت تن آسان، سہل پسند اور گھر میں مقید رہنے والے انسان تھے۔ اکثر دیکھا گیا کہ مجمع میں ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے الگ تھلگ اپنی فکر میں مگن رہتے تھے۔

چناں چہ ایسی گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے والا شخص اگر گھر سے نکلے تو یقیناً کوئی بہت اہم مسائل درپیش ہوں گے۔ اقبال کے حصولِ علم کے علاوہ زیادہ تر سفر مسلمانانِ ہند کے سیاسی مسائل کے حل سے متعلق اجلاس، امت کا اتحاد، ملت کے احیا کے لیے منعقدہ کانفرنسیں، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا مشاہدہ، مشہور فلسفیوں 'برگساں' 'میسی نون' سے ملاقات، الہ آباد میں مسلم لیگ کا جلسہ، مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں خصوصی خطاب، علاج کی غرض سے بھوپال کے سفر کی روداد کا بیان کتابوں میں درج ہے۔ ذیل میں اقبال کے چند اہم سفر کا تذکرہ کریں گے جو علامہ نے حصول علم کی راہ میں اور باہمی اتحاد و اتفاق اور عظمت رفتہ کی بحالی کے عنوان سے کیے ہیں۔

1.3.1: یورپ کا سفر:

علامہ اقبال یکم ستمبر کی رات لاہور سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ غلام بھیک نیرنگ اور شیخ اکرام انہیں رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے۔ 2 ستمبر 1905ء صبح دہلی پہنچے اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور منشی نذر محمد استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ ریل سے اتر کر پہلے منشی نذر محمد کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر سب دوستوں نے مل کر نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں پہنچ کر مزار نظام الدین اولیاء پر حاضری دی۔ اقبال نے عالم تنہائی میں تربت کے سرہانے بیٹھ کر اپنی نظم ''التجائے مسافر'' جو ان کے اردو شعری مجموعہ بانگ درا میں شامل ہے پڑھی بعد میں دوستوں کے اصرار پر وہی نظم صحن میں بیٹھ کر مزار کی طرف منہ کر کے دوبارہ پڑھی۔ رستے میں ہمایوں کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھی اور داراشکوہ کے مزار کی زیارت کی پھر میرزا اسداللہ خان غالب کی تربت پر حاضر ہوئے۔ جوش محبت میں غالب کی تربت کو بوسہ دیا اور شہر کو روانہ ہوئے۔ مرزا غالب سے ان کی والہانہ محبت کا اندازہ ایک نظم ''مرزا غالب'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں! آہ! اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ بیں!
گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے
اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

(بانگ درا)

اسی نظم میں علامہ اقبال نے ایک شعر میں غالب کو گوئٹے کا ہمسر قرار دیا ہے۔

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

رات اقبال نے منشی نذر محمد کے ہاں گزاری۔ بالآخر اقبال دہلی سے روانہ ہو کر ممبئی پہنچے۔ ممبئی پہنچنے کا حال اقبال خود تحریر فرماتے ہیں۔

''3 ستمبر کی صبح کو نیرنگ، شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی روانہ ہوا اور 4 ستمبر کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل پر پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلبا کے لیے جو ولایت جا رہے ہوں نہایت موزوں ہے۔۔۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے و خشور (نبی) یاد آجاتے ہیں۔ دکان داری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علما میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ (زندہ رود)

ممبئی میں تین روز ٹھہرنے کے بعد 7 ستمبر 1905ء کو اقبال سمندری جہاز سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی ملکوں سے گذر کر 24 ستمبر 1905ء کو لندن پہنچے۔ ایک رات شیخ عبدالقادر کے ساتھ گزارنے کے بعد 20 ستمبر کو کیمبرج روانہ ہو گئے کیمبرج میں رہائش اختیار کرنے کے فوراً بعد اپنے موضوع تحقیق کے متعلق ضروری رجسٹریشن میونخ یونیورسٹی میں کروایا۔ تحقیقی مقالے کا عنوان The development of Metaphysics in persia (ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقاء) تھا۔ بہر حال 4 نومبر 1907ء کو پروفیسر ایف۔ ہومل کے زیر صدارت اقبال کا زبانی امتحان لیا گیا اور پہلی بار 1908ء میں آپ کا مقالہ لندن سے شائع ہوا اور آرنلڈ کے نام سے منسوب کیا گیا۔ قیام یورپ کے

دوران یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اقبال نے کیمبرج سے بی۔اے کی ڈگری بھی لی اور ساتھ ساتھ انہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے یکم جولائی 1908ء کو بار ایٹ لا کی ڈگری بھی حاصل کی۔اسی سال کچھ دنوں بعد یعنی 1908 میں وطن واپس ہوئے۔

اقبال کے یورپ کے قیام کی کل مدت تقریباً تین سال تھی جیسا کہ کہا گیا کہ اقبال 25 ستمبر 1905ء کو کیمبرج پہنچے اور جولائی 1908ء میں وطن واپس روانہ ہو گئے۔اس دوران عطیہ فیضی، ایما ویگے ناست کی ملاقاتیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ایما ویگے ناست اقبال کی جرمن کی ٹیچر تھی اقبال نے انہیں سے جرمن زبان سیکھی اور جرمن شاعری، فلسفہ اور ادب سے متعارف ہوئے۔اس کے علاوہ لندن میں مختلف جگہوں پر سیر و تفریح بھی کرتے رہے۔اس طرح انہیں یورپی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔تہذیب یورپ کی مادیت پرستی اور تنگ نظری نے ان کی طبیعت کو متنفر کر دیا۔لندن میں قیام کے دوران اقبال نے اسلامی دین و تمدن، اسلامی جمہوریت، مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر، اسلامی تصوف اور اسلام و عقل انسانی جیسے موضوعات پر لیکچر بھی دیے۔اقبال لندن میں چھ ماہ کے لیے عارضی طور پر آرنلڈ کے قائم مقام عربی کے پروفیسر بھی مقرر کیے گئے قیام یورپ کے دوران علامہ اقبال کی فکر میں کافی تغیرات آئے سب سے بڑا انقلاب وطنی قومیت اور فلسفہ و تصوف سے سے متنفر ہو کر ذہنی و قلبی طور پر اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا۔نیز روایتی شاعری کے ذریعہ مشرقی افکار کے اظہار کو وقت کی ضرورت کے مطابق ڈھالنا اور شاعری کو بامقصد بنانا تھا۔یورپ پہنچ کر انہیں مغربی تہذیب و تمدن اور اس کی روح میں کارفرما تصورات کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔مغرب کے فکری، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی غلبے سے آنکھیں چرائے بغیر انہوں نے عالمی تناظر میں امت مسلمہ کے گذشتہ عروج کی بازیافت کے لیے ایک وسیع دائرے میں سوچنا شروع کیا۔

اقبال نے اس دور میں کل چوبیس نظمیں اور سات غزلیں کہیں جو ''بانگ درا'' کے حصّہ دوم کی زینت ہیں۔اس دور کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال میں یہ احساس فروغ پا رہا تھا کہ بامقصد شاعری کو پیمبری کا جزو ہونا چاہیے۔اس دور کے کلام میں مناظر فطرت کی عکاسی، حسن و عشق اور عشق مجازی کی جھلک دکھائی دیتی ہے، لیکن اس دوران وطنی قومیت کی جگہ ملت اسلامیہ یا اس کے تحت عالمی اخوت کا جذبہ فوقیت حاصل کر رہا تھا۔اس کے علاوہ ان نظموں میں تین اہم نظمیں۔مثلاً ''پیام طلبہ علی گڑھ کے نام'' ''پیام عشق'' اور ''پیام'' اس کے علاوہ ایک نظم ''عبدالقادر کے نام'' اور غزل خاص توجہ کے قابل ہیں، جو مشرق و مغرب کے لیے پیشن گوئیوں سے لبریز ہے۔نظم ''عبدالقادر کے نام'' جس میں قوم و ملک کے انداز فکر میں انقلاب لانے کی خاطر ایک طرح کی دعوت شعلہ نوائی دی گئی ہے۔اس دور کی چند نظموں اور غزلوں کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

عبدالقادر کے نام (بانگ درا)

دیار مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

غزل (بانگ درا)

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام (بانگ درا)

اقبال نے تقریباً تین سال سرزمین یورپ کی تعلیم گاہوں میں بسر کیے اور مشرقی و مغربی علوم کے مجمع البحرین بن کر بصد عافیت ہندوستان کی طرف مراجعت کی۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی تیس سالہ زندگی وکالت، تعلیم و تدریس، سفر و سیاحت، سیاست، ملی و قومی مسائل شاعری اور دیگر معاملات میں گزری۔ اس دوران انہوں نے اردو و فارسی زبان و ادب کو ایک اونچا مقام بخشا۔ اردو غزل کی روایت میں اقبال کی غزلیں نئے تجربے کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اردو نظم کو بھی وسعت و گہرائی اور فکری رفعت عطا کی ہے۔ اقبال کی اردو تصانیف میں بانگ درا (1924) بال جبریل (1935ء) ضرب کلیم (1936ء) ارمغان حجاز (1938) شامل ہیں اور فارسی میں پیام مشرق (1923ء) اسرارِ خودی (1910ء) رموزِ بے خودی (1917ء) زبور عجم (1927ء) پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق (1936) رموزِ بے خودی (1917ء) ارمغان حجاز (ان کا فارسی شاعری کا مجموعہ ہے) جیسے شعری شاہ کار موجود ہیں۔

1.3.2: حیدرآباد کا سفر:

حیدرآباد کی ریاست کا شمار ہندوستانی ریاستوں میں متمدن اور خوشحال ریاست کے طور پر ہوتا تھا۔ جہاں کے حکمران اہل سخن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کی ریاستوں کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد حیدرآباد دکن کی ریاست واحد ایسی ریاست تھی جہاں علما، ادبا اور اربابِ دانش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کی اقبال جیسا مفکر و مصلحِ قوم بھی اس ریاست کی علم دوستی اور ملی و سماجی خدمات سے واقف رہا ہوگا اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اقبال نے تو حیدرآباد کا سفر بعد میں طے کیا لیکن ان کی غزلیں، نظمیں وہاں کے اخبار و رسائل اور جریدوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ بذاتِ خود اقبال کو بھی حیدرآباد دکن سے خاص محبت تھی جس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ ان کی تمنا بھی تھی کہ مستقل طور پر حیدرآباد میں رہائش پذیر ہو جائیں لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

اقبال کا خط و کتابت کے ذریعہ غائبانہ طور پر سر اکبر حیدری، مہاراجہ سرکشن پرشاد وغیرہ سے تعارف ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں اقبال کے ایک دوست غلام قادر گرامی بھی نظام کے شاعر خاص کی حیثیت سے حیدرآباد میں مقیم تھے۔ لہٰذا اقبال نے حیدرآباد کے سفر کا ارادہ کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے دس دن کی رخصت لے کر 18 مارچ 1910ء کی رات حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے۔

اقبال کی تحریروں سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ان کے حیدرآباد کے سفر کا مقصد کیا تھا۔ لیکن قرین قیاس ہے کہ اگر نظام کے حضور باریابی ہو جاتی تو اقبال اپنی تصنیف و تالیف اور مستقبل کے عزائم کے بارے میں ضرور گفتگو کرتے۔ حیدرآباد میں اقبال نے سر اکبر حیدری کے ہاں قیام کیا کیوں کہ اقبال اور اکبر حیدری پہلے سے ایک دوسرے سے آشنا تھے ہو سکتا ہے یہ غائبانہ ملاقات اقبال کے دوست غلام قادر گرامی کے توسط سے ہوئی ہو کیوں کہ اقبال 11 مارچ 1910ء کے ایک خط میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

''خط لکھے ہوئے کئی دن گزر گئے، حیدری صاحب کے متعلق استفسار کیا تھا، جواب ندارد۔ دو خطوں کے جواب آپ کے ذمے ہیں۔ آپ کس عالمِ غفلت میں قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں''۔

حیدرآباد کے علم دوست وادبی ذوق رکھنے والوں میں سر اکبر حیدری اوران کی اہلیہ کا نام سرِفہرست ہے۔انہوں نے نہ صرف اقبال کی خوب خاطر تواضع کی بلکہ حیدرآباد کی مقتدر ہستیوں سے انہیں متعارف بھی کرایا۔حیدرآباد میں قیام کے دوران اقبال نے نظم طباطبائی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔اکبر حیدری نے نظم طباطبائی کو بلا بھیجا۔کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اقبال نے ان سے اپنا کلام سنانے کی درخواست کی۔نظم نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب کے درج ذیل اشعار سنائے:

پردہ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر ناقہء گردوں کی کھینچی لیلیٰ شب نے مہار
ہے شفق یا وادیٔ فیروزہ گوں میں لالہ زار ہے سحر یا سبززار آسماں میں آبشار
چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا ہے تارا صبح کا یا بندھا گوش زلیخا میں ہے درشاہوار
آفتاب آیا نظر سردر گریبانِ افق ہوگئی غائب شب یلدا ہوئی صبح آشکار
آتش افروزی جو کی مشرق میں پیر صبح نے ہوگیا مغرب میں پنہاں ساحر زناردار
آنکھ ابھی محو تماشا تھی کہ بجھ کر رہ گئے یا الٰہی جلوۃ انجم تھا یا رقص شرار
حصنِ خاور میں ہوئی فوج کواکب جاگزیں ہوگیا لشکر پہ غالب ایک ترک نیزہ دار

مولوی عبدالرزاق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت نظم کے اشعار سن کر علامہ اقبال عش عش کر رہے تھے۔اوران کی طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ آخر کار انہوں نے اسی موضوع یعنی طلوع سحر پر خود ایک نظم کہہ ڈالی جس میں اپنے قیام حیدرآباد کے دوران مہاراجہ سرکشن پرشاد کی نوازشوں کا ذکر بھی کر دیا۔یہ نظم ''نمود صبح'' کے نام سے بانگ درا میں موجود ہے۔نظم کے ساتھ علامہ نے یہ شذرہ بھی تحریر کیا تھا۔

''گذشتہ مارچ 1910 میں مجھے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانہء وزرات پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسیلینسی مہاراجہ سرکشن بہادر جی-سی-آئی-یمین السلطنت پیش کار وزیر اعظم دولت آصفیہ التخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ہز ایکسیلینسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا۔وہ میری لوح دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگیِ حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے شیریں کام فرمایا۔''

اقبال نے حیدرآباد میں قیام کے دوران ایک اور نظم گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں سے متاثر ہوکر ''گورستان شاہی'' کے عنوان سے لکھی تھی۔(یہ نظم 58 اشعار پر مشتمل ''بانگ درا'' میں شامل ہے)

آسماں بادل کا پہنے خرقہ دیرینہ ہے کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارہ خاموش میں صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
آہ جولاں گاہ عالمگیر یعنی وہ حصار دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار

ان کے حیدرآباد سے لاہور واپسی کے بعد یہ نظم مخزن میں شائع ہوئی تھی اور اس نظم کے ساتھ علامہ نے حسب ذیل شذرہ بھی تحریر کیا تھا۔

''حیدرآباد میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی-اے۔ معتمد محکمہ فنانس جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے۔ مجھے ایک شب اس شاندار مگر حسرت ناک گنبد کی زیارت کو لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہی سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسماں اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام سے منسوب کرتا ہوں جنہوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔''

اس نظم کا آخری شعر ہے:

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

حیدرآباد کے قیام کے بعد علامہ اقبال اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ خلد آباد میں اورنگ زیب کے مزار کی زیارت کی۔ اس زیارت کا جو اثر علامہ کے دل پر ہوا اس کا اظہار انہوں نے ان اشعار میں کیا ہے۔

شاہ عالمگیر گر دوں آستان اعتبار دود ستان گور گان
پایہ اسلامیاں برتر ازو احترامِ شرع پیغمبر ازو
در صف شہنشاں یکتا ستے فقراو از تربتش پیداستے

حیدرآباد سے واپس لاہور آ کر علامہ نے محترمہ عطیہ بیگم کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں بات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ وہ سر اکبر حیدری کے مکان میں ایسے ہی رہے جیسے کہ وہ انہی کا گھر تھا۔ اور یہ بھی لکھا کہ سفر کے دوران ایسے بے تکلف گھریلو ماحول کا لطف ان کو اس سے قبل زندگی میں صرف ایک بار آیا تھا اور وہ ان کے شفیق استاد آرنالڈ کے مکان میں آیا تھا۔

1.3.3: مدراس کا سفر:

''مدراس مسلم ایسوسی ایشن'' جنوبی ہند کی ایک بہت فعال اور متحرک تنظیم تھی۔ جس کے صدر ممتاز صنعت کار و سماجی شخصیت حاجی جمال محمد اور سکریٹری (معتمد) جناب حمید حسن بی۔اے، ایل۔ایل۔بی (علیگ) تھے۔ حاجی جمال محمد علاوہ سماجی و فلاحی کاموں کے مسلمانوں کی مشہور و معروف شخصیتوں کو مدراس میں مدعو کر کے ان سے اسلام سے متعلق موضوعات پر خطبات دلواتے تھے۔ جس کے سلسلے میں شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی مدراس تشریف لاتے تھے۔

13 دسمبر 1924ء کو لاہور میں اقبال نے ایک انگریزی مقالہ ''اسلام میں اجتہاد'' کے عنوان سے پڑھا۔ جس کی روداد اس وقت کے اخباروں میں شائع ہوئی۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ تفصیل ''مدراس مسلم ایسوسی ایشن'' کے صدر جناب جمال محمد کی نظر سے گزری ہو۔ جمال محمد ایک

بڑے تاجر ہونے کے ساتھ عالم و فاضل اور فہم قرآن پر بھی دسترس رکھتے تھے۔انہوں نے اقبال کو مدراس آ کر اجتہاد کے موضوع پر مقالات پڑھنے کی دعوت دی، جو اقبال نے قبول کی اور عازمِ سفر ہوئے۔مدراس پہنچ کر علامہ اقبال نے ''الہیاتِ اسلامیہ اور فلسفہ جدیدہ'' کے عنوان سے خطبات پڑھنا قبول کیا۔

خطبات کی تیاری میں اقبال نے وقتاً فوقتاً سید سلیمان ندوی سے خط و کتابت جاری رکھی۔ان کو جو سوالات تحریر کیے تھے ان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' کے موضوع پر خطبات تیار کرتے وقت اقبال کے سامنے کس قسم کے مسائل تھے۔''مدراس مسلم ایسوسی ایشن'' کی طرف سے اقبال کو 1925ء میں دعوت نامہ بھیجا گیا تھا لیکن خطبات کو تیار کرنے میں تقریباً پانچ سال کا وقت لگا۔وعدہ چھ مقالات کے خطاب کا تھا لیکن جنوری 1929ء تک صرف تین خطبات ہی لکھے جا سکے جو مدراس میں پڑھے گئے بقیہ نومبر 1929ء میں علی گڑھ میں چھ خطبات (بشمول تین خطباتِ مدراس) دیے گئے۔خطبات کے موضوعات مندرجہ ذیل تھے۔

1۔علم اور مذہبی مشاہدات، 2۔مذہبی تجربات کے کشف والہامات کا فلسفیانہ امتحان 3۔تصور باری تعالیٰ اور دعا کا مفہوم

4۔خودی، جبر و اختیار اور حیات بعد الموت 5۔اسلامی ثقافت کی روح 6۔اسلام کی تعمیر میں اصولِ حرکت

اقبال 31 دسمبر 1928ء کی صبح مدراس کے سفر کے ارادے سے دہلی پہنچے اور دو دن مسلم کانفرنس کے معاملات میں مصروف رہنے کے بعد 2 جنوری کو ٹرین سے مدراس کے لیے روانہ ہوئے۔اس سفر میں آپ کے ہمراہ چودھری محمد حسین، ایم۔اے، محمد عبداللہ چغتائی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اور علی بخش تھے۔5 جنوری 1929ء کی صبح مدراس پہنچے۔مدراس اسٹیشن پر علما، فضلا اور امرا و رؤسا کے ہمراہ عوام کا ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔جس میں بیشتر مسلمان تھے اور ترکی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔مدراس میں آپ نے گوکھلے ہال میں تین عالمانہ لیکچرس دیے۔یہی تین لیکچر بنگلور، میسور اور حیدرآباد کی یونیورسٹی کے اصرار پر وہاں بھی دیے۔

7 جنوری 1929ء کو انجمن خواتین اسلام مدراس کے سپاسنامے کے جواب میں علامہ نے شریعت اسلام میں مرد اور عورت کے رتبہ کے موضوع پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔10 جنوری 1929ء کو مہاراجہ میسور کی دعوت پر آپ میسور گئے، وہاں ایک لیکچر دیا۔اسی موقع پر وہاں فلسفہ کے ایک ہندو پروفیسر نے کہا:

> ''ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنائیں مگر وہ ہم سب کے ہیں وہ کسی ایک مذہب اور جماعت کی ملکیت نہیں ہیں۔''

11 جنوری 1929ء کو میسور کے مسلمانوں کے وفد سے ملاقات کی۔اس کے بعد علامہ نے سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے مزاروں پر حاضری دی۔سلطان ٹیپو کے مزار پر میسور کے ایک شاعر نے سلطان شہید کی تعریف میں ایک نظم سنائی جسے سن کر علامہ اتنے متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔میسور سے نظام حیدرآباد کی دعوت پر 14 جنوری 1929ء کو حیدرآباد پہنچے تو اسٹیشن پر مسلمان بچے اور بچیوں نے علامہ کا مشہور ترانہ "چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا" پڑھ کر استقبال کیا۔حیدرآباد میں آپ تین چار دن رہے۔قیامِ حیدرآباد کے دوران عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام مہاراجہ سرکشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کی صدارت میں آپ نے تین خطبے دیئے۔18 جنوری کو علامہ نے نظام حیدرآباد سے ملاقات کی اور انہیں اس موقع پر فارسی کی ایک نظم سنائی اور "رموز بے خودی" کا ایک نسخہ بھی تحفہ میں پیش کیا۔نظام کے پاس ایک بیش بہا قیمتی ہیرا ''شب چراغ''

تھا، آپ نے اسے خاص طور پر منگوا کر دیکھا اور اس کی چمک دمک کی تعریف کی۔ علامہ کا یہ دورہ بڑا ہی کامیاب رہا۔ واپسی پر والد ماجد کی علالت کی خبر ملی۔ لہٰذا علامہ اقبال ان کی مزاج پرسی کے لیے اکثر سیالکوٹ آتے جاتے رہے۔ علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ علامہ کے والد ماجد طویل عمر پا کر 17 اگست 1929ء کو سیالکوٹ میں وفات پا گئے۔

1.3.4 بھوپال کا سفر:

اقبال کا بھوپال کا پہلا سفر ''مسلم رہنماؤں کی کانفرنس'' کے سلسلے میں تھا۔ بھوپال کے نواب نے مسلمانوں میں سیاسی مسائل کو لے کر جو دو گروہ ہو گئے تھے ان کے آپس کے اختلاف کو مٹانے کے لیے یہ کانفرنس منعقد کی تھی۔ دوسرا سفر علاج کی غرض سے تھا۔ بھوپال میں علامہ اقبال کے تعلقات سر راس مسعود سے تھے۔ اقبال کی ملاقات ان سے حیدر آباد کے سفر کے دوران ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب اقبال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں توسیعی لکچر دینے گئے تو دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ 1933ء میں علامہ اقبال، راس مسعود اور سید سلمان ندوی کے ہمراہ افغانستان گئے جہاں یہ رشتے اور بھی مستحکم ہوئے۔ سر راس جب بھوپال میں تھے تو اقبال کی علالت کی خبر ملی۔ حمیدیہ اسپتال کے ڈاکٹروں سے مشورہ کے بعد اقبال کو بغرضِ علاج بھوپال آنے کے لیے خط لکھا، لیکن اقبال 1935ء کی جنوری سے پہلے بھوپال نہ جا سکے۔

علامہ اقبال 31 جنوری کی صبح بھوپال پہنچے۔ سر راس مسعود ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ جس کا حال سر راس مسعود کے پرسنل سکریٹری ممنون حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''مجھے یاد ہے سر راس مسعود بڑی بے چینی سے ریلوے اسٹیشن پہ علامہ کا انتظار کر رہے تھے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کا منتظر ہو۔ جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی، شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اترے۔ سر راس مسعود کی نظر ان پر پڑی تو اس طرف تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے منہ پر اس قدر بوسے لیے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔''

بھوپال میں علامہ کا قیام سر راس مسعود کی رہائش گاہ 'ریاض منزل' میں ہوا۔ وہاں ان کے آرام و آسائش کی تمام سہولیات موجود تھی۔ ریاض منزل کی ایک محفل میں اقبال نے اس نظم کو سنایا جس کا عنوان ''سلطانی'' تھا جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

سید راس مسعود اس شعر کو بار بار پڑھنے لگے اور فلسفہ خودی پر گفتگو شروع ہو گئی۔ جس میں ڈاکٹر عابد حسین اور غلام السیدین نے نمایاں حصہ لیا۔ آخر میں علامہ نے ایک شعر پڑھا۔

دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری با قاہری پیغمبری ست

بھوپال میں اقبال اپنے علاج کے ساتھ ساتھ مختلف علمی کام مثلاً شاعری، ردّ قادیانیت کے بارے میں مضمون تیار کرنا اور قرآن کریم کے حواشی کی بھی تیاری کرتے رہے۔ 28 اگست 1935ء تک اقبال کا قیام بھوپال میں رہا۔ 28 اگست کی شام بھوپال سے روانہ ہوئے اور اگلے دن دہلی پہنچے۔ بھوپال میں انہوں نے اپنی مشہور نظم ''مسولینی'' بھی لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم　　تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام　　تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال جب بھوپال میں تھے تو جو شخصیات باہر سے ان سے ملاقات کے لیے تشریف لائیں ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر غلام السیدین، ڈاکٹر ہادی علی، ڈاکٹر ظفر الحسن، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سر تیج بہادر سپرو، محترمہ سروجنی نائیڈو، مسٹر غلام محمد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی کے نام نمایاں ہیں۔

مذکورہ بالا اسفار کے علاوہ علامہ اقبال نے تقریباً بیس سے زیادہ علمی، ادبی و سیاسی مسائل کے حل کے لیے سفر کیے جن میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دہلی، کانپور اور دہلی کا سفر، کشمیر جنت نظیر کا سفر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دعوتِ خطاب کے لیے، خطبہ الہ آباد کے لیے وہاں کا سفر، دوسری گول میز کانفرنس اور سفرِ یورپ، سفرِ شملہ بغرض امداد مسلمانان الور، مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا، تیسری گول میز کانفرنس اور سفرِ یورپ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا سفر، افغانستان کا سفر اور مولانا حالی کے صد سالہ جشنِ ولادت میں شرکت کے سفر شامل ہیں۔

1.4 علامہ اقبال کی شخصیت

کسی بھی فن یا مفکر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کی مختلف فکری جہات کا احاطہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور جب وہ فن کار اور مفکر برصغیر کے مقبول اور معروف شاعر علامہ اقبال ہوں تو اردو ادب کے طلباء کے لیے ان کی حیات، شخصیت اور ان کے عہد کو جاننا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال اردو و فارسی کے ایسے شاعر ہیں جن کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر کے ایک برہمن خاندان سے تھا۔ اقبال تربیت کے لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کے والد شیخ نور محمد اپنی دینداری اور اخلاق کی وجہ سے سیالکوٹ اور آس پاس کے علاقوں میں قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ بعض ہم عصر اکابر علم انہیں ان پڑھ فلسفی کہتے تھے۔ والد کی طرح والدہ بھی ایک نیک خاتون، مدبر اور غرباء پرور تھیں۔ والدین کی مذہبیت اور روحانیت کے اثرات اقبال پر ساری زندگی چھائے رہے۔ اقبال کے والد تلاوت قرآن کے لیے یہ نصیحت کرتے تھے کہ بیٹا جب قرآن پڑھا کرو تو سمجھو تم پر اترا ہے یعنی خدا تعالیٰ تم سے کلام کر رہا ہے۔ قرآن اور عشق رسول ؐ کا اقبال کی شاعری اور زندگی پر زبردست اثر ہوا۔ ان دونوں موضوعات کا اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ ذکر ملتا ہے۔ قدرت کی طرف سے اقبال کو ایک پروقار شخصیت عطا ہوگئی تھی جس میں غیرت، حمیت، خودی، خودداری اور خود اعتمادی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ اپنی آمدنی میں ہی گزر بسر کرتے اور مطمئن رہتے تھے۔ توکل و قناعت کے ساتھ خودداری اور غیرت مندی ان کے مزاج میں ایسی تھی کہ بلا ضرورت کسی قسم کی مالی امداد طلب کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں انہیں کئی وظائف بھیجے گئے لیکن وہ اکثر و بیشتر واپس کر دیتے تھے۔ ایک بار ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری نے توشہ خانے سے اقبال کو ایک بڑی رقم کا چیک بطور امداد بھیجا تو اقبال نے واپس کر دیا اور چیک کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار بھی تحریر کیے۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
وہ قلندر گو کہ اس میں ہیں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

(سر اکبر حیدری صدر اعظم: حیدر آباد دکن کے نام) ارمغان حجاز

اقبال نہایت اعلیٰ اخلاق سے آراستہ تھے۔ ہر لحاظ سے سادگی کا کامل نمونہ تھے۔ بے نیازی، قناعت اور توکل ان کی طبعیت کا خاصہ تھا۔ مزاج میں نفاست پسندی بدرجہ اتم موجود تھی۔ سکون قلب کی دولت سے مالا مال تھے۔ فقر غیور مسلمان کی شان ہے اور اقبال اس کی عمدہ تصویر تھے۔ حق گوئی اور بے باکی آپ کی سیرت کا نمایاں پہلو تھا اور اس کی آپ تلقین بھی کرتے تھے۔

اقبال روزمرہ زندگی میں پنجابی میں بات کرتے تھے لیکن علمی و ادبی موضوعات پر اردو میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اردو، عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی، جرمن وغیرہ پر بھی اچھی دسترس حاصل تھی۔ مضامین میں تاریخ، تصوف، علم الکلام، فلسفہ، اسلامیات، سیاست، قانون اور عمرانی علوم سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ علامہ اقبال کی زندگی کے تقریباً تئیس سال انیسویں صدی کے آخری زمانے پر محیط ہیں۔ اس دوران وہ مہربان اور غربا پرور ماں کی آغوش اور صوفی منش والد کی نگرانی میں سید میر حسن جیسے عالم و فاضل استاد کی تعلیم و تربیت میں اور پروفیسر آرنلڈ کی بصارت اور بصیرت کے سایے پروان چڑھے اور علم و ادب کے زینے طے کرتے گئے۔ مذہبی اور روحانی تربیت سے مالا مال ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تعلیم حاصل کرنے کی راہ سے گزر کر آپ متعلم بننے کی ذمہ داری قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے گول میز کانفرنس میں بھی دو بار شرکت کی پہلی مرتبہ 1931ء میں اور دوسری بار 1932ء میں۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے انہوں نے یونیورسٹی امتحانات بھی شاندار نمبرات سے پاس کیے لیکن علم کی پیاس کی شدت انہیں یورپ تک لے گئی اور وہاں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے ساتھ ساتھ بیرسٹری بھی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اپنے اندر ایک انقلاب سا محسوس کیا۔

چلی ہے لے کر گھر کے نگار خانہ سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

یورپ سے واپسی کے بعد آپ کی زندگی کا مقصد تبدیل ہو گیا۔ یورپ کے قیام نے اقبال کے ذہنی اور فکری ارتقا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہاں سے ان کی فکر میں وسعت اور دل میں ایک عالمگیر اخوت کا جذبہ پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ وطنیت کے نظریہ کے علاوہ ایک ایسی عالمگیر ملت کا تصور ڈھونڈنے لگے، جس میں سب کے لیے اخوت و ہمدردی اور عدل و انصاف ہو اور وہ انہیں اسلامی تعلیمات میں نظر آیا۔ اپنے علمی و ادبی تبحر ہی سے انہوں نے مشرق کے فکری نظام کو جمود سے بچانے کے لیے فکری کوششیں کیں۔ اپنے متحرک افکار و نظریات سے تمام زندہ دل انسانوں میں خود اعتمادی اور جذبۂ عمل بیدار کیا۔ ان کے کلام میں عشق کی داستان اور فراق کی نوحہ گری نہیں بلکہ اس میں قومی ہمدردی کے جذبات ملتے

ہیں۔انہوں نے مشرقی ومغربی فکری سرچشموں میں نئی قدروں کی تلاش اور جستجو جاری رکھی۔اپنے گردوپیش کی دنیا کا بغور جائزہ لے کر مشرق ومغرب کے نظریات پر مفکرانہ حیثیت سے ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی۔اس تحقیق وجستجو سے حیات انسانی اور اس کے ارتقائی عمل کو ایک مکمل حرکی لائحہ عمل کے تحت لانے کا خواب دیکھتے رہے اور انسان کو بلندی سے ہم کنار کرنے کی فکر کرتے رہے۔اس کے لیے انہوں نے شاعری کو ذریعہ وسیلہ بنایا۔ان کی شاعری روح کو تڑپانے والی اور قلب کو گرمانے والی شاعری ہے۔اقبال نے اپنی شاعری میں خودی، بےخودی، عشق عمل، مردمومن وغیرہ تصورات میں پیش کیے۔انہوں نے نثر میں بھی بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے جو ان کی مفکرانہ اور شاعرانہ عظمت سے صحیح طور پر آشنا ہونے کے لیے ایک وسیلہ اور ان کی عظیم شخصیت کا آئینہ ہے۔اقبال اپنے حیات ہی میں عالمگیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔اقبال نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک مفکر، مصلح قوم ،اخوت کے پیکر اور دانائے راز بھی تھے،جس کے لیے انہیں ''سر'' حکیم اور ''علامہ'' جیسے خطابات سے نوزا گیا۔اُن کے کلام کے متعدد ترجمے کئی بین الاقوامی زبانوں میں کیے گئے۔

1.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درجہ ذیل باتیں سیکھیں۔

☆ علامہ اقبال کا شمار دنیا کے عظیم فن کاروں میں ہوتا ہے۔

☆ علامہ اقبال کے آباواجداد کا تعلق برہمن خاندان سے تھا۔

☆ علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء جمعہ کے دن فجر کے وقت سیالکوٹ کے ایک بازار چوڑی گراں کے ایک چھوٹے سے مکان میں پیدا ہوئے۔

☆ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔دادا کا نام شیخ رفیق تھا۔

☆ ابتدائی تعلیم مولانا غلام حسن کے مکتب میں حاصل کی۔

☆ 1897ء میں اقبال نے بی۔اے پاس کر کے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا تو انہیں پروفیسر آرنلڈ جیسے جید استاد سے پڑھنے کا موقع ملا۔ اقبال کی عملی اور فکری زندگی کی تشکیل میں ان کا اہم رول ہے۔

☆ علامہ اقبال نے مشرق ومغرب دونوں علوم وادبیات کی تعلیم حاصل کی تھی۔

☆ اقبال کے یورپ کے قیام کی کل مدت تقریباً تین سال تھی جیسا کہ کہا گیا کہ اقبال 25 ستمبر 1905ء کو کیمبرج پہنچے اور جولائی 1908ء میں وطن واپس روانہ ہو گئے۔

☆ اقبال نے حیدرآباد میں قیام کے دوران ایک اور نظم گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں سے متاثر ہو کر ''گورستان شاہی'' کے عنوان سے لکھی تھی۔

☆ اقبال 31 دسمبر 1928ء کی صبح مدراس کے سفر کے ارادے سے دہلی پہنچے اور دو دن مسلم کانفرنس کے معاملات میں مصروف رہنے کے بعد 2 جنوری کو ٹرین سے مدراس کے لیے روانہ ہوئے۔اس سفر میں آپ کے ہمراہ چودھری محمد حسین، ایم۔اے، محمد عبداللہ چغتائی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اور علی بخش تھے۔5 جنوری 1929ء کی صبح مدراس پہنچے۔مدراس اسٹیشن پر علما، فضلا اور امرا اور رؤسا کے ہمراہ عوام کا ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔

☆ اقبال کا بھوپال کا پہلا سفر ''مسلم رہنماؤں کی کانفرنس'' کے سلسلے میں تھا۔ بھوپال کے نواب نے مسلمانوں میں سیاسی مسائل کو لے کر جو دو گروہ ہو گئے تھے ان کے آپس کے اختلاف کو مٹانے کے لیے یہ کانفرنس منعقد کی تھی۔ دوسرا سفر علاج کی غرض سے تھا۔ بھوپال میں علامہ اقبال کے تعلقات سر راس مسعود سے تھے۔ اقبال کی ملاقات ان سے حیدر آباد کے سفر کے دوران ہوئی تھی۔

☆ اقبال کے قیام یورپ کے دوران ان کی فکر میں تبدیلی آئی اور وہ قومیت سے ملت کے تصور کی طرف مائل ہوئے۔

1.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
طرز معاشرت	:	زندگی گزارنے کا طریقہ
التوا	:	کسی کام کو عارضی طور پر روک دینے کا عمل ملتوی کرنا
پشیمان	:	شرمندہ ہونا، افسوس کرنا
مصائب	:	تکالیف، مصیبت
متمول	:	مالدار، دولت مند، امیر
متنفر	:	نفرت کرنے والا، بیزار
خاور	:	مشرق و مغرب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے
کم عیار	:	کھوٹا، ناقص، غیر معیاری
رفعت	:	مرتبے کی بلندی، بلندی، بزرگی، عزت
گردنواح	:	آس پاس کا علاقہ
قناعت	:	تھوڑی سی چیز پر رضامندی
تدبر	:	غور و فکر، اندیشہ و تدبیر
ودیعت	:	امانت تفویض، سپردگی
نقوش	:	نقش کی جمع، نشانات، علامات

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

2۔ علامہ اقبال کے والد اور والدہ کا کیا نام تھا؟

3۔ علامہ اقبال کے والد کس نام سے پہچانے جاتے تھے؟

4۔ علامہ اقبال کے بڑے بھائی کا کیا نام تھا؟

5۔ علامہ اقبال نے لندن کا سفر کس سنہ میں کیا اور وہاں کتنے سال قیام کیا؟

6۔ علامہ اقبال نے کل کتنی شادیاں کی تھی؟

7۔ علامہ اقبال کے اردو و فارسی شعری مجموعوں کا نام بتایئے۔

8۔ علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟

9۔ علامہ اقبال کے کل کتنے فارسی مجموعے ہیں؟

10۔ علامہ اقبال کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ اقبال کی ابتدائی اعلیٰ تعلیمی سرگرمیوں پر نوٹ لکھیے۔

3۔ علامہ اقبال کے یورپ کے قیام کا جائزہ لیجیے۔

4۔ علامہ اقبال نے اپنے مختلف خطبات کہاں اور کب دیے؟ بیان کیجیے۔

5۔ علامہ اقبال کی گورنمنٹ کالج لاہور کی تدریسی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے قیام یورپ کا جائزہ لیجیے۔

2۔ علامہ اقبال کی حیات و شخصیت کے بارے میں تفصیل سے نوٹ لکھیے۔

3۔ اقبال کے اسفار پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	اقبال سب کے لیے	ڈاکٹر فرمان فتحپوری
2۔	روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خان
3۔	زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال
4۔	ذکر اقبال	عبدالمجید سالک
5۔	اسفار اقبال	عنایت علی

اکائی 2: اقبال کی علمی وادبی خدمات

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 اقبال کی علمی وادبی خدمات

2.2.1 اردو شعری کارنامے اور ان کا مختصر تعارف

2.2.2 فارسی شعری کارنامے اور ان کا مختصر تعارف

2.2.3 نثری کارنامے اور ان کا مختصر تعارف

2.3 اعزازات

2.4 اکتسابی نتائج

2.5 کلیدی الفاظ

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید:

علامہ اقبال ان برگزیدہ اور جلیل القدر ہستیوں میں سے ہیں جن کی یاد قیامت تک دل کی دھڑکنوں میں رچی بسی اور کروٹیں لیتی رہے گی۔ انہوں نے مشرق کے تن مردہ کو زندگی کی حرارت سے ہمکنار کرنے کے لیے اپنی تمام تر زندگی وقف کر دی۔ برصغیر کی فکری وفنی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں انہوں نے انمٹ نقوش چھوڑے اور نئی جہتیں متعین کی ہیں۔ انہوں نے اردو زبان وادب کو اپنی تخلیقات سے مالا مال کیا اور اسے بڑی بننے اور دنیا کے مہذب زبانوں میں کھڑی ہونے کے قابل بنایا۔ وہ بیک وقت ایک کامیاب شاعر بھی تھے اور اعلیٰ پایہ کے فلسفہ دان اور مفکر بھی۔ انہوں نے بحیثیت شاعر کے شاعری سے جو کام لیا ہے اس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اقبال جتنی قدرت اردو و فارسی پر رکھتے تھے اتنی ہی دسترس ان کو انگریزی پر بھی حاصل تھی۔ اقبال کے کلام میں جو ثروت افکار ہے، وہ عدیم المثال اور مشرق ومغرب کے بہترین اور بلند ترین افکار کا وارث ہے اقبال نے اس ورثے کو صرف پیش ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔ ان کے خدمت کا بین ثبوت ان کا گراں قدر اور وافر

سرمایہ ہی ہے جو خطبات ،مضامین ،تقاریر، بیانات ،خطوط اور شاعری کی لافانی کتب کی صورت میں ملتا ہے یہ سرمایہ بلا شبہ ایک امانت ہے۔اقبال شعور،فکر،عرفان ،علم اور عمل کا ایک بحر بیکراں اور وقت اور امت کا وہ قیمتی اثاثہ ہیں جسے ہر دور اپنے دامن میں سجا کر اپنی قدر و قیمت بڑھاتا رہے گا ۔یہی وجہ ہے ان کی حیات ،شاعری ،تصورات ونظریات کی توضیح اور تعبیر پر دنیا بھر میں ایک عظیم الشان ذخیرہ کتب وجود میں آچکا ہے۔مطالعہ اقبالیات کو اردو زبان وادب میں اب ایک باقاعدہ مستقل شعبے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ اقبال کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ اقبال نے شاعری اور نثر کے ذریعہ جو بے مثل خدمات انجام دی ہیں اس کو بیان کر سکیں۔
- ☆ اقبال نے اردو شاعری کو زندگی کے حقائق کا ایک وسیلہ بنایا اور اردو شاعری کا مزاج بدل دیا اس پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ اقبال نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے علاوہ نثر میں بھی جو باقاعدہ بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے اس کو بیان کر سکیں۔

2.2 اقبال کی علمی وادبی خدمات

علامہ اقبال اردو و فارسی کے ایسے شاعر ہیں، جن کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں کیا جاتا ہے۔فارسی، انگریزی، اردو، عربی کے علاوہ انہیں جرمن زبان پر بھی اچھی دسترس حاصل تھی۔مضامین میں تاریخ ،تصوف ،علم الکلام، فلسفہ، اسلامیات، سیاست، قانون اور عمرانی علوم سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔اقبال اردو شاعری میں ایک ایسے دور کے موجد ہیں جس کا بڑا وصف رفعت خیال اور فلسفیانہ بلند آہنگی ہے۔وہ جس طرح اپنے عہد کی صداقت شعارانہ پیداوار ہیں اسی طرح فکر وسخن کی تاریخ میں ایک نئے عصر کے معمار ہیں۔انہوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا کہ اپنے افکار وخیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے شاعری سے بڑھ کر کوئی دل کش اور پر اثر ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے اس لیے انہوں نے شاعری کو اپنا ترجمان بنایا۔اقبال کے کلام کی سب سے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کا خمیر قرآن وحدیث سے حاصل کیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بعض نظمیں دیگر مفکرین کی شاعری کی عکاسی کرتی ہیں مگر مجموعی طور پر ان کی شاعری اسلامی فکر سے اپنا مواد حاصل کرتی ہے۔اسلامی فکر میں ہمہ گیریت اور ہمہ عصریت کا پہلو پایا جاتا ہے اس لیے اقبال کی شاعری میں بھی یہی عناصر موجود ہیں۔اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی عصر شناس فکر نے نہ صرف عالمی دانشوروں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا بلکہ اس کو نئی منزلوں کا شعور بھی دیا۔یہ ہمہ گیریت کا ہی نتیجہ تھا کہ فکر اقبال کی قوی وجری آواز نے نہ صرف اردو و فارسی کی لسانی آبادیوں سے داد وتحسین وصول کی بلکہ اس کی گونج پورے عالمی ادب میں سنائی دینے لگی۔انہوں نے ادب کے بڑے بڑے ماہرین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مروجہ موضوعات ،فرسودہ حکایات پامال روشوں سے ہٹ کر بھی ایک نئے نظامِ فکر وفن کا امکان ہے جس کے نغمے انسانیت کے غم کا مداوا ہوں، جس کے آہنگ سے زندگی میں سوز وگداز پیدا ہو اور جس سے انسان اپنے مقام ومرتبے اور منزل کا تعین کر سکے۔زمانے کی بے ہنگم تمدنی رفتار پر قابو پا سکے اور انجام کار ایک ایسے جہانِ نو کی تعمیر کر سکے جو ایک ایسے نظریہ حیات پر استوار ہو جو اصلاً تخلیق کائنات کی غایت بھی ہو اور انبیاء کی دعوت خیر بھی اس میں شامل ہو۔

ہم سب اس چیز سے بخوبی واقف ہیں کہ اقبال کی زندگی میں یورپ کا سفر ایک اہم موڑ ہے۔اس سفر سے پہلے وہ صرف مشرقی علوم

وادبیات اورشخصیات سے واقف تھےلیکن یورپ سے واپسی کے بعدان کی زندگی کا مقصدتبدیل ہوگیا۔اس دور نے اقبال کے ذہنی اورفکری ارتقاء میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ یہاں سےان کی فکرمیں وسعت اوردل میں ایک عالمگیراخوت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔وہ خوداس چیز کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

حکمت مشرق ومغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لیے ہے اکسیر

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

حرف اس قوم کا بے سوزعمل زار وزبوں
ہوگیاپختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر!

یورپ میں قیام کے دوران اقبال نے مغربی سیاست اورمغربی تہذیب کا قریب سے مشاہدہ کیااوراس کے نتیجے میں وہ وطنیت کےنظریے کوغیراسلامی اورانسانیت کے لیےمضرسمجھنے لگے۔وہ ایک ایسی عالمگیرجمیعت کا تصورڈھونڈنے لگے،جس میں سب کے لیےاخوت وہمدردی اورعدل وانصاف ہواور یہ تصورانہیں اسلامی تعلیمات میں نظرآیا۔اپنےعلمی وادبی تبحر ہی سے اقبال نے مشرق کےفکری نظام کوجمود سے بچانے کے لیےفکری کوششیں کیں۔اپنے متحرک افکار ونظریات سے تمام زندہ دل انسانوں میں خوداعتمادی اور جذبۂ عمل بیدارکیا۔ان کے کلام میں عشق کی روایتی داستان اورہجر کےصدموں کا بیان نہیں بلکہ اس میں فلسفیانہ افکاراورقومی ہمدردی کے جذبات ملتے ہیں۔انہوں نے مشرق ومغرب کےعلم ودانش اور فلسفوں میں اعلیٰ قدروں کی تلاش اورجستجو جاری رکھی۔اقبال نے اپنے گردوپیش کی دنیا کا بغورجائزہ لےکرمشرق ومغرب کےنظریات پرتنقیدی نگاہ ڈالی اوراس کی خامیوں اورناکامیوں کواجاگرکیا۔مشرقی اورمغربی فکرودانش کی کمزوریوں کوواضح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبال حیات انسانی اوراس کےارتقائی عمل کے لیےایک حرکی اورمکمل لائحہ عمل بنانے کا خواب دیکھتے رہے۔اورانسان کو بلندی سےہم کنار کرنے کی فکرکرتے رہے۔اس کے لیےانہوں نے شاعری کوذریعہ بنایا۔ان کی شاعری روح کوتڑپانے والی اورقلب کوگرمانے والی شاعری ہے۔ اقبال کےفکری نظام میں خودی، بےخودی،عشق،عمل،مردمومن وغیرہ تصورات کی بڑی اہمیت ہے۔انہوں نے نثر میں بھی بیش بہاسرمایہ چھوڑا ہے جو اقبال کی مفکرانہ اورشاعرانہ عظمت سےصحیح طور پرآشناہونے کاایک اہم وسیلہ اوراقبال کی عظیم شخصیت کا آئینہ ہے۔علامہ اقبال نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک مفکر،مصلح قوم،اخوت کے پیکراوردانائے قوم بھی تھے،جس کے لیےانہیں ''سر'' حکیم اور''علامہ'' جیسے خطابات سےنوازا گیا۔علامہ اقبال کےاثر سےاردووفارسی شاعری کی فکری دنیامیں ایک انقلاب آفرین تغیررونما ہوا۔انہوں نے اردوشاعری سےحزن وقنوطیت کےعناصرختم کرکےاس میں رجائیت ،جوش اورنشاط آفرینی پیدا کی۔ان کی شاعرانہ عظمت سے کوئی بھی انکارنہیں کرسکتا۔انہوں نے اردووفارسی شاعری کوفکروفلسفہ کےفن

کارانہ اظہار سے آشنا کیا۔انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کوشعر کے سانچے میں ڈھال کراردو وفارسی شاعری کواپنی فکر سے بلند کیا۔تصورخودی، بے خودی،مرد مومن،عقل وعشق،زمان ومکاں۔عظمت انسانی اورقوم وملت کی سر بلندی جیسے تمام موضوعات ان کی شاعری میں شامل ہیں۔اقبال کی غزلوں نے روایتی موضوعات کوایک نئے موڑ تک پہنچایا۔انہوں نے غزل کے دورازکاراورفرسودہ مضامین کوایک طرف رکھ کرایک نئے جہاں کو دریافت کیا۔انہوں نے اپنی غزلوں میں فلسفیانہ تصورات کودلکش زبان میں پیش کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔موضوع،لہجہ اورزبان وبیان کے اعتبار سے ان کی غزلیں سب سے مختلف نظرآتی ہیں۔خودی،عشق وعقل،زمان ومکاں،جہدعمل،قوموں کےعروج وزوال،مشرق ومغرب میں قومی اور بین الاقوامی حالات پرتبصرہ،تاریخ انسانی پرتنقیداورفلسفہ وحکمت سے متعلق موضوعات اقبال کی غزلوں کو دوسرے شعرا سے الگ کرتے ہیں۔ انہوں نےغزل کی مرکزی فکرکوفطرت اور کائنات سے جوڑا۔اقبال کے بعدغزل میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ اس نے حقائق کی عکاسی ہو یاعصری معنویت ہو ہرایک میدان کواپنے اندرسمولیا۔انسان،خدا،کائنات اورفطرت یہ تمام کے تمام موضوعات آج غزل میں موجود ہیں۔انہوں نے انسان کوآزادی،عزت اورخودداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تعلیم اپنی غزلوں کے ذریعے دی ہے۔قرآن اورعشق رسول کا اقبال کی شاعری اورزندگی پر اثر ہوا۔ان دونوں موضوعات کا اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ ذکرملتا ہے۔ان کی شاعری پڑھ کرایسامحسوس ہوتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق روح کی گہرائیوں اوروجدان والہام کی ان مخفی قوتوں سے ہے، جوانسانی دسترس سے باہر ہیں۔اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اردواور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کو نئے آہنگ اور نئے اسلوب سے ہم کنارکیا۔یہ وصف ان کی فن کارانہ عظمت پردلالت کرتا ہے۔خودی کا مضمون جو ان کے خاص نظریہ حیات کی پیداوار ہے وہ اس سے پہلے کی شاعری میں بہت کم نظرآتا ہے اسی طرح وہ استعارات،تشبیہات،علامات وکنایات اور تلمیحات جوان کی شاعری میں خاص مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں وہ اوراس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہیں جوان کی شاعری کا بنیادی وصف اور جوہر ہے۔علامہ اقبال اردوشاعری کے وہ آبدار گوہر ہیں جس کی چمک نے کئی نسلوں کومتاثر کیا ہے۔ان کی فکران کے موضوعات اوران کے فن کی کوئی حدنہیں۔انہوں نے اردوشاعری کے رخ کوموڑ دیااورزندگی کے حقائق کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا،اقبال کی شاعری نے اردوشاعری کا مزاج بدل دیا۔اس میں بے چارگی اداسی اورمحرومی کا جواندازتھااس کی جگہ توانائی ،امنگ اورولولہ پیدا کیا۔ان کا کلام حریت کا آئینہ دار ہےاورشاعری کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ہوجس نے شعوری طور پراپنے زمانے کومتاثر کیا ہوان کی شاعری بلا شبہ عہدآفریں شاعری ہے۔غرض اقبال نے جس طرح علمی وادبی موضوعات پرقلم اٹھایا ہے وہ قابل قدر ہی نہیں بلکہ دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔اس حوالے سے یہاں ان کے دونوں زبانوں کے شعری ونثری کارناموں کامختصر جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔علامہ اقبال کے اردو کے چارشعری مجموعے ہیں۔بانگ درا،بال جبریل،ضرب کلیم، ارمغان حجاز۔

2.2.1 اردوشعری کارنامےاوران کامختصرتعارف

بانگ درا:

علامہ اقبال کا پہلا اردوشعری مجموعہ ہے جوستمبر 1924ء میں شائع ہوا۔اس کا دیباچہ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے۔اس مجموعہ کی پہلی نظم کا نام ''ہمالہ'' ہےاورآخری نظم''طلوع اسلام'' ہے۔بانگ درا کی سب سے مختصرنظم''ساقی'' ہے جوتین اشعار پرمشتمل ہے۔بانگ درا تین حصوں میں تقسیم ہے۔پہلے حصے میں آغاز سے 1905ء تک کا کلام ہے،دوسرے حصے میں 1905ء سے 1908ء تک کا کلام درج ہےاور تیسرے حصے میں

1908ء کے بعد کا کلام موجود ہے۔

بانگ درا میں شامل چند نظموں کے نام ہیں: ''ہمالہ، شمع و پروانہ، عقل و دل، ایک پہاڑ اور گلہری، ماں کا خواب، ایک آرزو، سید کی لوح تربت، انسان اور بزم قدرت، شاعر، دل، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، التجائے مسافر، طلبہ علی گڑھ کالج کے نام، پیام عشق، جلوہ حسن، حسن و عشق، بلاد اسلامیہ، ترانہ ملی، شمع و شاعر، شکوہ، جواب شکوہ، شیکسپیر، خضر راہ، طلوع اسلام وغیرہ۔

بال جبریل:

یہ اقبال کا مقبول ترین دوسرا شعری مجموعہ ہے جو پہلی بار 1935ء میں شائع ہوا۔ بال جبریل کا مطلب ہے جبریل کا پر۔ اس کی ابتدا بھرتری کے خیال پر مبنی اس شعر سے ہوتی ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس مجموعے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے آغاز میں غزلیں ہیں، دوسرے حصے میں نظمیں ہیں۔ اقبال کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' جسے بال جبریل کا دل کہتے ہیں، اس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ کچھ قطعات بھی شامل ہیں۔ بال جبریل میں چند شامل نظموں کے نام ہیں۔ مسجد قرطبہ، طارق کی دعا، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، ذوق و شوق، لالہ صحرائی، ساقی نامہ، فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں، روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، جبریل و ابلیس، مسولینی وغیرہ۔

ضرب کلیم:

یہ علامہ اقبال کا تیسرا اُردو شعری مجموعہ ہے جو 1936ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں بہت سارے معاشرتی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ خود اقبال اس کتاب کو دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ کہتے ہیں۔ یہ چھ عنوانات پر مشتمل ہے۔ (1) مشرق و مغرب (2) ادبیات و فنون لطیفہ (3) اسلام اور مسلمان (4) عورت (5) تعلیم و تربیت (6) محراب گل افغان کے افکار۔ اس میں شامل چند نظموں کے نام یہ ہیں۔: ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، اسلام، عقل و دل، قلندر کی پہچان، کافر و مومن، تقدیر، مکہ اور جنیوا، احکام الٰہی، زمانہ حاضر کا انسان، سلطان ٹیپو کی وصیت، طالب علم، حکیم نطشے، عورت، آزادیِ نسواں، عورت اور تعلیم، شعاع امید، فنون لطیفہ، اشتراکیت، کارل مارکس کی آواز، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، مسولینی، لادین سیاست، جمعیت اقوام مشرق، جمہوریت۔

ارمغان حجاز:

یہ ایسا شعری مجموعہ کلام ہے جس کا تین چوتھائی حصہ فارسی زبان میں ہے اور باقی اردو زبان میں ہے۔ یہ شعری مجموعہ اقبال کی وفات کے سات ماہ بعد نومبر 1938ء میں شائع ہوا۔ ارمغان کے لفظی معنیٰ تحفہ یا سوغات کے ہے اور ''حجاز'' جزیرۃ العرب کا شمال مغربی حصہ جس میں مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور طائف وغیرہ واقع ہیں۔ دراصل علامہ اقبال نے ''ارمغان حجاز'' مدینہ منورہ کے شوق سفر میں ساتھ لے جانے کے لیے بطور ہدیہ تیار کی تھی۔ اس مجموعے میں شامل چند نظموں کے نام یہ ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ، بڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو، عالم برزخ، حضرت

2.2.2 فارسی شعری کارنامے اوران کامختصر تعارف

علامہ اقبال فارسی میں شاعری کا با قاعدہ آغاز کرنے سے پہلے اردو شاعری میں نام پیدا کر چکے تھے۔اردو میں ان کی بعض مشہور نظمیں معرض وجود میں آ چکی تھیں اور انہیں برصغیر کے طول وعرض میں شہرت ومقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔اقبال کے اس دور کے اردو کلام پر غور کیا جائے تو یہاں پر فارسی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔پھر دھیرے دھیرے ان کے یہاں فارسی میں شعر گوئی کا رجحان اس قدر ترقی کر گیا کہ ان کی وفات تک فارسی کے سات مجموعے جمع ہو گئے جب کہ اردو میں صرف چار مجموعے مرتب ہوئے۔ان کے کلام کے متعدد ترجمے کئی بین الاقوامی زبانوں میں کیے گئے۔چناں چہ ہم اقبال کی شاعری اوران کی نثری خدمات کے حوالے سے ان کے ادبی سرمایے کا الگ الگ جائزہ لیں گے۔یہاں ہم علامہ اقبال کے فارسی شعری مجموعے (1) اسرار خودی (2) رموز بے خودی (3) پیام مشرق (4) زبور عجم (5) جاوید نامہ (6) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (7) ارمغان حجاز کا مختصر جائزہ لیں گے۔

اسرار خودی:

یہ علامہ اقبال کی پہلی فارسی شعری تصنیف ہے اور سب سے پہلے شائع ہونے والا شعری کارنامہ بھی۔اسرار خودی ایک مثنوی ہے، جو 1915 میں شائع ہوئی۔اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے ان کی حیات میں ہی کیا تھا۔اسی فارسی مثنوی کی وجہ سے اقبال کو عالمی شہرت ملی۔ ڈاکٹر نکلسن کے ہی اس ترجمہ کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر ان کا تعارف ہوا۔پہلی مرتبہ اقبال نے اپنے مرکزی تصور ''خودی'' کو باضابطہ طور پر ''اسرار خودی'' کی صورت میں پیش کیا۔انہوں نے اس مثنوی کے لیے وہی بحر چنی جو ان کے مرشد مولانا رومی کی مثنوی کی ہے کیوں کہ اس بحر میں فکر کو سوز وساز کے ساتھ سمونے کی سہولت موجود ہے۔اپنے افکار کی توضیح کے لیے اقبال نے اس مثنوی میں تمثیل کا سہارا بھی لیا ہے۔

رموز بے خودی:

یہ فارسی زبان میں علامہ اقبال کی دوسری شعری تخلیق ہے، جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔یہ 1917ء میں شائع ہوئی۔اس کو اقبال نے خودی پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں لکھا، جس میں انہوں نے انسان کی انفرادی عظمت کی بہ نسبت ملت کے باہمی ربط اور حقوق کی بات کی ہے۔یہ مثنوی خودی اور بے خودی کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔رموز بے خودی کے پس منظر کی ترجمانی کرنے والے ایک مکتوب میں علامہ خود فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی اثرات کے تحت ہیں۔ان کو عربی اسلام اور ان کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ کے ذریعے ہوئی۔صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا اور ان خیالات پر تنقید کی۔رموز بے خودی دراصل معترضین کے اعتراضات کا جواب ہے۔

پیام مشرق:

یہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ انہوں نے جرمنی کے عظیم شاعر گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کے جواب میں لکھا تھا۔یہ پہلی بار 1923ء میں شائع ہوا اور اس کا دیباچہ علامہ اقبال نے خود لکھا ہے۔یہ شعری مجموعہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے کا نام ''لالہ

طور'' ہے۔اس میں قطعہ نما رباعیات ہیں،جن میں لطف زبان کے ساتھ ساتھ خودی کے وجد آفریں رموز بھی ملتے ہیں۔دوسرے حصے کا نام ''افکار '' ہے،جس میں دعا،تسخیر فطرت، ہلال عید، بوئے گل،نوائے وقت فصل بہار، افکار انجم،علم وعشق،سرود انجم،شاہین و ماہی،شبنم،ساقی نامہ،حکمت فرنگ، جوئے آب، نادعا لمگیر بہشت اور کشمیر کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ان میں سے اکثر نظموں میں اقبال کا رنگین تخیل فارسی تغزل کے رنگوں کے پھول برساتا ہے۔تیسرے حصے کا نام ''مئے باقی'' ہے۔خواجہ حافظ کے رنگ میں نہایت پر جوش اور مستانہ انداز میں غزلیں کہی ہیں۔چوتھے حصے کا نام ''نقش فرنگ'' ہے۔اس میں مغرب کے بعض حکماء اور مشاہیر مثلاً نطشے ؛برگساں،ہیگل،ٹالسٹائی اور بائرن وغیرہ پر شاعرانہ طرز میں پر لطف نظمیں ہیں۔اس حصے میں چند نظموں کے نام پیام،جمیعت اقوام،فلسفہ وسیاست،حکیم آئن سٹائن، بائرن،جلال وہیگل، پیغام برگساں میخانہ فرنگ،خرافات فرنگ،خطاب بہ انگلستان،آزادی بحر وغیرہ ہیں۔

زبورِعجم:

علامہ اقبال کے چوتھے فارسی شعری مجموعے کا نام ''زبورعجم'' ہے۔یہ شعری مجموعہ 1927ء میں شائع ہوا۔یہ غزلیات کا مجموعہ ہے۔اس کے چار حصے ہیں۔پہلے حصے میں 66 غزلیں ہیں۔اس کے بارے میں یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ ایک طرح سے اقبال کے نغمے ہیں جس میں بظاہر رنگ تغزل بھی جھلکتا ہے اور یہ اقبال کے وجد آفریں اور پر جوش ترانے ہیں۔ان ترانوں کے ذریعہ گویا انہوں نے افسردہ دلانِ ہند کے قلب میں زندگی کی حرارت پیدا کرنی چاہی ہے۔دوسرے حصے میں 75 نغمے یا غزلیں ہیں۔اور پہلے حصے کی طرح جوش ومستی سے لبریز ہیں۔اس کے تیسرے حصے میں ''گلشن راز جدید'' جیسی مثنویاں ہے۔گلشن راز جدید دراصل سید محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کا جدید طرز میں جواب ہے۔جس میں اقبال نے نوسوالات قائم کر کے ان کا جواب دیا ہے اور ماورائیات کے بعض اہم مسائل کو علوم جدیدہ کی روشنی میں حل کر کے عملی دنیا پر اس کا اثر ظاہر کیا ہے۔علامہ اقبال کی طرف سے نوسوالوں کے جوابات فلسفیانہ موشگافیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس کا چوتھا حصہ ایک مثنوی ''بندگی نامہ'' ہے۔یہ مثنوی نہایت مختصر ہے اور اس میں شاعر مشرق نے غلاموں کے فنون لطیفہ مثلاً موسیقی،مصوری اور مذہب پر منظوم بحث کی ہیں۔اور یہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ غلاموں کے فنون لطیفہ میں زندگی کی روح نہیں پائی جاتی۔بندگی نامہ ایک لحاظ سے غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک موثر آواز ہے۔

جاوید نامہ:

یہ علامہ اقبال کا پانچواں فارسی شعری مجموعہ ہے جو 1933ء میں شائع ہوا۔یہ ان کی پسندیدہ کتاب ہے۔یہ مجموعہ اٹلی کے مشہور ومعروف شاعر دانتے کی کتاب ''ڈیوائن کامیڈی (Divine Comedy) سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔اس میں سیر افلاک کے ذریعہ اپنا فلسفہ حیات،ملت اسلامیہ کے مسائل اور اپنا نقطہ نظر ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ سیاحت چھ ستاروں پر مشتمل ہے۔جاوید نامہ کی اشاعت پر سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ کافی اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ ''اس وقت تک فارسی ادب کی چار کتابوں جس میں شاہنامہ فردوسی، دیوان حافظ،مثنوی مولانا روم اور گلستان سعدی کو بقائے دوام حاصل تھی،اب ان کی تعداد پانچ ہوگئی ہے۔اسی طرح مولانا عبدالسلام ندوی نے ''جاوید نامہ'' کے بارے میں کہا ہے کہ اسرار وحقائق معراج محمد یہ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال ڈاکٹر صاحب کو ایک مدت سے تھا اور وہ گلشن راز جدید کی طرح علوم حاضرہ کی روشنی میں معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا ''معراج نامہ جدید'' لکھنا چاہتے تھے۔لیکن اس اثنا میں اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کی کتاب ''ڈیوائن کامیڈی'' پر بعض نئی اور اہم تنقیدات یورپ میں شائع ہو چکی تھی جس میں اس حقیقت کو پایہ ثبوت تک پہنچایا گیا تھا کہ ڈیوائن کامیڈی کے

آسمانی ڈرامہ کا پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر ان واقعات پر مبنی ہیں جو اسلام میں معراج محمدیہ کے متعلق بعض احادیث وروایات میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور متصوفین وادباء کی کتابوں میں درج ہوئے اس کے علاوہ بعض متصوفین مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی مشہور کتاب ''فتوحات مکیہ'' میں اور بعض ادباء مثلاً ابوالعلا معری نے ''رسالہ الغفران'' میں خود اپنی سیاحت علوی اور مشاہدہ تجلیات کا ذکر کیا ہے۔ جاوید نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ علامہ اقبال نے ان تینوں کتابوں کو سامنے رکھ کر ''جاوید نامہ'' کا خاکہ تیار کیا ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق:

اقبال کا یہ چھٹا فارسی مجموعہ 1930ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے دو حصے ہیں۔ ''مسافر'' دوسرا ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' مثنوی ''مسافر'' اقبال کے سفر افغانستان کے مشاہدات وتاثرات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال علاج کے لیے بھوپال گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں سرسید احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ سرسید نے خواب میں انہیں فرمایا کہ اپنی علالت کا ذکر حضور رسالت مآب سے کیوں نہیں کرتے۔ صبح اٹھتے ہی اقبال نے چند اشعار حضور کی بارگاہ میں پیش کیے اس کے بعد برصغیر اور خارجی ممالک کے سیاسی اور اجتماعی حالات پر اپنے تاثرات بیان کرتے گئے۔

ارمغان حجاز:

چوں کہ یہ مجموعہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر مشتمل ہے اس لیے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

2.2.3 نثری کارنامے اور ان کا مختصر تعارف

علامہ اقبال نے گرچہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی اپنی تحریر میں کی ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں شاعری کے علاوہ نثر میں بھی باقاعدہ بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے۔ اقبال نے نثر میں باقاعدہ تین کتابیں بھی لکھی ہیں جب کہ ان کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف ''علم الاقتصاد'' ہے، جو اردو میں اقتصادیات پر پہلی تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین ومقالات بھی تحریر کیے ہیں اور ان کے خطوط کا بھی ایک خاصہ بڑا سرمایہ موجود ہے۔ مجموعی طور پر یہ تمام تحریریں مطالعہ اقبال کے سلسلے میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔

ان کی نثر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں بھی وہی سب موجود ہے جو ان کی شاعری میں ہے۔ ان کے افکار وخیالات اور نظریات وتصورات ان کی نثر میں بھی پوری طرح واضح ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کے عہد میں عالم اسلام کئی مسائل سے دوچار ہوا اس کے علاوہ مسلمانان ہند بھی کئی مسائل سے دوچار ہوئے۔ قومی زندگی میں ابتلاء وآزمائش کے مختلف مراحل آئے۔ وہ ان تمام واقعات کو مشاہدات کی صورت میں اپنے ذہن ہی میں نہیں بلکہ قلم سے بھی صفحہ قرطاس پر محفوظ کرتے چلے گئے۔ اس عرصے میں ان کی نثری تحریریں بالالتزام اور کہیں کہیں منتشر حالتوں میں ملتی ہیں۔ ان تحریروں کو یکجا کیا جائے تو برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے، ان کی شاعری اور نثر دونوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہیں کہ ان کی نثر میں بھی وہی خلوص گہرائی وگیرائی فکر وخیال کی ہم آہنگی اور استدلال کا وہی زور اور احساس کی وہی دردمندی پائی جاتی ہے، جو ان کے اشعار کا طرہ امتیاز ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری سے دلوں کو گرمادیا لیکن اپنی نثر کے ذریعہ انہوں نے قومی مسائل کو ٹھنڈے دل سے اور گہری نظر کے ساتھ سمجھنے اور متانت اور معقولیت کے ساتھ بیان کرنے کی ایک اعلیٰ روایت قائم کی۔ ہمارے یہاں قومی مسائل سے حقیقت پسندی اور دردمندی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی روایت کا آغاز سرسید احمد خان اور ان کے رفقا سے ہوتا ہے اس روایت کو جو بلندی اثر ونفوذ علامہ اقبال

کے ہاتھوں نصیب ہوا اس کی مثال برصغیر ہندو پاک میں نہیں ملتی۔

الغرض اقبال کے تمام افکار و نظریات اور ان کی تفصیل اور جزئیات ان کی نثر میں ہی ملتی ہے۔ چوں کہ نثر میں تحلیل و تجزیے کی نسبتاً زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لیے اقبال کا مفکرانہ انداز اور تجزیاتی مزاج ان کی نثر میں ہی اپنے آپ کو پوری طرح رونمائی کراتا ہے۔ ان کی نثر شعر کی تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے اور ان کے افکار و شخصیت کے مخفی گوشوں کو جانچنے اور پرکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کی نثر میں موضوعات کا جو تنوع ہے، فکر کی جو گہرائی ہے، خیال کی جو بلندی ہے اور اظہار کی جو جمال آفرینی ہے وہ اس کو خاصے کی حیثیت بنا دیتی ہے۔ لہٰذا اردو ادب کے طلبا کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اقبال کی نثری تصنیفات سے واقفیت حاصل کریں۔ اس لیے ہم ان کے تمام نثری سرمایے کا ایک ایک کر کے مختصراً جائزہ لیں گے۔

علم الاقتصاد:

علامہ اقبال کی پہلی باقاعدہ نثری کاوش ''علم الاقتصاد'' ہے۔ جو اردو میں اقتصادیات کی دنیا میں پہلی تصنیف تصور کی جاتی ہے جو 1905ء میں شائع ہوئی۔ اقبال ایم۔اے کرنے کے بعد 13 مئی کو اورینٹل کالج لاہور میں عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اس وقت اس کالج میں پروفیسر آرنلڈ پرنسپل تھے۔ علامہ اقبال ''علم الاقتصاد'' کے دیباچے میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کتاب کے لکھنے کی تحریک مجھے پروفیسر آرنلڈ نے ہی دی ہے۔ ریڈرشپ کے فرائض منصبی میں تاریخ اور اقتصادیات کی تدریس کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی بعض کتابوں کی تالیف اور ان کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ اس میں واکر (walker) کی تصنیف Political Economy بھی نصاب میں شامل تھی، جس کا اردو تلخیص اور ترجمہ اقبال نے کیا تھا۔ اقبال ہر ہفتے گورنمنٹ کالج میں بی۔اے اور ایم۔اے کے طلبا کو اس کا درس دیا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شروع ہی سے اقتصادیات کے موضوع پر اقبال کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری، خطوط اور مضامین میں معاشی و اقتصادی مسائل کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کیا ہے۔ اس کتاب کا انتساب ڈبلیو بل اسکائر ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کے نام ہے۔ دیباچے میں اقبال نے جن شخصیات کا شکریہ ادا کیا ہے ان میں سے پروفیسر آرنلڈ، لالہ جیارام اور علامہ شبلی نعمانی شامل ہیں۔ کتاب کو علامہ شبلی جیسے عالم و فاضل شخص کی سند حاصل ہے۔

علم الاقتصاد پانچ حصوں اور بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کے طریقۂ تحقیق کی تعریف کی گئی ہے۔ باقی چار حصوں میں معاشیات کے چار بنیادی شعبوں سے تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ اقبال نے ان موضوعات پر نہ صرف افکار و نظریات کو پیش کیا ہے بلکہ ان پر تنقید بھی کی ہے اور اپنی رائے بھی دی ہے۔ یہ کتاب اقبال کے نظریہ اشتراکیت، مارکسیت اور سوشلزم جیسے تصورات کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے دیباچے کا یہ اقتباس بہت اہمیت رکھتا ہے۔

> ''یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔''

مضامین اقبال:

علامہ اقبال کی تصانیف کے علاوہ متعدد دیگر نثر پارے، دیباچے، تقاریظ، مضامین یہ تمام نثری سرمایہ بھی ان کے فن کو سمجھنے میں ممد و معاون ہیں، جس زمانے میں اقبال نے اپنی پہلی تصنیف ''علم الاقتصاد'' لکھنے کا آغاز کیا عین اسی زمانے میں ان کا پہلا مضمون ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' مخزن

کے شمارے جنوری 1902ء میں شائع ہوا۔اور یہ سلسلہ وقفہ وقفہ کے ساتھ ان کی آخری عمر تک جاری رہا۔ان تمام مضامین کو تصدق حسین تاج نے مرتب کر کے 1966ء میں ''مضامین اقبال'' کے نام سے شائع کرایا۔اس میں اقبال کے چودہ نثر پارے شامل ہیں ان میں سے نصف انگریزی مضامین کے اردو تراجم اور نصف اردو مضامین ہیں۔اس کتاب میں شامل چند مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔

1۔ زبان اردو

2۔ اردو زبان پنجاب میں

3۔ قومی زندگی (یہ ایک فکری مضمون ہے)

4۔ دیباچہ مثنوی اسرار خودی

5۔ دیباچہ مثنوی رموز بے خودی

6۔ دیباچہ پیام مشرق: فلسفہ سخت کوشی

7۔ جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ Our Prophet's Criticism of Contemporary Arabian Poetry کا اردو ترجمہ۔

8۔ ملت بیضاء پر عمرانی مسائل The Muslim Community کا اردو ترجمہ

9۔ جغرافیائی حدود اور آسمان (مولانا محمد حسین ندوی کے جواب میں تحریر کیا تھا)

10۔ ختم نبوت Islam and Ahmadis

تاریخ تصوف:

علامہ اقبال کو تصوف کے موضوع سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ان کے مکاتیب سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تقریباً 1916ء میں تصوف پر ایک مبسوط تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

نیاز الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔دو باب لکھ چکا ہوں یعنی منصور بن حلاج تک پانچ چار باب اور ہوں گے۔۔۔''

1919ء میں اسلم جیراجپوری کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے ایک تاریخ تصوف کی لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ موقع نہ مل سکا اور ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔''

مقالات اقبال:

1963ء میں سید عبدالواحد معینی نے اقبال کے مضامین کو ''مقالات اقبال'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔اس میں مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ چند اور مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

1۔ Political thought in Islam جولندن کے رسالے میں شائع ہوئے۔

2۔ پین الاسلام ازم 1911ء

3۔ ایک دلچسپ مکالمہ (یہ تصوف کے موضوع پر ہے)

4۔ اسرار خودی اور تصوف 1916ء

5۔ تصوف وجودیہ 1916ء

6۔ محفل میلاد النبیؐ

7۔ اسلام اور علوم جدید 1911ء

8۔ علم ظاہر و باطن 1916ء

9۔ اسلام اور تصوف 1917ء

10۔ شریعت اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ 1928ء

11۔ حکمائے اسلام کے عمیق مطالعے کی دعوت

12۔ لسان العصر اکبر کے کلام میں ہیگل کا رنگ

13۔ اسلام کا مطالعہ زمانہ حال کی روشنی میں 1923ء

انوار اقبال:

1967 میں بشیر احمد ڈار نے ''انوار اقبال'' کے نام ان کے تقاریظ، خطوط، مضامین اور نادر کلام کا یہ نثری مجموعہ مرتب کیا اور اسے اقبال اکادمی نے شائع کیا۔ اس کا پیش لفظ ممتاز حسن نے لکھا ہے۔ اس مجموعہ نثر میں مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصے اہم ہیں۔ یہ اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

1۔ سودیشی تحریک اور مسلمان

2۔ مذہب اور سیاست کا تعلق

اس کے علاوہ کئی اور مضامین بھی شامل ہیں۔

مکاتیب:

ماہرین اقبالیات کے مطابق علامہ اقبال کے مکاتیب کی تعداد ہزاروں پر مشتمل ہے۔ ایسے خطوط کی تعداد زیادہ ہے جن میں اقبال نے اپنی تخلیقی کاوشوں اور اپنے شعری نصب العین پر اظہار خیال کیا ہے۔ علامہ اقبال کے مکتوبات کے ذریعہ ان کے نظریہ فن کے متعلق بیش قیمت مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی مربوط فکر بھی ان کے مختلف مکاتیب سے کافی حد تک کھل کر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے نظریہ خودی، تصور زمان و مکان، عشق و عقل، تصوف، فقہ اسلامی وغیرہ جیسے موضوعات پر بیشتر مکتوبات، ہم عصر مشاہیر اور اعلام کے نام وقتاً فوقتاً رقم کیے ہیں۔ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار و خیالات، نظریات و تصورات کے علاوہ ان کی شخصیت کا جو خاکہ ہمارے ذہنوں میں مرتب ہوتا ہے۔ اس میں ان کے مکتوبات کے

مطالعہ سے رنگ بھرے جاسکتے ہیں۔اقبال نے جن ہم عصر علماء وشعرا کو خطوط لکھے ہیں۔ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

برصغیر کے معروف عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شیخ قادر گرامی، خان نیاز الدین خان، سید نذیر نیازی اور اکبر الہ آبادی۔

اس وقت تک اقبال کے اردو خطوط کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔پروفیسر شیخ عطاء اللہ کا مرتب کردہ ''اقبال نامہ'' دو حصوں میں 1944 اور 1951 میں چھپا، ''مکاتیب اقبال'' مرتبہ مظفر حسین برنی بزم اقبال لاہور نے شائع کیا'' مکتوبات اقبال بنام نذیر نیازی'' اقبال اکادمی کراچی نے 1957 میں شائع کیا'' شاد اقبال'' مرتب کردہ محی الدین قادری زور حیدر آباد دکن سے شائع کیا گیا۔

خطبات:

The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ)

یہ کتاب علمی دنیا میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔1928ء میں مدراس کے ایک علم دوست شخصیت سیٹھ جمال محمد کی دعوت پر علامہ اقبال نے علی گڑھ، حیدر آباد اور مدراس میں اسلام کے آفاقی نظام پر خطبات دیے تھے۔یہ کتاب انہی کلیدی خطبات پر مشتمل ہے۔یہ اصل میں انگریزی زبان میں The Reconstruction of Religious thought in islam کے نام سے آکسفورڈ پریس لندن 1934ء میں شائع ہوئی۔سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال ہی کے مشورے پر اس کتاب کا ترجمہ ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' کے نام سے کیا۔ مذکورہ کتاب کے سات خطبات مندرجہ ذیل ہیں۔جب علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے لندن گئے تو وہاں ارسطاطلین سوسائٹی (Aristotelian Society of London) کی دعوت پر انہوں نے اس کتاب کا ساتواں خطبہ مذہب کی اہمیت وافادیت پر دیا۔

1۔علم اور مذہبی مشاہدات(Knowledge and Religious Experience)

2۔ مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار(Philosophical Test the Revelation of Religious Experience)

3۔ذات الٰہی کا تصور اور حقیقت دعا(The Concept of God and the Meaning of Prayer)

4۔خودی، جبر وقدر اور حیات بعد الموت:(The Human Ego -his Freedom and Immortality)

5۔اسلامی ثقافت کی روح(The Spirit of Muslim Culture)

6۔الاجتہاد فی الاسلام (The Principle of Movement in the Structure of Islam)

7۔کیا مذہب کا امکان ہے؟(Is Religion Possible)

علامہ اقبال نے ان خطبات میں ان تمام جدید اسلامی فکر ومسائل پر بحث کی ہے، جو نہ صرف امت مسلمہ کی تہذیبی وسیاسی ضرورت ہے بلکہ تمام بنی نوع انسانیت کے درپیش مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی ہے۔اقبال اس کتاب کے دیباچے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''وقت کا تقاضا ہے کہ دین کے علم کو جدید حکیمانہ انداز فکر ونظر کے ساتھ پیش کیا جائے۔میں نے اس تقاضے کو ان خطبات میں ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز سے سامنے آجائے کہ دین و دانش اور مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا ہو

جائے۔''

ان تمام خطبات کی نوعیت مکمل طور پر علمی اور فلسفیانہ ہے۔ مطالعہ اقبال میں کوئی بھی قاری ان خطبات کی اہمیت کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ آج یورپ، امریکہ، روس، مشرق وسطیٰ اور برعظیم ہندو پاک کا شاید ہی کوئی عالم ہو جس نے اسلام، مذاہب عالم اور جدید مسائل حیات میں گہری اور سچی دلچسپی کی خاطر ان سات خطبات کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ علم اور روحانی تجربات، روحانی تجربات کا فلسفیانہ معیار، ذات واجب کا تصور اور حقیقت عادت انائے انسانی اور جبر و اختیار، تمدن اسلامی کی روحیت، نظام اسلام میں روح حرکت اور اجتہاد جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے اور اقبال اس کتاب میں گویا ایک جدید اسلامی علم کلام کے بانی کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں اور عالم اسلام کے لیے اسلام پر غور و فکر کے دروازے کھول دیے ہیں۔

The Development of Metaphysics in Persia (فلسفہ عجم) اور (ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا):

اقبال کے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ جو انہوں نے میونخ یونیورسٹی (1908 میں لکھا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ میر حسن الدین (بی اے ایل ایل بی) نے ''فلسفہ عجم'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا تھا اور ایران میں بھی اس کا ایک ترجمہ ہوا ہے۔

اس کے ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

1۔ فلسفہ ایران قبل از اسلام
2۔ یونانی ثنویت
3۔ اسلام میں عقلیت کا عروج و زوال
4۔ تصور اور حقیقت کے مابین تنازع
5۔ تصوف
6۔ مابعد ایرانی فلسفہ و فکر

Stray Reflection:

یہ اقبال کی اپنی خود کی ڈائری ہے، جو انگریزی زبان میں ہے، جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف تاثرات پیش کیے ہیں۔ اس ڈائری کے مختلف اردو تراجم بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جیسے ''شذرات فکر اقبال'' از افتخار احمد صدیقی، بکھرے خیالات'' از ڈاکٹر عبدالحق۔ اقبال کے فلسفہ و شعر اور ان کے فکری اسالیب کی تفہیم کے لیے یہ ایک ناگزیر دستاویز ہے۔ اس میں بتیس سال کے نوجوان شاعر کے مختلف النوع فکر پارے موجود ہیں۔ اقبال کی زندگی کے مختلف مشاہدات و تجربات اس ڈائری میں جا بجا ملتے ہیں۔ ابتدائی فکری روایات کو آگے کی طرف رواں دواں بڑھنے کا فکر انگیز ثبوت اس یادداشت میں واضح طور پر موجود ہے۔ اس یادداشت میں اقبال کی نجی زندگی کے خدوخال بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ اس ڈائری کا ایک خاص موضوع فن شعر اور اس کی غرض و غایت ہے۔ یہ مضمون بوقلمونی، کثرت آرائی اور تنوع کے اعتبار سے ڈائری کا سب سے زیادہ اہم عنوان ہے۔ اس سے مشرق و مغرب کے فنِ شعر، نقد و انتقاد اور فن کاروں کے بارے میں اقبال کی گہری تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری اور منطقی صداقت، زندگی بہ حیثیت تنقید شاعری، نظم کی مقبولیت، عرب شاعری، شاعر اور روح عالم، شاعری اور سیاست دان، ماہر نفسیات اور شاعر، شاعر بہ

حیثیت انسان، فلسفہ اور شاعری کا اثر، فن ہی غیر محدود ہے، ادبی تنقید، وغیرہ موضوعات کی کثرت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فن کاروں میں رومی، بیدل، ولیم ورڈس ورتھ، حافظ، گوئٹے، ہائنے، شیکسپیئر ملٹن، اوسکر وائلڈ، ہوریس، مانٹین، غالب اور آزاد کے فنی حسن اور فکری رجحانات کا تجزیہ ملتا ہے۔ یہ ڈائری فن کے موضوع سے شروع ہوتی ہیں۔ اس موضوع سے متعلق اقبال کی پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ فن انسانی تخلیق کا پاکیزہ ذریعہ اظہار ہے، اس کا درجہ مقدس و محترم ہے۔ اس کے اعلیٰ ترین مقاصد ہیں۔ یہ جزو پیغمبری ہے۔ صرف سامانِ تفریح یا ذریعہ انبساط نہیں۔ یہ زندگی کے گوناگوں حقائق کی ترجمانی اور مقاصد آفرینی سے عبارت ہے۔ اور معاشرہ کی فکری توانائی اس کے جذبہ و احساس اور تہذیبی اقدار کے لطیف ترین تصورات کو جمالیاتی پیکر میں ڈھالنا اس کا دوسرا مقصد ہے۔ فکر اقبال کے سیاق و سباق میں ان بکھرے خیالات کی گوناں گوں اہمیت کے پس منظر میں ہم ان کے فکری ارتقا، اس دور کے تصورات اور ان کے ماخذ سے بخوبی متعارف ہوتے ہیں۔ اس میں چند موضوعات کچھ اس طرح ہیں۔

''Art, Human Intellect, The Existence of God, The Power of Belief, Metaphysics, Patriotism, The Dependence of Science on Metaphysics, Success in life, Democracy, God and the Devil, The Rebirth of Humanism. ''

2.3 اعزازات

☆ 1908ء میں میونخ یونیورسٹی لندن سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری۔

☆ 1923 میں سر کا خطاب۔

☆ 1929 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

☆ 1933 میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

☆ 1936 میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

☆ 1937 میں الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

☆ 1938 میں عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

2.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ علامہ اقبال کا اردو اور فارسی زبان ہی نہیں بلکہ دنیا کی کئی ترقی یافتہ زبانوں میں ممتاز اور اہم مقام ہے۔

☆ اقبال نے برصغیر کی فکری و فنی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور نئی جہتیں متعین کی ہیں۔

☆ اقبال کا علمی و ادبی سرمایہ جو خطبات، مضامین، تقاریر، بیانات، خطوط اور شاعری کی لافانی کتب کی صورت میں ملتا ہے یہ بلاشبہ ایک امانت ہے۔

☆ اقبال نے اردو زبان کو بڑی بننے اور دنیا کے مہذب زبانوں میں کھڑی ہونے کے قابل بنایا۔

☆ اقبال کی نثر شعر کی تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے اور ان کے افکار و شخصیت کے مخفی گوشوں کو جانچنے اور پرکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

☆ اقبال نے اردو و فارسی شاعری کو فکر و فلسفہ کے فن کارانہ اظہار سے آشنا کیا۔

☆ اقبال نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر اردو و فارسی شاعری کو اپنی فکر سے بلند کیا ہے۔

☆ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں ان تمام جدید اسلامی فکر و مسائل پر بحث کی ہے، جو نہ صرف امت مسلمہ کی تہذیبی و سیاسی ضرورت ہے بلکہ تمام بنی نوع انسانیت کے درپیش مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی ہے۔

☆ اقبال کے پی۔ایچ ڈی کا مقالہ جو انہوں نے میونخ یونیورسٹی (1908 میں لکھا تھا۔اس کا اردو ترجمہ میر حسن الدین (بی اے ایل ایل بی) نے ''فلسفہ عجم'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

☆ ''Stray Reflection'' اقبال کی اپنی خود کی ڈائری ہے، جو انگریزی زبان میں ہے، جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف تاثرات پیش کیے ہیں۔اس ڈائری کے مختلف اردو تراجم بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جیسے ''شذرات فکر اقبال'' از افتخار احمد صدیقی، بکھرے خیالات'' از ڈاکٹر عبدالحق۔ اقبال کے فلسفہ و شعر اور ان کے فکری اسالیب کی تفہیم کے لیے یہ ایک ناگزیر دستاویز ہے۔اس میں بتیس سال کے نوجوان شاعر کے مختلف النوع فکر پارے موجود ہیں۔

2.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
برگزیدہ	:	منتخب، چنا ہوا، مقبول، پسندیدہ
عدیم المثال	:	بے مثال، بے نظیر، لاجواب
وافر	:	بہت کثیر، وسیع
دسترس	:	رسائی، پہنچ، قدرت، اختیار
لافانی	:	باقی رہنے والا، جو فنا نہ ہو، دائمی، ابدی
بحر بیکراں	:	وسیع و عریض سمندر، جس کا کنارہ نہ ہو
جامعیت	:	وسعت، ہمہ گیری
عالمگیریت	:	آفاقیت
حمیت	:	غیرت، عزت کا احساس
بصیرت	:	عقل، فہم، شعور
تلاطم	:	شدت سے موجوں کا اٹھنا اور آپس میں ٹکرانا، پانی کے تھپیڑے
قنوطیت	:	مایوسی، محرومی امید

تفہیم	:	علم میں آنا، سمجھ میں آنا
نوعیت	:	قسم، کیفیت
مشاہیر	:	مشہور اشخاص، بزرگ اور نامور لوگ
گہر آبدار	:	چمک دار موتی
نشاط آفریں	:	خوشی و شادمانی پیدا کرنے والا، خوش گوار
مبسوط	:	پھیلا ہوا، کشادہ

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال نے اپنے کس مجموعے کو دورِ حاضر کے اعلانِ جنگ کہا ہے؟

2۔ اقبال کی پہلی نظم کون سی ہے؟

3۔ اقبال نے اپنے خطبات کن شہروں میں دیے؟

4۔ علامہ اقبال نے گول میز کانفرنس میں کتنے بار اور کب شرکت کی؟

5۔ علامہ اقبال کی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کو کس نے انگریزی میں ترجمہ کیا؟

6۔ علامہ اقبال کی پہلی تصنیف کا نام بتائیں اور یہ کتاب کب شائع ہوئی؟

7۔ ''پیامِ مشرق'' پہلی بار کب شائع ہوئی اور اس کا دیباچہ کس نے لکھا ہے؟

8۔ اقبال کے چوتھے مجموعہ کا نام لکھیں اور یہ کب شائع ہوا؟

9۔ مضامین اقبال کو کس نے مرتب کیا ہے؟

10۔ اقبال کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف کا نام کیا ہے؟

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سولات:

1۔ اقبال کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ اقبال کے اردو شعری کارناموں کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

3۔ خطبات اقبال پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ اقبال کی پہلی نثری تصنیف کے بارے میں معلومات بیان کیجیے۔

5۔ اقبال کے مختلف مضامین پر مرتب تصانیف کا مختصر جائزہ لیجیے۔

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال نے اردو زبان کو دنیا کے مہذب زبانوں میں کھڑی ہونے کے قابل بنایا، وضاحت کیجیے۔

2۔ علامہ اقبال کی اردو و فارسی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

3۔ علامہ اقبال کی نثری خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال
2۔	کلیاتِ مکاتیب اقبال	مرتب مظفر حسین برنی
3۔	تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ	علامہ اقبال، مترجم: سید نذیر نیازی
4۔	اقبالیات کے نقوش	مرتب ڈاکٹر سلیم اختر
5۔	خطبات اقبال	مرتبہ رضیہ فرحت بانو
6۔	مضامین اقبال	مرتب تصدق حسین تاج
7۔	فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
8۔	دانشور اقبال	آل احمد سرور
9۔	اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد
10۔	افکارِ اقبال	محمد عبدالسلام خان

اکائی3: اقبال کا فکری ارتقا: اہم تصورات

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		اقبال کا فکری ارتقا اہم تصورات
	3.2.1	تصور خودی
	3.2.2	تصور عقل و عشق
	3.2.3	تصور مرد مومن
	3.2.4	تصور اسلام
	3.2.5	تصور ابلیس
3.3		اکتسابی نتائج
3.4		کلیدی الفاظ
3.5		نمونہ امتحانی سوالات
	3.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	3.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	3.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
3.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

علامہ اقبال کی شخصیت گونا گوں خصوصیات کی حامل ہے۔ان کے کلام میں موضوعات اور افکار کا تنوع ہے۔ بانگ درا کی ابتدائی نظموں سے بال جبریل کی غزلوں تک اور ضرب کلیم کے افکار سے ارمغان حجاز کی پیکر تراشی تک مختلف شعری اصناف میں ان کی فکر کے گوشے دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے شاہین کی بلند پروازی سے بھی استفادہ کیا ہے اور ابلیس کے حرکت و عمل کو بھی مثال بنایا ہے۔ان کے یہاں ابلیس صرف منکر خدا نہیں ہے بلکہ ملٹن اور گوئٹے کی طرح نا قابل تسخیر ارادے اور عزم کا مالک بھی ہے۔اقبال کا یہ تصور ان کے فلسفۂ خودی کا جز ولا ینفک ہے۔خودی کے ساتھ عشق و عقل اور فلسفۂ اسلام نے ان کے تصور 'مرد مومن' کو جلا بخشا ہے، جس کو بنیاد بنا کر انسان مرد کامل بن جاتا ہے۔اقبال کی ابتدائی زندگی سے آخری وقت تک ان کے فکری ارتقا میں جہاں ایک طرف ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، قرآن اور مشرقی ادبیات و شخصیات سے وابستگی ایک جدا

گانہ حیثیت رکھتے ہیں وہیں دوسری طرف مغربی علوم وادبیات اور شخصیات سے وابستگی، یورپ کا سفر وحضر اور اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی صورت حال بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ علامہ اقبال کے ذہنی وفکری ارتقا کے تشکیلی عناصر کو بیان کر سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے فکری ارتقا میں کارفرما مختلف عناصر کی جداگانہ حیثیت ومعنویت پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے ذہنی وفکری تصورات کی تشکیل میں مختلف مراحل کس طرح کارآمد ثابت ہوئے، اس کو بیان کر سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے کلام و پیام کی عظمت میں مسلسل ومربوط فکری وفنی ارتقا کی اہمیت واضح کر سکیں۔
- ☆ اقبال کے فکری تصورات کی روشنی میں ان کے کلام کا مطالعہ کر سکیں۔

3.2 اقبال کا فکری ارتقا: اہم تصورات

سفر یورپ اقبال کی فکری تشکیل اور ان کے فکری انقلاب میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی فکر میں ایک بڑا انقلاب آیا۔ ان کی فکر میں وسعت اور آفاقیت پیدا ہوگئی تھی۔ واپسی کے سفر میں جب ان کا جہاز اٹلی کے جزیرہ سسلی کے ساحل کے قریب سے گزرتا ہے تو ان کا ذہن تابناک ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتا ہے اور ان کا حساس اور دردمند دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ امت مسلمہ کی حالت پہلے کیا تھی اور اب کیا ہوگئی ہے:

اِک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور

کسی زمانے میں مسلمانوں کی بھی عظیم الشان سلطنت تھی اور اپنے دور میں تہذیب وتمدن میں دیگر اقوام کی معاصرانہ زندگی سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ایک قوم جو شاندار نصب العین کی حامل تھی وہ اب جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ جزیرہ سسلی کے ساحل کے قریب ان کے دل کے فکری جذبات ان اشعار میں امڈ کر سامنے آنے لگتے ہیں:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلادے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

''صقلیہ'' (جزیرہ سسلی) بانگ درا

اس دور کی نظمیں، بلاد اسلامیہ، گورستان شاہی، فلسفہ غم، خطاب بہ جوانان اسلام، مسلم، شمع اور شاعر وغیرہ میں ملت اسلامیہ کی بیداری اور وقار کا عنصر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلاف کے کارناموں کو پیش کر کے ایک قوم کو انقلاب آمیز مستقبل کی طرف گامزن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بشرطیکہ اگر وہ قوم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر گامزن ہو اور اپنے اندر کی صلاحیت کو پہچانے۔

یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز
لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز

خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوشِ ارم
جس نے دیکھے جانشینان پیمبر کے قدم

جس کے غنچے تھے چمن ساماں، وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما، ان کا مدفن ہے یہی

بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

اے مسلماں ! ملتِ اسلام کا دِل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

جب تلک باقی ہے تو دُنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

''بلاد اسلامیہ'' (بانگ درا)

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے، آبادیاں بَن ہوگئیں

خود تجلّی کو تمنّا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نااُمید نورِ ایمن ہوگئیں

''شمع اور شاعر'' (بانگ درا)

اس یاس انگیز ماحول کی وجہ سے اقبالؔ کے شعری افکار نے ایک نئی کروٹ لی۔ اقبالؔ کے فکری رجحان نے جذبات ملّی پر مبنی ایک فلسفیانہ رُخ اختیار کیا۔ اس عہد کی نظمیں اور کئی نثری مضامین ملت اسلامیہ کی بیداری، اسلامی قدروں کے احیا، مسلم فرد اور معاشرے کی تعمیر نو کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگی، علوم وفنون کی بے انتہا ترقی، عالم اسلام کی معاشرت کے لیے امید افزا پیغام اور اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی سے لبریز ہیں۔ ان میں ''ترانہ ملی''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''مسلم''، ''نوید صبح''، ''فاطمہ بنت عبداللہ'' وغیرہ جیسی نظمیں کافی اہم ہیں۔

1912ء سے 1938ء کا عرصہ اقبالؔ کے فکری ارتقا میں کافی اہم ہے۔ اس عرصے کے دوران انہوں نے مثنوی اسرارِ خودی کا آغاز کیا۔ یہ کتاب کئی سال تک مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد شائع ہوئی اور نقد ونظر کا موضوع بنی ہے۔ اسرار خودی پر کی جانے والی تنقید کے جوابات اور پیشہ وارانہ مصروفیات کے ساتھ مثنوی رموز بے خودی کی تخلیق بھی جاری تھی۔ استفسار واستفہام، تلاش وجستجو، سوز وساز، غور وفکر ابتدائی کلام میں پایا جاتا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اس عالم رنگ وبو اور کائنات کے شور وشغف میں انہیں اپنے اندر ایک صلاحیت نظر آنے لگی جو بلا کی طاقتور ہے۔ لہٰذا ان مراحل کو انہوں نے اپنے نوخیز وجدان کے سہارے زندہ رود کی طرح امید ویقین کی طرف بڑھایا۔ اب اقبالؔ کا مضطرب ذہن پکار اٹھتا ہے:

اسی اقبالؔ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مُدّت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

اس کلام کے علاوہ اس عہد کی غزلوں کے حوالے سے اگر اقبالؔ کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بھی شکوہ اور باقی نظموں کی طرح وہی بے باکی اور خدا سے ہم کلامی، تو شب آفریدی، چراغ آفریدم والی کیفیت، کائنات کی تکمیل میں انسان کی سرگذشت کی ناگزیریت کا شعور، انسانی شخصیت اور انسانی تشخص کا احساس پایا جاتا ہے۔

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رَب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا
(بال جبریل)

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

3.2.1 تصور خودی:

اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمان کی زندگی کے دو پہلو ہیں؛ ایک دین اور دوسری دنیا۔ دین میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پہلو شامل

ہیں۔ان میں ایک پہلو انفرادیت اور دوسرا پہلو اجتماعیت پر منحصر ہے۔دنیا میں کاروبارِ معیشت کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی ہے اوران دونوں میں غور وفکراور تدبر کا پہلو بھی مضمر ہے۔جس کے ذریعہ انسان طبعی عالم پرغور وفکر کے بعد مابعدالطبعیات تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔گویاطبعیات سے وہ منزل بہ منزل ارتقاپذیر ہوتے ہوئے مابعدالطبعیات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔اقبالؔ کے نظریۂ خودی اور رموز بے خودی انہی تصورات کے اردگرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خودی سے پہلے افلاطونی نظریہ، ہندومیتھالوجی اور بدھ مت کے نظریہ کوذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ اسی وجہ سے شیخ محی الدین ابن عربی کے ذریعہ مسلمانوں میں تصوف کا وحدت الوجودی نظریہ عام ہوا۔نظریہ عقل کی رو سے سب چیزیں فانی ہیں۔عقل اور وجدان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔کائنات موہوم،نفس انسانی بے حقیقت اور زندگی بے ثبات اور سعی وعمل لاحاصل ہے۔وجودِ حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے۔ہندو حکماء اس دنیا کو مایا سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی مشرق میں زیادہ مقبول ہوا جس کی وجہ سے مشرق میں ترک عمل اور رہبانیت کا رویہ عام ہو چلا تھا۔پستی، ذلّت وخواری اور درماندگی روز روشن کی طرح عیاں ہونے لگی۔سیاسی، سماجی، معاشی وتمدنی مسائل کو لوگوں نے دنیاداری سمجھ رکھا تھا اوران سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔یہ سب چیزیں جب ایک قوم میں داخل ہوتی ہیں تو وہاں پرکشمکش حیات، جہد وعمل، اخلاقی ذمہ داری کا احساس اور دین ومذہب کی ترجمانی کرنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے یہ سب چیزیں تولازماً ایک قوم کو ذوق عمل سے محروم کردینے والی ہیں لہٰذا علامہ اقبال نے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا اوران نظریات کورد کر کے خودی کا نظریہ پیش کیا اور یہی خودی مختلف مرحلوں سے گذرتے ہوئے انسان کامل اور مردمومن تک رسائی کرتی ہے۔علامہ اقبالؔ کے نزدیک خودی یعنی اپنا وجود تسلیم کرنا، اپنی شخصیت کا احساس اور اس کا سمجھنا، خودشناسی، خود کا ادراک، خودآ گاہی، ذوق حیات، ذوق تخلیق اور معرفت نفس کا نام ہے۔آسان لفظوں میں خودی کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے۔اس نے ہرشخص کے اندر کچھ صلاحیتیں اور قابلیتیں ودیعت کی ہیں۔لیکن انسان اس سے ناآشنا ہے قدرت کا منشا یہ ہے کہ انسان اپنی ان صلاحیتوں کی تلاش میں نکلے۔اسی طرح اپنی ترقی وارتقاء کا سامان اپنے لیے خود پیدا کرے۔جس شخص کی صلاحیتیں غیر ترقی یافتہ اور غیرارتقاء پذیر رہ گئیں ہوں، اس کی خودی خام ہے وہ بس مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔جس انسان نے ان صلاحیتوں کو بیدار کیا یا اسے اس کا ادراک ہوا اوراس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالی تو گویا اس نے خودی اور زندگی کا راز پالیا۔

خودی کیا ہے؟ راز درون حیات
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات

ساقی نامہ(بال جبریل)

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہوجائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو!

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اِک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

(خضرراہ) بانگ درا

خودی کے اجزائے ترکیبی میں دوسرا مرحلہ تب شروع ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اس دنیا میں غور وفکر اور تدبر کرتا ہے کیوں کہ اللہ نے انسان کو اپنا جانشیں بنایا ہے۔ کائنات میں اسے اپنے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک جب انسان طبیعات پر غور وفکر کرتا ہے تب جا کے خالقِ کونین کے اسرار ورموز سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔ لہٰذا خودی ایک لازوال قوت ہے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیات اور مختلف حالات پر غور وفکر کے ردعمل کی شیرازہ بندی ہے اور معرفت ذات باری کے مابین ایک واسطہ ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت کے لیے اطاعت الٰہی، ضبط نفس اور نیابت الٰہی یہ تین مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔ افلاطونی نظریہ میں جہاں عقل اور وجدان ایک دوسرے کے ضد ہیں وہیں اقبالؔ اسے ایک دوسرے سے مربوط اور تکمیل حیات قرار دیتے ہیں۔ تکمیل حیات ہی کے ذریعہ خدا کو پہچانا جاتا ہے اور خودی سے ہی خدا بے حجاب ہوتا ہے:

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی!

غزل (بال جبریل)

انسان میں خودی جب جاگزیں ہوجاتی ہے تو وہ زمان ومکان کی قیود سے بے نیاز ہوکر آگے بڑھتا ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو مصروف عمل اور جہان تازہ کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے۔ وہ دنیا سے نہیں بلکہ اس سے دنیا ہے۔ لہٰذا اس دنیا کی کوئی اہمیت نہیں۔

تیری خاک اس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

ساقی نامہ (بال جبریل)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جہاں میں عمل وحرکت کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا حرکت وعمل بہت ضروری ہے اور اسے اس جہاں کے زمان ومکاں کے طلسم کو توڑ کر آگے ہی بڑھتے جانا ہے۔ اسی حرکت وعمل سے علامہ اقبال کا تصور اجتہاد وجود میں آیا :

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
غزل(بال جبریل)

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
ساقی نامہ(بال جبریل)

3.2.2 تصورعقل وعشق:

اقبال کے کلام میں تصورخودی کے ذیل میں جس فلسفے کا تذکرہ ملتا ہے اس میں عشق کی بڑی اہمیت ہے۔کلام اقبال کے ہر گوشے میں عشق کا تذکرہ ملتا ہے لیکن یہ 'عشق' تنہا کبھی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ عقل کا موازنہ ملتا ہے۔اقبال کے یہاں عشق کو عقل پر برتری حاصل ہے اورانہوں نے دلائل کے ساتھ اپنے کلام میں جگہ جگہ اس کو ثابت بھی کیا ہے۔عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''عملی زندگی میں جو خطرناک مہالک پیش آتے ہیں ان کے مقابلے کے لیے جس جرأت، استقامت اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے وہ عقل میں بہت کم پائی جاتی ہے۔عشق آگ میں نہایت بیبا کی سے کود پڑتا ہے لیکن عقل دیکھ بھال میں رہ جاتی ہے۔'' (اقبال کامل)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق کی اک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

ان اشعار میں عشق کا بے خطر ہو کر آگ میں کودنا اور عقل کا محو تماشا ہونا، عقل کا کائنات کی وسعتوں کو محدود سمجھنا یا عقل کا منزل نہ ہو کر چراغ راہ ہونا دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ عقل کو دوام حاصل نہیں ہے اور اس کی کارکردگی محدود ہے۔اقبال کے نزدیک عقل کا مفہوم حواس خمسہ کی مدد سے کسی چیز کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔لیکن ہر مقام پر عقل کا فیصلہ آخری نہیں ہوتا۔بعض مقامات پر عقل کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔عقل صرف مادی بیماریوں کا علاج کر سکتی ہے روحانی کا نہیں۔

اقبال کا فلسفۂ عشق دراصل ان کے فلسفۂ خودی کا ہی ایک رُخ ہے۔عشق انسان کو زمان و مکان کی قید سے نجات دلاتا ہے اور اس کی ذات

کی تکمیل کرتا ہے۔اقبال سے پہلے بھی استاد شعرا نے اس خیال سے اتفاق کیا ہے:

لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

میرؔ

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

غالبؔ

علامہ اقبال کے نزدیک عقل اہم اور ضروری تو ہے لیکن حیات انسانی کی صحیح رہنمائی اس کے بس کی بات نہیں۔اقبال نے اس کی تردید کی کہ علم وعقل کے ذریعہ حاصل کردہ یقین پر اپنا مقام تو واضح ہوتا ہے لیکن صرف عشق ہی کے ذریعہ ہی اس مقام تک پہنچایا جاسکتا ہے۔وہ حقیقت کے باطنی پہلو تک رسائی کے لیے خارجی پہلو کی تسخیر کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جس کے لیے غور وفکر اور تدبر کی ضرورت ہوتی ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ، یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل اور عشق کے موازنے میں اقبال عشق کو ہی فوقیت دیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ مادی اور خارجی دنیا کے معاملات کو سلجھائے۔اقبال کے نزدیک عقل کی رسائی صرف مظاہر تک ہے اور عشق مظاہر سے گذر کر براہ راست حقیقت کے عین تک پہنچتا ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علامہ اقبال کے نزدیک انسان کے اندر اجتہاد کی صلاحیت اس وقت تک پیدا نہیں ہوگی جب تک کہ اس کے اندر عشق نہ ہو کیوں کہ حصول مقصد کے لیے جذبے اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک انسان کی آواز میں تڑپ اور ولولہ نہ ہو تب تک حصول مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

انسان کے اندر ہزاروں خواہشیں پیدا ہوتی ہیں لیکن انہیں پایہ تکمیل تک لانا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اسے عشق نہ ہو۔اس کی تکمیل کے لیے ایک جذبے اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔علامہ اقبال کے نزدیک متواتر حرکت اور جدوجہد کے ذریعے آرزوئیں پایۂ تکمیل کو پہنچائی جاسکتی ہیں،لیکن اس کے لیے اپنی خودی کا ادراک ضروری ہے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو، تابع ستارہ نہیں

غزل(بال جبریل)

مسجد قرطبہ میں علامہ نے سلسلہ روز وشب کو حیات اور ممات کی اصل فرمایا اور یہ بھی کہا کہ یہ انسان کو پرکھتا ہے، جو انسان اس کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے وہ موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں اور جو پورے اترتے ہیں وہ بقائے دوام حاصل کرتے ہیں۔بقائے دوام وہی حاصل کرسکتا ہے جو مردخدا ہو جس کو اپنے کام سے عشق ہو چوں کہ مردِخدا صاحب عشق ہوتا ہے اس لیے اس کے کام اور نقوش میں ثبات ودوام کا رنگ پایا جاتا ہے اور اسی عشق پر اقبال موت کو حرام مانتے ہیں۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصل حیات ،موت ہے اس پر حرام

مسجد قرطبہ(بال جبریل)

یہی وجہ ہے کہ علامہ نے مسجد قرطبہ کو حرم قرطبہ کہا کیوں کہ اس کو مردخدا نے اپنے خون جگر سے تعمیر کیا ہے۔علامہ اقبالؔ کے یہاں خودی میں انسانی ذات کی نشوونما اور ارتقا کے لیے اطاعت اور کچھ قوانین کی پابندی لازمی ہے،لیکن اس مرحلے میں قیودزماں کی پابندی نہیں ہے۔اس میں انسان مجبور محض نہیں ہے لیکن مختار کل بھی نہیں ہے یعنی خارجی زندگی کے بندھنوں میں ایک نظام ہے جس کے تحت انسان کو اپنی زندگی بسر کرنی ہے لیکن داخلی زندگی کی قید سے انسان آزاد ہیں۔تقدیر یا قسمت کے عقیدے نے مسلمان قوم کی عملی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے ان کو ناکارۂ محض بنادیا تھا اور اس سے قوتِ عمل چھین لی تھی۔

اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

''تن بہ تقدیر'' ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
''تن بہ تقدیر'' (ضرب کلیم)

لیکن علامہ نے اس تقدیر کے مسئلہ کو اس طرح سلجھانے کی کوشش کی اور یہ پیغام دیا۔

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام!
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ،ابھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند
''احکام الٰہی'' (ضرب کلیم)

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
غزل (بال جبریل)

3.2.3 تصور مرد مومن:

گزشتہ صفحات میں آپ نے اقبال کے تصور خودی اور تصور عقل وعشق کا مطالعہ کیا۔ اقبال کا تصور مرد مومن ان کے انہیں تصورات کی تکمیل ہے۔ اقبال کی نظر میں خود کا مطلب تکبر یا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ یہ خود آگہی، خود شناسی اور عرفان ذات کا نام ہے۔ جب انسان ان مراحل سے گزر جاتا ہے تو اس کے سینے میں علم وآگہی کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں سے آگہی حاصل کرتا ہے اور جب وہ ان مراحل سے آگہی حاصل کر لیتا ہے تو ایسے شخص کے لیے اقبال ''مرد مومن'' کا خطاب استعمال کرتے ہیں۔ اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اسے مردان خدا، مرد مسلمان، مرد کامل، مرد قلندر، مرد مومن کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

اقبال کے مرد مومن کے تصور کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''مرد مومن'' سے متعلق کچھ معلومات حاصل کی جائیں۔ یہ تصور اقبال نے کہاں سے اخذ کیا اس حوالے سے مختلف آرا موجود ہیں۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ خالص اسلامی تصور ہے تو کچھ لوگوں نے اسے ابن مشکوئی اور عبد الکریم جیسے اسلامی مفکرین کو اس کا منبع بتایا ہے۔ بعض لوگ اسے مغربی فلسفی نطشے (Nietzsche) کے فوق البشر (Superman) کا عکس سمجھتے ہیں۔ محققین نے مرد مومن کے تصور کے یونانی فلسفیوں اور مولانا روم سے اخذ کیے جانے کی بات بھی کہی ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''...اقبال کے یہاں انسان کامل کا جو تصور ہے وہ ابن عربی کے تصور انسان کامل اور نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے۔ یہ کارلائل کے ہیرو سے بھی مختلف ہے اور یہ Chirsmatic Person سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں عبدہٗ بقول اقبال چیزے دیگر ہے مگر محض عبد بھی ایمان کی توانائی سے اوپر اٹھتا اور اطاعت اور ضبط نفس کے ذریعے نائب حق کے منصب پر فائز ہو کر ستاروں سے آگے بڑھ جانے کی آرزو رکھتا ہے۔''

(مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ، مشمولہ بزم اقبال، لاہور، 1984، ص107)

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(طلوع اسلام)

نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

(ایک نوجوان کے نام)

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالد جانباز ہے یا حیدر کرار

(آزادی شمشیر کے اعلان پر)

اقبالؔ کے نزدیک انسان کے لیے خودی میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابندی لازمی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مادی قوتوں کی تسخیر بھی کرے اور انسانیت کی معراج پر فائز بھی ہو لیکن اخلاقی و روحانی اوصاف کا نمونہ بھی ہو۔ اگر انسان میں یہ اوصاف موجود ہوں تو وہ انسان ''انسان کامل'' بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال کا تصور مرد مومن انسان کی روحانی زندگی، انسانوں میں رحم، ہمدردی، انصاف اور حقوق کی ادائیگی کو اہم ترین فریضہ سمجھتا ہے۔ اس مین ایک نئی اور انوکھی شان پائی جاتی ہے۔ اس کے گفتار اور کردار میں اللہ کی برہان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا تصور مرد مومن مغرب کے نطشے کے سپر مین سے مختلف نظر آتا ہے۔ نطشے کے یہاں سپر مین اپنے آپ کو تمام ہستیوں سے اعلیٰ اور برتر سمجھتا ہے، حتیٰ کہ اس کے خدا کا وجود ہی نہیں ہے وہ ابن الوقت کے بجائے ابوالوقت ہوگا۔ رحم اور ہمدردی انسان کو کمزور کر دیتی ہے۔ بالفاظ دیگر نطشے کا سپر مین دنیا کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد خود خدا بن جاتا ہے۔ اپنے مفاد کے لیے وہ مفسد بن کر تباہی مچانے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ نطشے کا فوق البشر دراصل قوت، فراست اور تکبر جیسی خصوصیات کا مالک ہے۔ جب کہ اقبال کے مرد مومن کے اوصاف کا اندازہ ان چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہو تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مردمسلماں(ضرب کلیم)

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

پرورش پاتاہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضہ تخلیق!

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا ،سب کا رفیق!

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق!

مرد بزرگ(ضرب کلیم)

اقبال کا مردمومن ہرلحظہ نئی آن اور شان لیے ہوئے ہے۔اس کے مزاج میں گفتار اور کردار کے ساتھ ساتھ قہاری،غفاری،قدوس اور جبروت کے عناصر بھی شامل ہیں۔اس کا یقین محکم اور عمل پیہم ہے اور مزاج میں درویشی اور قلندری ہے۔وہ فقر وعشق کا امتزاج ہے اور فرسودہ قدروں کے بجائے تعمیر حیات نو کا خواہاں ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک یہی حقیقی اسلامی تصور ہے جس میں شریعت کی پابندی کے ساتھ اللہ تک رسائی حاصل ہوسکتی ہے۔علامہ اقبالؔ ایسا نظام دیکھنا چاہتے تھے جس میں کوئی فرد دوسرے کا غلام اور دست نگر نہ ہو۔ ہر ایک انسان کو اپنی ذاتی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے پورے پورے مواقع میسر ہوں۔انسانی زندگی کی تشکیل کے لیے ایک ایسا معاشرہ ہو جو ہر قسم کے خوف و ہراس سے پاک ہو، معاشرے میں ایسی فضا ہو جس میں انسان کی خودی نشو ونما پا سکے لہٰذا علامہ کے نزدیک دین اسلام ہی ایسا نظام پیش کرسکتا ہے۔کیوں کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور وہ ابدی اور اٹل قوانین واقدار پر مشتمل بہترین فلسفہ زندگی پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک دائمی مقصد اور منزل کے تعین کا نظریہ بھی دیتا ہے۔

3.2.4 تصورِ اسلام:

اقبال نے اپنے کلام میں عقیدۂ توحید اور فکرِ اسلام کی بھی تبلیغ کی ہے۔ انہوں نے یورپ سے واپسی کے بعد سے اپنی زندگی کے آخری ایام تک اپنے کلام میں اسلامی فکر و عقیدۂ توحید کو برتا ہے۔ غزل کے اشعار میں یہ فکر نصیحت کے طور پر دکھائی دیتی ہے جب کہ نظموں میں یہ فکر پیغام کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس ضمن میں شکوہ، جواب شکوہ، ذوق و شوق، احکام الٰہی، اسلام، بلال، پنجابی مسلمان، توحید، حضور رسالت مآبؐ میں، دعا، دین و سیاست، روح ارضی آدمؑ کا استقبال کرتی ہے، ساقی نامہ، شب معراج، طلوع اسلام، مذہب، مردانِ خدا، مردِ مسلمان، لادین سیاست، کافر اور مومن، کفر و اسلام، ملا اور بہشت، مہدی برحق، ببوت، نکتہ توحید، نماز، اذان، ابلیس کی مجلس شوریٰ وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں اقبال نے اسلامی فکر اور اسلامی تصورات کو واضح کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام ہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو خسارے سے بچا کر اس کے لیے نجات کا راستہ فراہم کرتا ہے، اور قرآن مجید وہ واحد کتاب الٰہی ہے جو بندوں کو سیدھے راستے پر چلنے کے لیے رہنمائی کرتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ تمام عالم کی بقا اسی میں ہے کہ وہ راہ اسلام کو اپنا کر حضرت محمدؐ کی پیروی کریں اور ان کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔ اقبال نے اپنی نظموں میں ان خیالات کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کی نظم 'جواب شکوہ' قابل ذکر ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کو عمل کی تلقین کرتے ہوئے اتباعِ رسولؐ کی دعوت پیش کی ہے:

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

اقبال کے فکری ارتقا پر بات کرتے ہوئے ان کے عقیدۂ توحید کو زیر بحث لانا اس لیے بھی لازمی ہے کہ اقبال کا فلسفۂ مردِ مومن جن اجزا سے مل کر بنا ہے اس میں خودی اور عشق کے علاوہ فقر و استغنا بھی شامل ہے اور اس کی تکمیل کے لیے اقبال بار بار مسلمانوں کو ان کے تابناک ماضی کی یاد دلا کر بیدار کرنا چاہتے ہیں:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو اجداد تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

3.2.5 تصورِ ابلیس:

اگرچہ اسلامی مذہب میں ابلیس کو ملعون اور منکر قرار دیا گیا ہے لیکن خدا کے علاوہ کسی اور (آدم) کے سامنے سجدہ نہ کرنے کی نافرمانی اور ناقابل تسخیر ارادوں کی مخصوص قوت نے اسے ادب میں بڑے بڑے لوگوں کے لیے مثال بنا دیا۔ بعض مشرقی مفکرین نے تو اسے سب سے بڑا توحید پرست اور موحد قرار دیا ہے۔ منصور حلاج ابلیس کے فرائض کو تلخ اور ناگوار سمجھتے ہیں۔ ابن عربی نے اسے ارادے سے آزاد بتایا ہے۔

نہ صرف عربی اور فارسی بلکہ اطالوی، انگزیری اور جرمن میں بھی اس کے مفکرین نے اس کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ دانتے نے "Divine Comedy" میں ابلیس کا تصور پیش کیا۔ اس نے شیطان کا وہی تصور پیش کیا جو بائبل میں ہے۔ وہ اسے دوزخ کے ساتھ ساتھ

دنیوی نمائندہ قرار دیتا ہے اور زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔ ملٹن نے اپنی نظم ''Paradise Lost'' میں شیطان کو ناقابل تسخیر شخصیت کا مالک مانا ہے۔ اس کی ہیبت سے دوزخ بھی کانپ جاتی ہے۔ گوئٹے نے اپنے ڈراما "Faust" میں شیطان کے انسان کے بہکانے کے عمل کو مفید قرار دیا ہے۔

اقبال کا کلام اور پیغام چوں کہ سراپا عمل و حرکت ہے اور وہ 'یقیں محکم عمل پیہم' میں یقین رکھنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ایسی زندگی کو موت سمجھتے ہیں جس میں انقلاب نہ ہو۔ وہ زندگی میں جمود، سکوت اور ٹھہراؤ کے قائل نہیں ہیں بلکہ مسلسل منزل کی جستجو میں آگے بڑھتے رہنے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ بار بار ابلیس کو اپنے فکر و فلسفے سے اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ اس کی شخصیت میں پوشیدہ شر کو نہیں دیکھتے بلکہ حرکت پیہم، مسلسل جدوجہد اور تڑپ سے انسانوں کو سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ وہ جبریل کی طرح ہمیشہ عاجزی اور انکساری کو پسند نہیں کرتا۔ جبریل کی زندگی پر سکون ہے اور شیطان نے انسانوں کی زندگی میں ہنگامہ برپا کیا ہوا ہے۔ وہ ناقابل تسخیر ارادوں کا مالک ہے۔ لامکاں اسے تبدیل نہیں کر سکتا، وہ ہر جگہ یکساں طور پر متحرک ہے۔ اقبال کی نظم ''جبریل اور ابلیس'' اس کی سب سے بہترین مثال ہے۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر　　کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح　　تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو،

یہ ابلیس کی شخصیت کا ایک پہلو ہے، لیکن اقبال نے اس کا دوسرا پہلو بھی پیش کیا ہے۔ وہ انسان کی سستی اور کاہلی پر نالاں بھی ہوتا ہے۔ جنت کی حوریں بھی پریشان ہیں کہ اگر انسان اسی طرح فرمان خدا کی سرتابی کرتا رہا تو جنت کیوں کر اچھے لوگوں سے بھرے گی۔ ابلیس جن کاموں کو کرنے کے لیے فکرمند رہتا تھا اب وہ سارے کام انسان خود ہی کرنے لگا ہے۔ اس لیے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ ''ابلیس کی عرضداشت'' میں اقبال کا انداز دیکھیے۔

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے　　پر کالۂ آتش ہوئی آدم کی کف خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب　　دل نزع کی حالت میں، خرد پختہ چالاک
تجھ کو نہیں معلوم کہ حوران بہشتی　　ویرانیٔ جنت کے تصور سے ہیں غمناک
جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست　　باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعے ابلیس کی مدد سے انسان کی خفیہ تخلیقی قوتوں کو ابھارنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے اکسایا ہے۔ نظموں میں شیطان کے کردار کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے اقبال سوز و گداز اور تڑپ کا پیغام دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے عزم سے ایک ایسے راستے کا مسافر بن جائے جہاں سے اس کی نگاہیں 'ستاروں سے آگے' کے جہان پر مرکوز ہوں۔

3.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ علامہ اقبال کے فکری ارتقاء کی تشکیل میں ان کے والدین کی تربیت کافی اہمیت رکھتی ہے۔

☆ مولانا میر حسن اور پروفیسر آرنالڈ کی مشفقانہ رہبری نے اقبال کی فکر کو جلا بخشی۔

☆ علامہ اقبال کے ذہنی و فنی ارتقاء میں یورپ کا سفر ایک جداگانہ حیثیت و معنویت رکھتا ہے۔

☆ علامہ اقبال کا ذہنی سفر ابتدا ہی سے مقصدی موضوعات کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا۔

☆ علامہ اقبال کے یہاں تصور خودی خودشناسی، خود کے ادراک اور خودآگاہی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

☆ علامہ اقبال کے یہاں حصول مقصد کے لیے جذبے اور لگن کا نام تصور عشق ہے۔

☆ علامہ اقبال کا مرد مومن کسی تقدیر کا پابند نہیں ہے۔

☆ علامہ اقبال نے قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروت ان چار عناصر کو مسلمان کے لیے بنیاد قرار دیا ہے۔

☆ علامہ اقبال کے تصور مرد مومن میں عشق، جہد و عمل، حق گوئی، بے باکی، فقر استغنا اور جلال و جمال جیسی خصوصیات پائی جاتی ہے۔

☆ علامہ اقبال کا پسندیدہ نظام اسلامی نظام ہے۔ جس میں باہمی اخوت اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔

☆ علامہ اقبال کے نزدیک آج کے دور میں اسلامی نظام ہی ایسا معاشرہ پیش کرسکتا ہے جو ہر قسم کے خوف و ہراس سے پاک ہو۔

3.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
عارفانہ	:	خداشناسی سے متعلق
قناعت	:	تھوڑی سی چیز پر رضامندی
معرفت نفس	:	نفس کی پہچان
اسلاف	:	سلف کی جمع، قدما، مورث
رہبانیت	:	صوفیاء کا طریق زندگی، راہب ہونے کی حالت
انحطاط	:	نقصان یا زوال
ارتقاء	:	درجہ بدرجہ ترقی کرنا
احتساب	:	محاسبہ کرنا
تکمیل حیات	:	زندگی کو مکمل کرنا
نقوش	:	نقش کی جمع، نشانات، علامات
آدم گری	:	انسانیت، شرافت آدمیت، خیر اندیشی
افلاک	:	فلک کی جمع، آسمان، خلا یا فضا
معتبر	:	اعتبار کیا گیا، قابل اعتماد
گردونواح	:	آس پاس کا علاقہ
قناعت	:	تھوڑی سی چیز پر رضامندی
ودیعت	:	امانت تفویض، سپردگی

خس وخاشاک	:	:گھاس پوس، تنکے
تلمذ	:	شاگردی،شاگرد ہونا
تسخیر	:	مسخر کرنا،تابع کرنا،کسی پر غالب آنا
سرتابی	:	سرکشی،نافرمانی
عزم	:	ارادہ

3.5 نمونۂ امتحانی سوالات

3.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ The Reconstruction of Religious Thought in Islam کا اردو ترجمہ کس نام سے ہوا ہے؟

2۔ ''بچوں کی تعلیم وتربیت''مضمون علامہ اقبال نے کب لکھا ؟

3۔ ''Paradise Lost'' کس کی نظم ہے؟

4۔ علامہ اقبال کے اردو کے کل کتنے شعری مجموعے ہیں؟ نام بتائیے۔

5 اقبال نے اپنی ابتدائی تعلیم کس استاد سے حاصل کی؟

6 اقبال کے پی۔ایچ۔ڈی مقالے کا عنوان کیا تھا؟

7 اقبال نے ایم۔اے کا امتحان کب اور کس مضمون میں پاس کیا؟

8 اقبال کے مردمومن کی دوصفات بیان کیجیے۔

9 اقبال کے کس نظم میں تصور خودی کی ترجمانی زیادہ ملتی ہیں؟

10 نطشے کے فوق البشر کی تین خصوصیات بیان کیجیے۔

3.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال نے کتنی مدت تک یورپ میں قیام کیا؟ دوران قیام یورپ ان کی فکر میں کیا انقلاب آیا؟ بیان کیجیے۔

2۔ تصوف کے وحدت الوجودی نظریہ پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

3۔ بلاد اسلامیہ،شکوہ، جواب شکوہ، مسلم اور شمع وشاعر جیسی نظموں میں کس قوم کی عکاسی کی گئی ہے، وضاحت کیجیے۔

4۔ علامہ اقبال کے تصور مردمومن کی وضاحت کیجیے۔

5۔ اقبال کے تصور ابلیس پر ایک نوٹ لکھیے ؟

3.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے نظریہ خودی پر اظہار خیال کیجیے۔

2۔ علامہ اقبال کے یہاں عشق اور عقل میں بنیادی فرق کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

3۔ 1908ء سے 1938ء پر مشتمل عرصہ اقبال کے فکری ارتقا میں بہت اہم ہے۔ وضاحت کیجیے۔

3.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	اقبال سب کے لیے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
2۔	اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا	پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (تالیف)
3۔	اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا	پروفیسر عبدالمغنی
4۔	فکر اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
5۔	زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال
6۔	اقبال کامل	عبدالسلام ندوی
7۔	ذکر اقبال	عبدالمجید سالک

اکائی4: کلام اقبال کا فنی ارتقا

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 علامہ اقبال کا نظریہ شعروشاعر: مختصر تعارف

4.3 کلام اقبال کا فنی ارتقا

4.3.1 اقبال کے فکروفن کے مختلف ادوار

4.4 اکتسابی نتائج

4.5 کلیدی الفاظ

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

علامہ اقبال بیسویں صدی کے ایک معروف شاعر اور برصغیر کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ وہ مفکر بھی ہیں، حکیم بھی ہیں، کلیم بھی ہیں اور خودی کے پیمبر بھی ہیں لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک عظیم شاعر بھی ہیں۔ ان کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے۔ اردو اور فارسی شاعری ہی ان کی شہرت کی بنیادی وجہ ہے۔ اقبال ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جن کی شاعری کو ان کی فلسفیانہ فکر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بیک وقت ایک بڑے شاعر اور باضابطہ فلسفی بھی ہیں۔ وہ قدیم اور جدید روایتی اور عصری ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ مشرقی روایات سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی افکار سے بھی خوب واقف تھے۔ انہوں نے ادب میں نئے تجربے بھی کیے اور قدیم علامتوں سے نئے معنی بھی برآمد کیے۔ ان کو اس بات کا شدید احساس اور پورا اندازہ ہے کہ جب تک ان کی شاعرانہ شخصیت ان کے حکیمانہ پیغام کو جمالیاتی حیثیت سے بھی خوش آئند اور دل پذیر نہ بنائے اس پیغام کا اثر نہ مستحکم ہوگا نہ دائم و قائم رہے گا۔ اقبال کی شاعری میں جمالیاتی عناصر کی تلاش مطالعہ اقبال کا ایک اہم گوشہ ہے۔ اقبال نے جمالیاتی قدروں کی تلاش میں قطعی انفرادی اور جداگانہ روش اختیار کی ہے۔ اقبال کی شخصیت رنگا رنگ اور بلند قامت ہے۔ ان کا ذہن رسا تخلیقی عمل کے دوران

صدیوں کے انسانی تجربوں اور وجدانی ارتسامات کے لمحوں کو لفظوں میں سمو دیتا ہے اور اس عمل میں تواتر کی کیفیت موجود ہے۔ اقبال کی فن کارانہ چابکدستی کا کمال ہے کہ ان کا ہر تجربہ ان کے وجدانی شعور کا مظہر ہے۔ اس لیے بعض اوقات فلسفے پر بھی شعر کا گمان ہوتا ہے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ علامہ اقبال کے ذہنی ارتقا کے مختلف مراحل کی مدد سے ان کی شاعری کے فنی ارتقا کی وضاحت کر سکیں۔

☆ تراکیب و استعارات کا جو رنگ، جوش بیان کی نغمگی کا جو آہنگ اور تلمیحات و علامات کے جو اشارات اقبال کے طرز کلام کے امتیازی نقوش پیش کرتے ہیں اس پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ فن کا زندگی سے کس نوعیت کا رشتہ ہے؟ فن کو زندگی میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ فن اور فن کی مقصدیت کیا ہے؟ ان مسائل پر اقبال کے حوالے سے اظہار خیال کر سکیں۔

4.2 اقبال کا نظریہ شعر و شاعر: مختصر تعارف

گرچہ اقبال کے تصور فن میں عہد بہ عہد ارتقا نظر آتا ہے، لیکن اقبال ابتدا سے ہی فنون لطیفہ کو محض دل بہلانے کا مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کی تعمیر اور تزئین کا نہایت ہی موثر اور معتبر وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں فن ایک ایسا آلہ ہے جو کارزار حیات میں علم و حکمت سے زیادہ کارگر ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر شاعری کی تخلیق میں گرمئ دل، لذت جستجو، سوز آرزو اور سچے جذبات سے کام لیا جائے تو فنون لطیفہ کی ساری شاخیں لطیف ترین اور حیات افروز ہیں۔ شاعری کی ایک بڑی خصوصیت اس کا خلوص ہے۔ اقبال نے جس چیز کو خونِ جگر کہا ہے۔ وہ یہی خلوص ہے جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اپنی مشہور نظم ''مسجد قرطبہ'' میں وہ کہتے ہیں کہ ہنر کے معجزات آنی و فانی ہیں، سوائے ان کے جن کے دل میں جذبہ و خلوص کارفرما ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرفِ و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود
قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں بیشتر مقامات پر شعر و شاعر کی عظمت پر زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر فارسی شعری مجموعہ جاوید نامہ میں مولانا روم کی زبان سے اس کی عظمت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس شعر میں حرارت ہوتی ہے وہ حرارت درحقیقت اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین کی حرارت ہے۔ ایک سچا شعر اپنی شعلہ نوائی سے خس و خاشاک کو چمن زار میں بدل دیتا ہے۔ آسمان کے سینے میں شگاف ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر آرزوؤں کا خالق و پروردگار ہے، اس کی فطرت سراپا جستجو اور اس کی حیثیت ملت کے سینے میں دل کی سی ہوتی ہے۔ شاعر کے بغیر ملت مٹی کا ڈھیر ہے۔ شاعری گر

سوز و مستی سے متصف ہو تو تزئین عالم کا سبب ہوتی ہے۔ اگر شاعری کا مقصود آدم گری ہو تو وہ پیغمبری کی وارث بن جاتی ہے اور ایسے شعراء پیغمبروں کے وارث کہلانے کے مستحق ہیں۔ اگر کوئی فن افادیت و مقصدیت اور زندگی کی تعمیر و تہذیب سے عاری ہے تو اقبال کو قابل قبول نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

گفت آں شعر ے کہ آتش اندروست
اصل او از گرمئی اللہ ہوست
آن نوا گلشن کند خاشاک را
آن نوا برہم زند افلاک را
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

(جاوید نامہ)

ایک اور جگہ اقبال کہتے ہیں کہ شاعری ایسی ہو جو مردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دے، جن کے افکار و خیالات سے قوم کی زندگی میں نئی روح اور نئی جان پیدا ہو اور جمود کے بجائے تحرک پیدا ہو جائے اس لیے ایسی شاعری کو بانگ اسرافیل کہا ہے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے ،تاریخ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ اسرافیل

شعر(ضرب کلیم)

درج ذیل اشعار بھی شاعر کے مقام اور منصب کے بارے میں اقبال کے تصور کا اظہار کرتے ہیں:

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

شاعر(بانگ درا)

علامہ اقبال کے نزدیک کوئی بھی فن کار زندگی کو تب تک فراوانی اور فروغ بخشنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے فن سے بصیرت و بصارت کے ساتھ مسرت و شادمانی میں اضافہ نہ ہو۔ اگر اس کے ذریعہ زندگی کے حقائق کے الجھے ہوئے تار سلجھتے نہ ہوں تو اس کا فن بے معنی اور بے وقعت قرار پائے گا۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

فنون لطیفہ (ضرب کلیم)

علامہ اقبال کا نظریہ شعر یا نظریہ فن ان کے مخصوص فلسفہ خودی کے تابع بھی ہے۔ان کے یہاں فن خودی کے اظہار کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔لہٰذا وہ فن جس میں خودی باقی نہ رہے۔ان کے یہاں مستحسن نہیں ہے۔انہوں نے اپنے اس اصول کا اطلاق فن اداکاری پر کیا ہے۔اپنی نظم ''تیاتر'' میں انہوں نے بتایا کہ اداکاری کا کمال یہ ہے کہ خودی باقی نہ رہے لیکن اگر خودی نہ رہی تو فن کی تخلیق کیوں کر ممکن ہے؟ اسی لیے اقبال ڈرامے کو ادنیٰ درجے کا فن تصور کرتے تھے۔کیوں کہ یہاں فن اداکاری کا دارومدار جذبے سے زیادہ عقل پر ہے اس لیے اس کا اخلاص مشتبہ ہے۔اور خودی کی پرورش میں اس سے مدد نہیں مل سکتی۔یہ فن شخصیت کی گہرائیوں کو نہیں چھوتا بلکہ ظاہری طور پر جگمگاہٹ پیدا کرتا ہے۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا، خودی غیر کی ! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو ،تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات
(ضرب کلیم)

اب ذرا ان اشعار کا مطالعہ کریں آپ کو خود ہی اندازہ ہوگا کہ خودی سے اگر فن بیگانہ رہا تو اقبال کے نزدیک وہ پوری طرح فسون وفسانہ ہے۔وہ کہتے ہیں سرود، شاعری، سیاست، تصنیف وتالیف، فنون لطیفہ سب کا اظہار انسان سے ہوتا ہے جو بہ ظاہر مٹی کا پتلا ہے، لیکن اس کی تخلیقات ستاروں سے بھی اعلیٰ وارفع ہیں لیکن اگر یہ انسان کی خودی کی حفاظت نہ کریں تو بے کار ہیں۔دین ہو یا ادب اگر وہ فرد یا قوموں کی خودی کی تربیت نہ

کریں تو پھر وہ قوم رسوا ہو جاتی ہے۔

سرود و شعر و سیاست ،کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندہ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

دین وہنر (ضرب کلیم)

4.3 کلام اقبال کا فنی ارتقا

جیسا کہ کہا گیا کہ علامہ اقبال ایک مفکر کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شاعر بھی ہیں۔ان کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے۔شاعری ان کے لیے جزو پیمبری تھی۔ان کے نزدیک شاعری تفریح طبع کا مشغلہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کی حقیقی ترجمانی ہے۔انہوں نے ایک مکمل تصور کائنات کو شاعری کا رنگ وروپ دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔انہوں نے اپنے فلسفے کے اظہار اور توضیح کے لیے جن شاعرانہ وسائل کی مدد لی ہے وہ یقیناً فلسفیانہ منطق سے زیادہ معتبر بھی ہے اور موثر بھی۔ان کو اس بات کا شدید احساس اور پورا اندازہ ہے کہ جب تک ان کی شاعرانہ شخصیت ان کے حکیمانہ پیغام کو جمالیاتی حیثیت سے بھی خوش آئند اور دل پذیر نہ بنائے اس کے پیغام کا اثر نہ مستحکم ہوگا نہ اس میں فکر کے ساتھ ساتھ آفاقیت اور ابدیت پیدا ہوگی۔وہ تخلیق فن کا ادراک وشعور بھی رکھتے تھے اور اسے بلند پایہ سطح سے کس طرح پیش کرنا ہے اس سے بھی بخوبی واقف تھے۔ علامہ اقبال کا فن بھی ارتقا کے مختلف مراحل سے گزرا۔انیسویں صدی کے وسط میں جیسے ہی تہذیبی زندگی کے رجحان بدلنے شروع ہوئے ،مغربی تعلیم وطرز فکر سے مزاحمت کی صورتیں سامنے آئیں،تو شعراء کو بھی تہذیبی زندگی کے دوسرے پہلو کے ساتھ ساتھ شاعری اور شاعری کے فن پر غور وفکر کرنا پڑا۔ علامہ اقبال کے اس عہد میں گردونواح ہند اور دنیا کے بنی نوع انسان کے پے در پے مصیبتوں،سیاسی،سماجی اور اقتصادی بگڑتی صورتحال نے ان کے قلب وذہن کو بہت متاثر کیا۔مشرق ومغرب کی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں میں مغرب کی سیاسی فتح مندیاں اپنا نقش قائم کر رہی تھیں۔مشرق پر مغربی ذہن وفکر کے فتوحات کا اثر بیٹھ چکا تھا لہٰذا اس نظریہ نے بھی ادباؤ شعراء کو نئے سرے سے غور وفکر کرنے پر مجبور کیا۔

4.3.1 اقبال کے فکر وفن کے مختلف ادوار:

پہلا دور:

اس دور میں اقبال نے زیادہ تر ہلکی پھلکی غزلیں کہی ہیں۔اس سلسلے میں ان کے ابتدائی کلام پر مرزا ارشد گورگانی اور بعد ازاں داغ دہلوی کا رنگ غالب ہے۔ بانگ درا جس میں 66 نظموں کے ساتھ 27 غزلیں شامل ہیں۔اقبال نے دور اول کی غزلوں میں اپنے خیالات ایسی

تراکیب، استعارات اور محاورات کے ذریعے پیش کیے ہیں، جو اردو میں بہترین روایت کے نمونے ہیں۔ بانگ درا میں اقبال کے تینوں ادوار کا کلام موجود ہے۔ آگے چل کر انہوں نے غزل کے روایتی مضامین کو ایک طرف رکھ کر افکار و خیالات کا ایک نیا جہاں دریافت کیا۔ اپنی غزلوں میں فلسفیانہ تصورات و افکار کو دلکش زبان میں دریافت کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ موضوع، لہجے اور زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی غزلیں دیگر شعرا سے مختلف نظر آتی ہیں۔ انہوں نے غزل کی مرکزی فکر کو ملی اور آفاقی مسائل سے جوڑا۔ ابتدا میں ان کی غزلوں میں شوخی و بے باکی کے ساتھ ساتھ عشق اور خودی کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ اقبال کے بعد غزل میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ انسان، خدا، کائنات، فطرت ان تمام کے تمام موضوعات پر قلم اٹھایا گیا۔ چاروں مجموعوں سے غزل کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، جس میں ان کے مختلف ادوار کے فکری و فنی ارتقاء کی عکاسی نظر آتی ہیں۔

گلزار ہست بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

(بانگ درا)

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

(بانگ درا)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوق اتنا
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

(بانگ درا)

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
گاہ مری نگاہ تیز، چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

(بال جبریل)

تو ابھی رہ گزر میں ہے، قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

(بال جبریل)

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

(ضرب کلیم)

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا

(ضرب کلیم)

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے

(ارمغان حجاز)

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

(ارمغان حجاز)

اس دور کی نظموں کی بات کی جائے تو داغ کے رنگ سے الگ ہوکر مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، سرسید اور ان کی تحریک کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں ان کے افکار و خیالات پر انگریزی کے رومانوی شاعروں کا کافی اثر دکھائی دیتا ہے۔ ''ایک پہاڑ اور گلہری''، ''ایک مکڑا اور مکھی''، ایک گائے اور بکری''، ''بچے کی دعا''، ''ماں کا خواب'' اور ''پرندے کی فریاد'' جیسی نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی بدولت اردو میں نظم نگاری کا جو ماحول پیدا ہوا تھا اس نے ان کے کلام میں جذبات نگاری، بلند تخیل اور جوش پیدا کیا۔ اس دور کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت مناظر فطرت کی عکاسی اور جذبہ حب الوطنی سے سرشاری ہے۔ مناظر فطرت کی مصوری کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد، وطنیت اور اصلاح معاشرہ کی عکاسی ملتی ہے۔ ہمالہ، ابر کوہسار، گل رنگیں، خفتگان خاک سے استفسار، آفتاب صبح اور اس کے علاوہ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانہ ہندی اس دور کی ایسی نظمیں ہیں جو ہندوستان سے اقبال کے گہرے لگاؤ کا پتہ دیتی ہیں۔

اس دور کے کلام کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کی تہہ میں اقبال کے فلسفہ خودی کے بعض اجزاء نظر آتے ہیں۔ خودی کے اجزا میں انسان کی فضیلت، اس کی مخفی روحانی قوت، عقل و عشق، معرکہ خیر و شر اور حیات جاودانی کی آرزومندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بیشتر صورتوں میں انہیں اس دور کی نظموں خصوصاً انسان اور بزم قدرت، عقل و دل، پرندہ اور جگنو اور کنار راوی وغیرہ میں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ابتدائی کلام میں استفسار و استفہام، سوز و ساز اور تعقل و تفکر کے ساتھ ذوق جمال کی آمیزش ملتی ہے۔ اسی فلسفیانہ جستجو اور قلب انسانی کی واردات کی بدولت وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ فطرت سے شاعر کا ربط اس معنی میں وسیع تر ہو گیا کہ فلسفہ خودی، تصور عشق و عقل تصور فلسفہ اجتہاد اور تصور مرد مومن نے ایک جہان معانی کی صورت اختیار کر لی جس کی مثال مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، ساقی نامہ اور دیگر نظموں اور غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مسجد قرطبہ کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد اپنے ایک مضمون اقبال کی شاعری مشمولہ ''اقبال بحیثیت شاعر'' مرتبہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی میں رقمطراز ہیں۔

> ''یہ نظم (مسجد قرطبہ) صرف اقبال ہی کا شاہکار نہیں بلکہ ساری اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ اردو شاعری میں اس نظم کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی ہماری شاعری دنیا کے صف اول کی شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتی تھی۔''

دوسرا دور:

علامہ اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے یہ دور سب سے اہم اور انقلابی ہے۔ یہ دور 1905ء سے 1908ء تک کے زمانے پر مشتمل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال نے یورپ کا سفر کیا۔ ان کے فکر و فن میں جو تبدیلی اس دور میں رونما ہوئی وہ پھر آگے ترقی کرتی چلی گئی۔ لندن کے تین سالہ قیام کے دوران فلسفہ الٰہیات اسلامیہ، ایرانی تصوف کے گہرے مطالعے اور مغرب کی مادہ پرستانہ زندگی سے بیزاری نے انہیں یہ احساس دلایا کہ ایک طرف لادینیت اور روحانیت سے خالی معاشرہ نسل آدمی کے لیے مہلک خطرہ ہے تو دوسری طرف شاعری کی عجمی لے عصر حاضر کے مسائل کے حل میں مدد کرنے کے بجائے رہبانیت اور بے جا توکل کا درس دیتی ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں پیمبری کے آثار پیدا ہو گئے۔ طلبہ علی گڑھ کالج کے نام ''پیام عشق''، عبدالقادر کے نام جیسی نظمیں قیام یورپ کے دوران ہی لکھی گئی ہیں۔ چند اشعار اس دور کے ملاحظہ کیجئے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام (بانگ درا)

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دے

عبدالقادر کے نام (بانگ درا)

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرکم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

(غزل)

اس دور کی باقی نظموں کی اگر بات کی جائے تو اقبال حسن و عشق کے مطالعے میں محو نظر آتے ہیں۔ حسن، حقیقت حسن اور محبت ان کے یہاں

جگہ جگہ زیر بحث آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال نے زندگی اور فن کے بارے میں فلسفیانہ انداز سے غور وفکر شروع کیا اور حسن کا تصور جو مشرق کی شاعری کا موضوع خاص تھا اور جسے خود اقبال نے اپنی ابتدائی شاعری میں اپنایا تھا ان کی نظروں میں مشکوک اور بے معنیٰ ہونے لگا۔ اقبال کے تصورات میں کس نوع کی تبدیلیاں ہو رہی تھیں یا پھر وہ اپنے پرانے تصور حسن پر کس طرح تنقید کرتے ہیں، اس کا اندازہ حقیقت حسن، جلوہ حسن، حسن وعشق جیسی نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

(حقیقت حسن)

حسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

(حسن وعشق)

جلوہ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوش تخیل میں شباب

(جلوہ حسن)

تیسرا دور:

جیسا کہ کہا گیا کہ قیام یورپ کے دوران ان کے خیالات میں بڑا انقلاب آیا۔ مغرب کا جدید تمدن ان کی نظر میں بنی نوع انسان کے لیے مہلک ٹھہرا۔ وطنیت وقومیت کے نعرے کھوکھلے اور تنگ نظری وخودغرضی پر مبنی قرار پائے۔ یورپ کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی بے روح اور صداقت سے خالی نظر آئی۔ مشرق ومغرب کا باہمی تعلق، قوموں کا عروج وزوال، ملکوں کے معاشرتی وسیاسی اور اقتصادی ادارے سب شدت کے ساتھ ان کی غور وفکر کا حصے بنے، جس کی عکاسی شکوہ، جواب شکوہ، خطاب بہ جوانان اسلام، شعاع آفتاب، نوید صبح، خضر راہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی نظموں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی ان نظموں میں فکری بلندیوں، خوبیوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ ساتھ فن کے عمدہ ترین نمونے بھی ملتے ہیں۔ تشبیہات واستعارات کا پورا نظام چلتا پھرتا اور ہر دم گردش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ رمز وایما کے لطیف پیکر اور علامتوں کا التزام اقبال نے جس دلچسپی کے ساتھ نظموں میں کیا ہے اس کا اعتراف اردو کے بڑے نقادوں اور دانشوروں نے کیا ہے۔ انہوں نے قدیم اسلوب اور روایتی نظم نگاری سے انحراف کر کے اردو کو ایک نیا رخ دیا اور اس میں انسانی زندگی کے مسائل کو جگہ دے کر اسے پورے سماج کے لیے بامعنی اور موثر بنا دیا۔

مشرق کے قدیم وجدید فلسفیانہ تصورات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مشرق میں جمال کا وجود تو ہے لیکن جلال کا فقدان ہے۔اسی طرح مغرب میں مادہ کو زیادہ اہمیت دینے کے باعث جلال کا پہلو مرکزی اہمیت اختیار کر گیا اور جمال کی کمی رہ گئی۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا
ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

علامہ اقبال مشرق کے اندر جلال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مشرق میں تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا ہو۔انہیں محسوس ہوا کہ مشرق میں سکون واطمینان سے زیادہ ہیجان اور جذباتی تحرک کی ضرورت ہے جو اسے مقاصد کے حصول پر آمادہ کر سکے۔یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کے کلام میں استعمال ہونے والے علامات اور استعارے،تشبیہات اور کنائے اقبال کی فکر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔کلام اقبال پر آپ ذرا غور کریں کہ ان کے خطیبانہ انداز میں فعلیت (verbalization) کا عنصر زیادہ ہے۔مثلاً روشن چراغ پیدا کر، اپنا مقام پیدا کر، قلب ونظر شکار کر، جاوداں ہو جا، کھول آنکھ فلک دیکھ فضا دیکھ، قید ومقام سے گزر۔غرض ان کے کلام میں زیادہ تر امر کا صیغہ ہی استعمال ہوا ہے۔دراصل اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مشرق میں رائج ان تصورات نے مسلمانوں کو سعی وعمل سے بے نیاز کر کے انہیں گوشہ نشینی اور بے جا توکل میں گزر بسر کرنے پر رضامند کر رکھا تھا۔ سیاست، معاش اور تعلیم کے دروازے انہوں نے اپنے اوپر بند کر لیے تھے اور فرسودہ خیالات وتوہمات نے ان کے ذہنوں کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ نئی چیز کو خواہ وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو زندگی کے لیے مہلک خیال کرتے تھے تو ایسے میں ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فعل امر ہی کا صیغہ اور خطیبانہ انداز ہی اختیار کرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال کو جب اس بات کا احساس ہوا کہ قنوطیت، یاسیت، بے ثباتی کا تصور، فارسی کے زیر اثر اردو شاعری میں نمایاں ہے۔عجمی شعرا کی طرح اردو کے بیشتر شعرا کے یہاں زندگی سے بیزاری لٹ جانے اور کھو جانے کا یہی جذبہ ملتا ہے۔ان کے فن میں زندگی کی وہ حرارت وتابنا کی نہیں ہے جو مردہ قوموں میں زندگی کی تازہ روح پھونک سکے،لہٰذا انہوں نے ایسے شعر وشاعر کو ہدف تنقید بنایا۔

ہے شعر عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستان
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
شعر عجم (ضرب کلیم)

ضرب کلیم میں ''شاعر'' ادبیات،فنون لطیفہ، ہنروران ہند اور دیگر بہت سی نظموں میں فن کے بارے میں بڑے والہانہ انداز میں کہتے ہیں کہ فن وہ ہے جو دلوں میں مستقل تلاطم اور ابدی زندگی کا سوز وساز پیدا کرے۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر یا مغنی کا نفس خود کا داعی ومحافظ ہو، جو وقت کے فراعنہ کے لیے ضرب کلیم کی حیثیت رکھتا ہو، چناں چہ فرماتے ہیں:

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(فنون لطیفہ)

پوری اردو شاعری میں محبوب حقیقی اور مجازی کے درمیان ایک دوری اور پردہ داری پائی جاتی تھی۔لیکن اقبال کی شاعری میں عورت کے بجائے مرد کامل کا جلال و جمال خدا کے جلال و جمال کے زیر سایہ ہے۔خدا اور بندے کے درمیان عشق کا واسطہ ہے۔ان کے نزدیک خدا خالق و مالک ہے تو انسان بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنی مختاری کا دعویدار ہے۔اقبال کی شاعری متحرک حسیاتی پیکروں کا گلدستہ ہے۔اخلاقی عناصر میں سیاسی بصیرت کارفرما ہے تو دینی شعور میں جدید بین الاقوامی تقاضوں کی وضاحت موجود ہے۔ان موضوعات پر بھی اقبال کی شاعری میں فنی عناصر موجود ہیں۔

اقبال کے یہاں وہ الفاظ و تراکیب،استعارات و علامات اور تلمیحات جو ان کے ابتدائی کلام میں موجود تھے۔اس دور میں ذہنی و فنی ارتقاء کے ساتھ یہ زیادہ فنی گہرائی اور وسیع تر معنیٰ میں استعمال ہونے لگے۔اقبال کی شاعری میں بعض کلیدی الفاظ گل،شمع،خون،تجلی،لالہ،نرگس،شاہین،خودی ،شعلہ،عشق،دل،عقل اور خورشید وغیرہ ملتے ہیں، جو انہیں مرغوب ہیں اور ان کا استعمال کلام اقبال میں متعدد جگہوں پر ملتا ہے۔گل لالہ میں اقبال کو عاشق کی ذات نظر آتی ہے۔سرخ رنگ کامیابی،عزت،شاہی و جلال کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے ،کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

تصویر درد(بانگ درا)

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں ،وہی تبریز ہے ساقی

غزل(بال جبریل)

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

غزل(بال جبریل)

لفظ خودی روایتی شاعری سے ہٹ کر اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کی جستجو،خوب سے خوب تر کی تلاش، نئے نئے مقاصد کی تخلیق،منزلوں کی تلاش اور اس کے حصول کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔خودی کی معنویت میں حسن بھی پیدا کر دیا گیا۔

خودی کیا ہے ؟ راز درون حیات
خودی کیا ہے ؟ بیداریٔ کائنات

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

کلام اقبال کے علامتی استعارے اور کرداروں کے حوالے سے جب ہم غور وفکر کرتے ہیں تو اس میں بھی وہی جلال وقوت دکھائی دیتی ہے۔ چوں کہ اس دور میں اقبال متحرک، فعال اور بامعنی زندگی کو ترجیح دینے لگے۔ اس لیے ابلیس، شاہین، مرد مومن، کلیم، خضر، عشق، خودی، شمشیر کے علاوہ دیگر کردار و علامات ان کے پسندیدہ کردار بنتے ہیں جیسے شاہین کی صحرا نوردی آشیانے کی تعمیر سے بے نیازی، تیزی اور بلند پروازی، دوسرے کے مارے ہوئے شکار سے پرہیز، اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا ولولہ، آسمان کی وسعتوں میں اس کی اڑان۔ اقبال اس طرح کی زندگی کے نصب العین کے ترجمان بن گئے۔ آزادی اور قوت وشوکت وغیرہ ایسی صفات ہیں جو متحرک فعال اور بامعنی زندگی کی بہترین علامت ہیں اسی لیے اقبال نے ان پر زور دیا ہے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کلام اقبال میں تلمیحات پر غور وفکر کریں تو یہاں پر بھی ان کا استعمال روایت سے ہٹ کر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں گل وبلبل، پرویز وکوہکن، تیشہ فرہاد، خسرو پرویز خضر، مجنوں، تجلی کلیم اور آتش نمرود جیسی تلمیحات میں ہوا وہوس کی ترجمانی کے بجائے ملت سازی، انسان سازی، زندگی کی حرارت، اہل اقتدار کی مکاری وفریب، عشق، حیات جاودانی اور خودی سے ہمکنار ہونے کی عکاسی نظر آتی ہے۔ چند اشعار سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

تیشے کی کوئی گردش تقدیر تو دیکھے
سیراب ہے پرویز جگر تشنہ ہے فرہاد

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اقبال کی شاعری میں عشق کے معنی ہی بدل گئے۔اب ان کے عشق میں بدر وحنین،صدق خلیل، بلال حبشی اور صبر حسین کے بلند و بالا جذبات ابھرنے لگے۔

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق ،صبر حسینؑ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے اردو شاعری میں علامات واستعارات اور تلمیحات وغیرہ یا اس کے علاوہ استعمال ہونے والی صنعتیں اپنی نوعیت میں سکونی تصورات سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں لیکن علامہ اقبال نے نہ صرف علامات واستعارات کو متحرک صورت دی بلکہ اپنے الفاظ کے آہنگ سے بھی حرکت وتغیر کا احساس ابھارا ہے۔مختلف صنعتیں اقبال کے کلام میں خاص مفہوم میں استعمال ہونے لگیں اور اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنیں، جو ان کی شاعری کا بنیادی وصف اور جوہر ہے۔اقبال کے کلام میں لب ولہجے ،الفاظ وتراکیب اور علامتوں میں جدت وندرت کے علاوہ واقعیت اور رومان کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔ان کا اسلوب کلاسیکی ہے اور ان کا فن رنگوں اور روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ایک خوبصورت نگر ہے۔

غرض اس طویل دور کی شاعری میں خواہ اس کا تعلق فارسی سے ہو یا اردو سے اقبال کے فکر وفن کے سارے عوامل واوصاف پوری طرح نکھر کر سامنے آتے ہیں۔اقبال کی فارسی شاعری کے اہم مجموعے اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق ونیز اردو شعری مجموعے بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز اسی دور میں منظر عام پر آئے، جن میں اقبال کے فکر وفن کے مختلف زاویے پوری طرح روشن ہوئے ہیں۔

4.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں۔

☆ علامہ اقبال کا اردو اور فارسی زبان ہی نہیں بلکہ دنیا کی کئی ترقی یافتہ زبانوں میں ممتاز اور اہم مقام ہے۔

☆ اقبال ابتدا ہی سے فنون لطیفہ کو محض دل بہلانے کا مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کی تعمیر وتزئین کا موثر اور معتبر وسیلہ سمجھتے تھے۔

☆ اقبال کے نزدیک کوئی بھی فن کار زندگی کو تب تک فراوانی اور فروغ بخشنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے فن سے بصیرت و بصارت کے ساتھ شادمانی میں اضافہ نہ ہو۔

☆ اقبال نے پہلے دور کے کلام میں ہلکی پھلکی غزلیں کہی ہیں۔ان کے ابتدائی کلام پر مرزا ارشد اور بعد میں داغ دہلوی کا رنگ نمایاں ہے اس دور کی نظموں میں ان کے افکار خیالات پر مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، سرسید اور ان کی تحریک کے اثرات کے علاوہ انگریزی

کے رومانی شاعروں کا کا کافی اثر دکھائی دیتا ہے۔

☆ دوسرا دورا قبال کے فکر وفن کے حوالے سے اہم اور انقلابی ہے۔ یہ دور 1905 سے 1908 پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال نے یورپ کا سفر کیا۔ اسی دور میں اقبال نے زندگی اور فن کے بارے میں فلسفیانہ انداز سے غور وفکر کیا۔

☆ تیسرے دور میں قیام یورپ کے بعد ان کے خیالات میں بڑا انقلاب آیا۔ مغرب کا جدید تمدن ان کی نظر میں بنی نوع انسان کے لیے مہلک ٹھہرا اور مشرق ومغرب کا باہمی تعلق، قوموں کا عروج وزوال، ملکوں کے معاشرتی وسیاسی اور اقتصادی ادارے سب شدت کے ساتھ ان کے غور وفکر کا حصے بنے۔ جس کی عکاسی شکوہ، جواب شکوہ، خطاب بہ جوانان اسلام، شعاع آفتاب، نوید صبح، خضر راہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی نظموں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

☆ علامہ اقبال کی شاعری میں استعمال ہونے والی علامات، استعارات، تشبیہات اور تلمیحات ان کی فکر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

4.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
تغزل	:	عشقیہ شاعری، متاثر کرنے والی چیز
مفکر	:	سوچنے والا، فکر کرنے والا
خودی	:	اپنی ذات کو پہچاننا۔ شعور ذات
ادراک	:	حقائق کو جاننے کی ذہنی صلاحیت، عقل، فہم، شعور
نقوش	:	نقش کی جمع، نشانات، علامات
خس وخاشاک	:	گھاس پھوس، تنکے
ارتسام	:	عکس، نقش ونگار، پرتو
آدم گری	:	انسانیت، شرافت آدمیت
افلاک	:	فلک کی جمع، آسمان
گردنواح	:	آس پاس کا علاقہ
ادبا	:	ادیب کی جمع، علم وادب ولغت کا عالم
حیات جاودانی	:	ہمیشہ کی زندگی، حیات ابدی
استفسار واستفہام	:	دریافت کرنا، پوچھ گچھ کرنا

4.6 نمونۂ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کی ابتدائی غزلوں میں کن شعرا کے اثرات پائے جاتے ہیں؟

2۔ علامہ اقبال کی شاعری کتنے ادوار پر مشتمل ہیں؟

3۔ علامہ اقبال کے پہلے دور پر مشتمل چند نظموں کے نام بتائے۔

4۔ خضر راہ، شکوہ، جواب شکوہ، طلوع اسلام، شمع و شاعر جیسی نظمیں اقبال کے کس شعری مجموعہ میں شامل ہیں؟

5۔ علامہ اقبال کا کون سا مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا؟

6۔ مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ جیسی شاہکار نظمیں اقبال کے کس دور کی یادگار ہیں؟

7۔ اقبال کا فارسی شعری مجموعہ ''پیام مشرق کب شائع ہوا؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ کس مشہور مغربی شاعر کے جواب میں لکھا گیا؟

8۔ اقبال کا فارسی شعری مجموعہ ''جاوید نامہ'' کب شائع ہوا اور یہ کس مغربی شاعر کی کتاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا؟

9۔ اقبال نے ابتدا میں کن اساتذہ سے شاعری میں اصلاح لی؟

10۔ اقبال کے کس دور کی شاعری میں فکری انقلاب نظر آتا ہے؟

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے نظریہ فن کی وضاحت کیجیے۔

2۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی فکر میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی؟ وضاحت کیجیے۔

3۔ علامہ اقبال کی دوسرے دور کی شاعری کا احاطہ کیجیے۔

4۔ علامہ اقبال کی تیسرے دور کی شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ علامہ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری کا موضوعاتی حوالے سے احاطہ کیجیے۔

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال نے اپنے فلسفے کے اظہار اور توضیح کے لیے کن شاعرانہ وسائل کی مدد لی ہے، وضاحت کیجیے۔

2۔ علامہ اقبال کے فکری و فنی ارتقاء پر ایک مفصل نوٹ لکھیے۔

3۔ علامہ اقبال نے زندگی اور فن کے بارے میں کیا فلسفیانہ تصورات پیش کیے ہیں؟ بیان کیجیے۔

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال
2۔ شعر اقبال	سید عابد علی عابد
3۔ اقبال کا فن	شمس الرحمٰن فاروقی
4۔ اقبال شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم
5۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا	پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
6۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا	عبدالمغنی

بلاک II: اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی 5: نظم ''خضر راہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

5.0		تمہید
5.1		مقاصد
5.2		نظم ''خضر راہ''
	5.2.1	نظم کا پس منظر
	5.2.2	''خضر راہ'' کا تجزیاتی مطالعہ
5.3		اکتسابی نتائج
5.4		کلیدی الفاظ
5.5		نمونہ امتحانی سوالات
	5.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	5.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	5.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
5.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

اقبال کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ وہ بہترین شاعر ہونے کے ساتھ عظیم مفکر اور فلسفی بھی تھے جس کا اظہار ان کی شاعری اور نثر دونوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اقبال نے اردو شاعری کو مربوط فلسفے اور فکری عناصر کے ذریعے بے پناہ گہرائی اور معنویت بخشی ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو شاہکار نظمیں عطا کی ہیں جو فکری اور فنی اعتبار سے دنیائے ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ انہوں نے 'خضر راہ'، 'مسجد قرطبہ'، 'طلوع اسلام'، 'ذوق وشوق''، ''ساقی نامہ'' اور دیگر بہت سی بہترین نظمیں تخلیق کر کے اردو شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ زیر مطالعہ نظم کا موضوع ''خضر راہ'' ہے۔ ''خضر راہ'' اقبال کی ایک طویل اور فلسفیانہ نظم ہے۔ اقبال کی یہ نظم اپنے موضوع، اسلوب، انداز بیان، اپنی فکری اور فنی خصوصیات اور تاثر کے

لحاظ سے غیر معمولی اور منفرد نظم ہے۔ اقبال نے اس نظم میں زندگی کی حقیقت، حرکت وعمل، مسلمانوں کے زوال کے اسباب، مغرب کے کھوکھلے پن، سرمایہ داری کے جبر، مزدور کے اوپر ہونے والے مظالم اور سلطنت وحکومت کے بارے میں فلسفیانہ اور حکیمانہ گفتگو کی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں حضرت خضر کا علامتی کردار تخلیق کیا ہے جن سے اقبال اس نظم میں چند سوالات پوچھتے ہیں اور پھر خضر کی زبانی اقبال ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نظم میں ڈرامائیت ہے۔

اس اکائی میں آپ اردو زبان کے عظیم شاعر اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کا مطالعہ کریں گے۔ ان کی شاعرانہ انفرادیت، ان کی فنی اور فکری خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔ ان کی نظم 'خضر راہ' کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا جائے گا، جس سے ان کی معروف نظم ''خضر راہ'' کی مکمل توضیح و تفہیم ممکن ہو سکے گی۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ اقبال کی فنی اور فکری انفرادیت کو سمجھ سکیں۔
- ☆ اقبال کی شعری خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔
- ☆ اقبال کی نظم نگاری سے آگاہ ہو سکیں۔
- ☆ نظم 'خضر راہ' کا تجزیہ کر سکیں۔
- ☆ اقبال کی شاعری کی توضیح وتفہیم بیان کر سکیں۔

5.2 نظم ''خضر راہ''

خضر راہ

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

کشتیٔ مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤنوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جواب خضر

(صحرانوردی)

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

(زندگی)

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہوصداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسماں مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے
خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

(سلطنت)

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بے دار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری
خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری
سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری
از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

(سرمایہ ومحنت)

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامان عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

لے رہا ہے مے فروشان فرنگستاں سے پارس
وہ مے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے مبر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی — اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج — موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے — اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود — مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں — آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس — سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لایخلف المیعاد دار

5.2.1 نظم کا پس منظر:

بیسویں صدی اپنے دامن میں کئی ایسے عظیم انقلاب لے کر نمودار ہوئی تھی جنہوں نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ پہلی جنگ عظیم نے انسانی تباہی اور بربادی کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی تھی۔ عالم اسلام کے لیے یہ بہت نازک دور تھا۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ ہی امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ مغربی قوتیں عالم اسلام کے خلاف سازشیں کر کے ان کے درمیان اختلاف کے بیج بو رہی تھیں۔ بیشتر مشرقی ممالک یورپی ملکوں کے غلام تھے۔ مغربی طاقتیں دنیا کے سامنے جمہوری نظام کی آڑ میں استعماریت اور ملوکیت کی تشکیل نو میں مصروف تھیں۔ مادہ پرستی نے طبقاتی کشمکش کو انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ سرمایہ داری نے غریبوں اور مزدوروں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ تاہم ان حالات میں انقلاب اور بغاوت کی صدائیں بھی بلند ہونے لگی تھیں۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کا دور چل رہا تھا، ہندوستان کی تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی، غلام قومیں آزادی کے لیے سخت جدوجہد کر رہی تھیں، کسان، مزدور، اور دبے کچلے لوگ بغاوت پر آمادہ تھے اور سرمایہ داری کے خلاف متحد ہو رہے تھے۔ آزادی کے لیے دنیا بھر میں جدوجہد روز بروز زور پکڑ رہی تھی اور غلام قومیں جبری حاکموں کو آنکھیں دکھا رہی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم، انقلاب روس، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، یہ ایسے غیر معمولی واقعات تھے جن کے اثرات پوری دنیا پر قائم ہوئے اور ایک نئے سیاسی اور سماجی عہد کا آغاز ہوا۔ انقلاب روس نے ایشیائی قوموں میں آزادی کا ایک نیا شعور پیدا کیا اور ایشیا میں نئے انقلاب کو جنم دیا۔ محکوم ممالک اور غلام قومیں غلامی کی نیند سے بیدار ہونے لگی تھیں۔ اقبال انقلاب روس کے زیر اثر اپنی شاعری میں مزدوروں کی واضح حمایت کا اعلان اور ان کو آمادۂ

انقلاب کر چکے تھے۔اقبال نے اپنی شاعری میں ظلم و جبر، مادی وسائل کی غیر مساوی تقسیم، محنت کش طبقے کے استحصال، سرمایہ دارانہ نظام اور فاشزم کی بھرپور مخالفت کی۔ 1917 کے انقلاب روس کے بعد اقبال نے مذکورہ مسائل کو خاص طور پر موضوع بنایا۔ اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی سخت مخالفت اور مزدوروں کی حمایت کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے۔''خضر راہ'' کے علاوہ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز میں مادہ پرستی کے خلاف کئی نظمیں ملتی ہیں۔اس نظم (خضر راہ) میں اقبال نے''سلطنت'' اور''سرمایہ و دولت'' کے نام سے باقاعدہ ذیلی عنوان قائم کیے ہیں۔

اقبال کی یہ نظم بیسویں صدی میں رونما ہونے والے اس عظیم انقلاب کی صدائے بازگشت ہے۔اس دور کی مجموعی صورت حال اقبال کی اس نظم کا محرک ہے۔اقبال خضر کے ذریعے جو دانائے راز ہیں، عالم اسلام اور دیگر پسماندہ طبقوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے لیے ایک لائحۂ عمل پیش کرتے ہیں۔اقبال نے اس نظم میں زندگی کا اجتماعی شعور اور اس کا مابعد الطبعیاتی تصور پیش کیا ہے۔یہ نظم اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے 37 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ 12 اپریل 1922 میں ترنم میں پڑھ کر سنائی تھی۔نظم کے اشعار پڑھتے ہوئے اقبال پر رقت طاری تھی اور سامعین بھی زار و قطار رو رہے تھے۔اس نظم میں اقبال ایک شاعر، ایک مفکر، ایک فلسفی اور ایک انقلابی کے طور پر نظر آتے ہیں۔اس نظم میں اقبال کی انقلابی فکر بہت واضح طور پر ظاہر ہوئی ہے لیکن لہجہ دھیما اور بہت سنجیدہ ہے۔

5.2.2 خضر راہ کا تجزیاتی مطالعہ:

اقبال کی نظم''خضر راہ'' ان کے شعری مجموعے''بانگ درا'' میں شامل ہے۔ہئیت کے اعتبار سے یہ نظم ترکیب بند ہے۔ترکیب بند کے آخری شعر میں شاعر قافیہ بدل کر نئے بند کا آغاز کرتا ہے۔نظم میں 11 بند ہیں۔پہلے دو''شاعر'' کے عنوان کے تحت ہیں اور''جواب خضر'' کے عنوان کے تحت نو بند قلم بند کیے گئے ہیں اور اس میں پانچ ذیلی عناوین ہیں۔عام طور پر اس نظم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک حصہ پس منظر، خضر کی آمد اور شاعر کے سوالات پر مبنی ہے جب کہ دوسرا حصہ خضر کے جوابات پر مشتمل ہے۔

نظم''خضر راہ'' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اقبال شدید بے چینی اور اضطراب کے عالم میں دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں۔دریا اقبال کی نظموں میں ایک اہم کردار کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔دریا جو وقت کی علامت ہے، تاریخ کی علامت ہے، تسلسل اور حرکت و عمل کی علامت ہے، اضطراب اور انقلاب کی علامت ہے، گہرائی کی علامت ہے، اسرار و موز کی علامت ہے۔دریا کی موجوں پر سکوت طاری ہے اور شاعر کی فکر طلاطم خیز اور مضطرب ہے۔دریا کا سکوت دراصل مسلمانوں کے فکری اور عملی جمود کی علامت ہے۔مسلمانوں کے اس فکری جمود نے اقبال کو سخت بے چین کر دیا ہے۔نظم میں دو پہلو ہیں۔ایک پہلو میں اقبال مضطرب نظر آتے ہیں اور سوال اٹھاتے ہیں۔دوسرے پہلو میں اقبال ایک فلسفی اور مفکر کے طور پر ایک علامتی پیکر خضر کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔حضرت خضر دانائے راز ہیں ہر عہد سے واقف ہیں اور بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہیں۔اقبال خضر سے پانچ سوال کرتے ہیں۔سوالوں کے جوابات کے اعتبار سے اقبال نے پانچ ذیلی عنوانات کے تحت نو بند نظم کیے ہیں۔صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایۂ و محنت اور دنیائے اسلام۔

اولین دو بند شاعر کی اضطرابی کیفیت، بے چینی اور اس کے محو جستجو ہونے، دریا کنارے رات کی پراسرار فضا میں خضر کے نمودار ہونے اور ان سے سوال پوچھنے سے متعلق ہیں۔نظم کے آغاز میں شدید اضطراب اور ذہنی کشمکش کے عالم میں ساحل دریا پر اقبال دریا کی خاموش موجوں کے بر عکس اپنے دل میں ایک جہان اضطراب چھپائے بیٹھے ہیں۔رات کا وقت، ہر طرف گہرا سکوت طاری ہے، ہوا انتہائی خوشگوار ہے۔دریا بھی نرم روی

سے بہہ رہا ہے اور دریا کا نظارہ کرتے ہوئے حیرانی ہو رہی ہے کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب ہے۔ سکوت دریا کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ سو رہا ہو یا پانی کی مضطرب موج تھک ہار کر محو خواب ہو گئی ہو، جیسے:

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار　　موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

اس عالم میں پرندے اپنے آشیانوں میں رات کے سحر میں گرفتار ہو کر سو گئے تھے اور ٹمٹماتے ستارے چاند کے طلسم میں گرفتار تھے۔ اقبال نے دلکش تشبیہات استعمال کی ہیں اور خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ اس کشمکش اور الجھن کے عالم میں اور اس پر سرار فضا میں خضر نمودار ہوتے ہیں۔ اقبال خضر کو دیکھ کر اس طرح ردعمل ظاہر کرتے ہیں:

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر　　جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

اقبال کہتے ہیں کہ اس پر اسرار منظر اور بے چینی کے عالم میں جہاں بھر کی سیر کرنے والے خضر ظاہر ہوئے جن کی پیری میں بھی رنگ شباب موجود ہے۔ خضر شاعر کو مضطرب اور بے چین دیکھ کر کہتے ہیں کہ اے جویائے اسرار ازل (ازل کے رازوں کی جستجو کرنے والے) دل کی آنکھیں روشن ہوں تو کائنات کے سربستہ راز عیاں ہو جاتے ہیں۔ دل کی آنکھیں کھلی ہوں تو انسان مظاہر کائنات کے پیچھے مضمر حقیقت کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ کائنات کی تقدیر اسے بے حجاب نظر آنے لگتی ہے یعنی کوئی پردہ درمیان میں حائل نہیں رہ جاتا اور اس پر تمام اسرار کھل جاتے ہیں۔ پہلے بند کے آخری شعر میں خضر کہتے ہیں کہ زندگی کا جام یعنی حیات انسانی مسلسل گردش یا مسلسل جدو جہد سے پختہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی کا راز جہد مسلسل ہے:

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی　　ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

دوسرے بند میں اقبال خضر کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ باطن کا علم رکھتے ہیں، آپ پر تو کائنات کے تمام راز منکشف ہیں اور مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات بھی آپ پر واضح ہیں۔ کشتی مسکین، دیوار یتیم اور جان پاک کے ذیعے اقبال نے موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر سے وابستہ چند واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ کہف میں موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کے ان واقعات کا بیان ہوا ہے اور احادیث میں بھی ان کی تفصیل ملتی ہے۔ ان واقعات کا تعلق اس دور سے ہے جب قوم بنی اسرائیل فرعون کے ظلم کا شکار تھی۔ اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو وحی ہوئی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں وہاں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم و حکمت رکھنے والا ہے۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ اے پروردگار! تیرے اس بندے تک رسائی کی کیا راہ ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ مچھلی کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو، جس جگہ یہ مچھلی گم ہو جائے اسی جگہ وہ شخص ملے گا۔ حضرت موسیٰ نے مچھلی کو توشہ دان میں رکھا اور اور اپنے خادم یوشع بن نون کے ہمراہ اس مرد صالح کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ بالآخر جب حضرت موسیٰ نے جناب خضر کو تلاش کر لیا تو ان سے کہا کہ میں آپ سے علم حاصل کرنے آیا ہوں اور ساتھ رکھنے کی گزارش کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا کہ تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔ حضرت موسی نے کہا کہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ حضرت خضر نے منظور کر لیا اور دونوں ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ ملاح حضرت خضر سے واقف تھا اس لیے اس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ کشتی روانہ ہو گئی۔ کچھ مسافت طے کرنے کے بعد حضرت خضر نے کشتی کا ایک تختہ توڑ کر اس میں شگاف ڈال دیا۔ حضرت موسیٰ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے سوال کر لیا کہ ان لوگوں نے آپ سے کرایہ نہیں لیا اور آپ نے اس احسان کے بدلے ان کی کشتی میں سوراخ کر دیا۔ حضرت خضر نے انہیں وہ عہد یاد دلایا اور کہا کہ

میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ صبر نہیں کر سکیں گے۔ سمندر پار کر کے دوسری طرف پہنچے۔ سمندر کے کنارے چلتے ہوئے ایک میدان میں چند بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ حضرت خضر نے ان میں سے ایک بچے کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ کو بہت ناگوار گزرا اور ان سے صبر نہ ہوا اس لیے انہوں نے پھر سوال کر دیا۔ حضرت خضر نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا حضرت موسیٰ نے عذر کیا اور پھر دونوں روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے جہاں کے لوگ خوش حال اور غنی تھے مگر ان مسافروں کے درخواست کرنے کے باوجود ان کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اس بستی سے گزرتے ہوئے ایک مکان نظر آیا جس کی دیوار جھکی ہوئی تھی۔ حضرت خضر نے اس دیوار کو سیدھا اور درست کر دیا۔ اس پر بھی حضرت موسیٰ کو حیرت ہوئی اور کہا کہ بستی والوں نے ہمارے ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا اور آپ نے ان کی دیوار بغیر کسی اجرت کے درست کر دی۔ حضرت خضر نے کہا کہ اب ہماری جدائی کا وقت آ گیا ہے اور پھر انہوں نے ان تینوں واقعات کی حقیقت بتائی۔ کشتی کے ملاح مسکین تھے، وہ جس طرف جا رہے تھے وہاں ایک بادشاہ ہے جو اچھی کشتیوں کو چھین لیتا ہے اس لیے میں نے اس میں عیب پیدا کر دیا۔ رہا لڑکے کا معاملہ تو اس کے والدین مومن ہیں میں یہ سوچ کر ڈرا کہ یہ کفر اور سرکشی کر کے اپنے والدین کو اذیت پہنچائے گا اس لیے میں نے چاہا کہ اللہ انہیں دینداری میں بھی اور محبت میں بھی اس سے بہتر لڑکا عطا فرمائے گا۔ اور جو دیوار درست کی وہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ ان کا باپ ایک نیک شخص تھا۔ تمہارے پروردگار نے چاہا کہ دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا لیں۔ میں نے جو بھی کیا وہ اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ اللہ کے حکم سے کیا لیکن تم اس پر صبر نہیں کر سکے۔

یہ وہ واقعات ہیں جن کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اقبال حضرت خضر سے حضرت موسیٰ کے علم کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ تو باطن کا علم رکھتے ہیں، تمام اسرار و رموز سے واقف ہیں۔ آپ کے علم کے آگے حضرت موسیٰ کا علم بھی ہیچ ہے۔ اس کے بعد اقبال خضر سے پانچ سوال کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا سوال۔ آپ کو صحرا نوردی اس قدر عزیز کیوں ہے؟

دوسرا سوال۔ زندگی کا راز کیا ہے؟

تیسرا سوال۔ سلطنت کیا چیز ہے؟

چوتھا سوال۔ سرمایہ و محنت میں جھگڑے کی وجہ کیا ہے؟

پانچواں سوال؟ دنیائے اسلام کی زبوں حالی کی وجہ کیا ہے؟

پہلا سوال کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اے خضر آبادی چھوڑ کر آپ ریگستانوں میں کیوں گھومتے پھرتے ہیں اور آپ کی زندگی وقت کی قید سے آزاد ہے۔ اس کے بعد دیگر سوال پوچھتے ہیں:

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد — زندگی تیری ہے بے روز شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

بادشاہت و ملوکیت کو اقبال سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ابھی بھی ملوکیت ختم نہیں ہوئی۔ ابھی وہی نظام بادشاہی چل رہا ہے اور انسان غلام بنے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ سکندر آج زندہ نہیں ہے لیکن فطرت اسکندری یعنی وہی نظام ملوکیت اب بھی قائم ہے۔ حکمراں طبقہ داد عیش دے رہا ہے اور محنت کش کو غلام بنائے ہوئے ہے:

گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش

اقبال مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور دشمنی سے سخت نالاں اور پریشان نظر آتے ہیں۔ اقبال نے عربوں کی عثمانیوں سے غداری کو بھی موضوع بنایا ہے جو مسلمانوں کی سیاسی قوت کا شیرازہ بکھرنے کا اہم سبب بنی۔ اقبال نے اس غداری اور مغرب کی غلامی کو دین فروشی کے مترادف قرار دیا ہے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اقبال ملت اسلامیہ کی باہمی نااتفاقی، عربوں کی خلافت عثمانیہ کے ساتھ غداری، مغربی قوتوں کے ساتھ ان کے اتحاد اور ترکوں کے زوال آمادہ ہونے اور ان کے ساتھ ملت اسلامیہ کی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے خضر سے پانچواں سوال کرتے ہیں۔ اسلام کے دشمن مسلمانوں کی قوت برداشت کو آزمارہے ہیں دوسری طرف طاغوتی قوتیں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپئے ہیں:

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تیسرے بند سے خضر کا جواب شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے خضر اپنی صحرانوردی کے بارے میں بتاتے ہیں اور شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے میری صحرانوردی پر اس قدر تعجب کیوں ہے۔ میری یہ مسلسل جدوجہد اور بھاگ دوڑ زندگی کی دلیل ہے۔ اے گھر کے عیش و آرام میں قید رہنے والے شاعر تو نے وہ منظر نہیں دیکھا جب صحرا میں رواں دواں قافلوں کے اونٹوں کی گھنٹیاں عالم سکوت میں نغمہ سنج ہوتی ہیں اور ریت کے ٹیلے پر ہرن بے نیازی اور بے خوفی سے اپنی چال چل رہا ہوتا ہے اور قافلے بغیر سامان اور بغیر سنگ میل اور رہنمائی کے سفر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت جب سیمابی فطرت کے حامل ستارے طلوع ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان کی بلندی سے حضرت جبریل کی پیشانی نمودار ہورہی ہو۔ صحرا میں غروب آفتاب کے منظر کو پیش کرتے ہوئے خضر شاعر سے کہتے ہیں کہ کیا تو نے سکوت صحرا میں سورج غروب ہونے کے منظر کو نہیں دیکھا جس کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کی وسعت نظر میں اضافہ ہوا۔ اس میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب انہوں نے چاند اور سورج کو غروب ہوتے دیکھ کر اپنی قوم سے کہا تھا کہ غروب ہونے والے خدا نہیں ہوسکتے۔ اور جب قافلے تھک کر پانی کے چشمے پر قیام کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سلسبیل کے گرد اہل ایمان جمع ہوں۔ جو عشق ومحبت میں سرشار ہوتے ہیں وہ نئے نئے صحراؤں کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں اور تو آبادی کھیتوں اور باغوں کا اسیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیہم گردش اور صحرانوردی حرکت وعمل کی دلیل ہے اور یہی زندگی کا راز ہے۔

اس بند میں مختلف مناظر بڑے دلفریب انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ خضر جواب دیتے ہیں اور مختلف مناظر اور کائنات کی آغوش میں چھپے مظاہر کو بیان کرتے ہیں، ان کی دلفریبی اور دلکشی سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ خضر کہتے ہیں کہ صحرانوردی سے کائنات کے بے شمار راز منکشف ہوتے ہیں، فکر اور علم میں اضافہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلسل حرکت میں رہنا اور عمل کرتے رہنا زندگی کی دلیل ہے۔ جو قومیں مسلسل جدوجہد کرتی ہیں ان کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ صحرانوردی حرکت وعمل کا استعارہ ہے۔ خضر تیسرے بند کے آخری شعر میں زندگی کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی حرکت وعمل اور مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔

چوتھا بند زندگی کے عنوان سے شروع ہوتا ہے اور اگلے دونوں بندوں میں فلسفۂ حیات کا بیان ہے۔ یہ شاعر کے دوسرے سوال کا جواب

ہےاور تیسرے بند کے آخری شعر سے مربوط ہے۔اقبال خضر کی زبانی کہتے ہیں کہ زندگی سود وزیاں یعنی نفع ونقصان سے بلند تر ہے۔کبھی عظیم مقاصد کے لیے جان کی قربانی بھی پیش کرنی پڑتی ہے جیسے حضرت امام حسینؓ نے جام شہادت نوش فرمایا،حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی جان بارگاہ الٰہی میں پیش کردی تھی۔اور کبھی ہجرت کر کے جان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔زندگی کو آج اور کل یعنی وقت کے ترازو پہ مت تولو کیوں کہ زندگی جاوداں، مسلسل رواں دواں اور ہردم جوان ہے۔انسانی زندگی ارتقا پذیر ہے۔یہ تخریب سے گزر کر تعمیر کے مراحل طئے کرتی ہے۔ ہرلحظہ بدلتی ہےاوراسی میں انسانی زندگی کا راز پنہاں ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اگرتم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا شمار زندوں میں ہوتو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ محنت اور مسلسل جدوجہد کرو۔آدم کی تخلیق کا راز اور کائنات کی حقیقت اسی تصور حیات سے عبارت ہے۔زندگی کی حقیقت اگر جاننی ہے تو فرہاد سے پوچھو جس نے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی، تجھے احساس ہو گا کہ زندگی عیش وعشرت میں گزر بسر کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ عمل پیہم اور سخت کوشی کا نام ہے:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

آگے خضر آزادی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔آزادی کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں ہے۔آزادی عظیم نعمت اور زندگی کی روح ہے اس لیے خضر کہتے ہیں:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

غلامی میں زندگی کا عمل گھٹ کے رہ جاتا ہے یعنی محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور آزادی میں یہی زندگی بحر بیکراں کی مانند وسیع ترین اور لامحدود بن جاتی ہے۔اگرچہ اس زندگی کا عنصر خاک ہے لیکن اس کے اندر کائنات کو مسخر کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔وجود کے سمندر میں انسان ایک بلبلے کی مانند ابھرا ہے۔دنیا تمہارے لیے ایک امتحان گاہ اور آزمائش کی جگہ ہے۔عموماً انسانی زندگی کو پانی کے بلبلے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں بھی شاعر نے انسانی زندگی کو عالم وجود میں ایک حباب یعنی بلبلہ کہا ہے۔حباب کی زندگی انتہائی پرخطر،مختصر تر ہوتی ہے۔انسانی زندگی بھی مختصر، آزمائشوں سے بھرپور اور خطرات سے دوچار ہوتی ہے۔قدم قدم پر ایک نئی آزمائش اور امتحان تیار رہتا ہے۔اس عالم میں مسلسل عمل اور سخت ترین محنت درکار ہوتی ہے اور زندگی کا حقیقی تصور یہی ہے۔اس بند کے آخر میں خضر کہتے ہیں کہ اگر تو ناپختہ ہے یعنی اس امتحان میں ناکام ہے تو محض مٹی کا ایک ڈھیر ہے لیکن اگر پختہ ہو جائے تو شمشیر آبدار کی مانند مسخر کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

پانچویں بند میں خضر کہتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں صداقت کے لیے مرنے کا جذبہ ہو وہ پہلے اپنے خاکی جسم میں جان پیدا کرے یعنی قوت ارادہ اور عزم پیدا کرے۔مستعار اشیا یعنی جو اسے بغیر محنت وعمل کے حاصل ہوگئی ہیں ان کو جلا ڈالے کیوں کہ وہ پائیدار نہیں ہوتیں۔اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا خود کا جہاں تخلیق کرے۔زندگی کی جو پوشیدہ صلاحیتیں اور قوتیں ہیں انہیں ظاہر کردے یعنی اپنی محنت کے ذریعے بروئے کار لائے تاکہ یہ چنگاری یعنی قوت تجھے دائمی ترقی سے ہمکنار کردے۔

اقبال نے زندگی کا مابعد الطبعیاتی تصور پیش کیا ہے۔اقبال کے نزدیک زندگی وقت کی قید سے آزاد اور سود وزیاں سے مبرا ہے۔اقبال زندگی کا اجتماعی شعور پیش کرتے ہیں۔مابعد الطبعیاتی سطح پر زندگی کو متعارف کرنے کے ساتھ اقبال زندگی کے اجتماعی شعور پر آجاتے ہیں اور اسے ملی

تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی زندگی کا آفاقی اور کائناتی تصور ہے:

خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب　　تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے

مشرق سے جس طرح آفتاب طلوع ہوتا ہے اسی طرح امت خاک مشرق میں ماضی کی طرح پھر سے وہی رفعت حاصل کرسکتی ہے۔ بدخشاں افغانستان کا ایک خطہ ہے جہاں کے لعل مشہور ہیں۔یہ وسط ایشیا،چین اور پاکستان کے سنگم پر واقع ہے۔

خضر کہتے ہیں کہ رات کے وقت جب پوری کائنات خواب خرگوش سے لطف اندوز ہورہی ہو اس وقت تو آرام کرنے کے بجائے گریہ و زاری کرتا کہ تیری آہ وفریاد آسمان کی طرف تیری سفیر بن کر جائے اور آسمان کے ستاروں کے درمیان تیرے راز داں پیدا ہوں۔اس بند کے آخری شعر میں خضر کہتے ہیں کہ عصر حاضر قیامت کی مانند ہے گویا تو اس وقت میدان محشر میں کھڑا ہے۔جس طرح قیامت میں عمل پیش کرنے پر ہی بخشش ہو سکتی ہے۔اس طرح یہاں بھی تو عمل کر ورنہ فنا تیرا مقدر ہے۔اقبال نے خضر کی زبانی زندگی کے فلسفے پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور زندگی کو حرکت وعمل کا مترادف بتایا ہے۔

اقبال نے زندگی کا اجتماعی شعور پیش کیا ہے،اس لیے وہ انسانی زندگی میں کارفرما تمام شعبہ ہائے حیات پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔اب وہ سلطنت کے راز فاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ملوکیت جبر و جارحیت اور ظلم سے عبارت ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ آؤ تمہیں سلطنت اور حکومت کی حقیقت بتاتا ہوں، یہ ایک جادوگری ہے۔حکمراں طبقہ عوام کو غلام بنائے رکھنے کے لیے ہر طرح کی مصلحتوں اور طریقوں کا استعمال کرتا ہے۔کبھی بظاہر منصف اور رعایا پرور بھی بنتا ہے۔یہ سب اس کے ہتھکنڈے ہیں تاکہ عوام بیدار نہ ہوجائیں۔اگر لوگ بیدار ہونے لگتے ہیں تو وہ پھر کوئی ترکیب کرکے اسے سلا دیتے ہیں۔اقبال سورہ نمل کی آیت ''**ان الملوک اذا دخلو قریة افسدوها و جعلو اعزة اهلها اذلها . و کذالک یفعلون.**''

(ترجمہ:یقیناً بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کردیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل کردیتے ہیں۔اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔)

اقبال سامراج کی چالاکیوں اور سازشوں سے دنیا کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مغرب کے نام نہاد جمہوری نظام کو محض فریب اور آزادی کے نام پر دھوکہ قرار دیتے ہیں۔اقبال کے نزدیک حکمراں ہر طرح کی چالیں چلتا ہے،کبھی نرمی اختیار کرکے فریب دینے کی کوشش کرتا ہے۔سلطنت اور حکومت کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک　　سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر　　پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اقبال کہتے ہیں کہ یہ ملوکیت اپنی سحر انگیزی سے انسان کا احساس آزادی اور احساس خودی تک چھین لیتی ہے۔محمود یعنی حکمراں اس طرح طلسم ڈالتا ہے کہ ایاز یعنی غلام غلامی میں ہی فخر محسوس کرنے لگتا ہے۔اقبال نے محمود اور ایاز کی تلمیح کا سہارا لیا ہے۔ایاز محمود غزنوی کا خاص اور چہیتا غلام تھا:

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز　　دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری

لیکن کبھی نہ کبھی یہ طلسم ٹوٹتا ضرور ہے۔ یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی اور غلاموں پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور ان میں سے کوئی اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو انہیں استحصالی اور استبدادی قوتوں سے آزاد کراتا ہے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے سامری کا طلسم توڑ کر لوگوں کو حق اور انصاف کی طرف بلایا:

خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں　　توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

سامری موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ایک جادوگر تھا جس نے لوگوں کو ایک بچھڑے کی پرستش پر لگا دیا تھا۔ خضر آگے کہتے ہیں کہ دراصل حکمرانی فقط رب ذوالجلال کی ہے، اس کے علاوہ سب کی حکمرانی عارضی اور ناپائدار ہے۔ دنیا کے یہ سب حاکم آذر کے بنائے ہوئے بتوں کے مانند ہیں جن کا مقدر ٹوٹنا اور فنا ہونا ہے۔

اللہ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لیے غلامی اختیار کر کے اپنی آزاد فطرت کو رسوا مت کرو اور اگر تم ایسا کرتے ہو یعنی خدا کے علاوہ کسی کی حکمرانی مانتے ہو تو برہمن سے بھی بڑے کافر ہو۔ اقبال نہ صرف ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں بلکہ خود ساختہ اور جبری حاکمانہ نظام کو بھی مسترد کر دیتے ہیں۔ اقبال جمہوری نظام کے قائل ہیں مگر ان کا تصور جمہوریت مغرب کے نام نہاد جمہوری تصور سے مختلف ہے۔ مغرب کا جمہوری نظام ایک فریب تھا جو مغربی فاشسٹ قوتیں دنیا کو دے رہی تھیں۔ دوسرے ملکوں اور قوموں کو اب چوں کہ جبری غلام بنائے رکھنا ممکن نہیں تھا اس لیے جمہوریت کے فرضی تصور کی آڑ میں عوام کو فریب دیا گیا اور غریبوں، کسانوں اور خاص طور سے غریب ایشیائی اور افریقی ملکوں کو جو آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے یا آزادی حاصل کرنے کے قریب تھے، ان کو محکوم اور کمزور بنائے رکھنے اور ان کا استحصال کرنے کے لیے یہ پورا نظام ترتیب دیا گیا۔ اس طرح دنیا غلامی، عدم مساوات اور ظلم و استحصال کے نئے عہد میں داخل ہو گئی۔ اقبال مغرب کے جمہوری نظام کو شخصی حکومت اور بادشاہت ہی کی توسیع قرار دیتے ہیں:

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو　　آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال خضر کی زبانی کہتے ہیں کہ جمہوری قبا میں کوئی ظالم و جابر دیو ناچ رہا ہے اور اے غافل تو اسے نیلم پری سمجھ رہا ہے۔ افسوس ہے کہ تو نے سراب کو گلستاں اور قفس کو آشیانہ سمجھ لیا ہے۔ مجلسِ آئین، نظام جمہوریت، حقوق انسانی کے دعوے اور انصاف و اصلاح کی باتیں محض فریب اور دھوکہ ہیں:

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق　　طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں　　یہ بھی اک سرمایہ داروں کی جنگ زرگری

خضر کہتے ہیں کہ تو اسے آزادی کا پیغام بر، لوگوں کو حقوق فراہم کرنے والا، ان کی زندگی کو منظّم کرنے والا سمجھتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے یہ استعماریت کا ہی جدید نسخہ ہے جس کا اثر بظاہر شیریں ہے لیکن وہ آزادی اور حقوق سے غافل کرنے والا ہے۔ یہ جمہوری ادارے اور ان میں ہونے والی پرجوش تقریریں اور نعرے جنہیں سن کر ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کی فلاح کے لیے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب مساوات

عام ہوگی، غریبوں اور مظلوموں کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سرمایہ داروں کی مزید دولت حاصل کرنے کی نئی نئی چالیں ہیں۔

ساتواں بند سرمایہ ومحنت کے عنوان سے ہے۔ خضر اقبال سے کہتے ہیں کہ جا کر مزدور کو میرا پیغام سنا دے اور یہ پیغام صرف میرا نہیں ہے بلکہ پوری کائنات کا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مزدور! ہمیشہ تو نے ہی محنت کی لیکن تجھے کبھی اس کا پھل نہیں ملا۔ تیری محنت کا پھل یہ حیلہ گر سرمایہ دار کھاتے رہے۔ تو اپنی محنت سے دولت پیدا کرتا رہا لیکن تجھے اس کا معمولی معاوضہ ملتا رہا اور وہ بھی سرمایہ دار اس طرح دیتا تھا جیسے زکوٰۃ ادا کر رہا ہو یعنی کوئی احسان کر رہا ہو یا بھیک دے رہا ہو۔ خضر آگے کہتے ہیں کہ یہ سرمایہ دار حسن بن صباح کی مانند ہیں جس نے عارضی بہشت بنائی تھی، وہ اپنے ماننے والوں کو بھنگ پلا کر مدہوش کر دیتا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی عظیم نعمت مل گئی ہے۔ سرمایہ دار بھی مزدوروں کو ان کے حقوق سے غافل رکھنے کے لیے انہیں نشہ دیتا ہے اور یہ محنت کش اسے مصری کی ڈلی سمجھتے ہیں۔ سرمایہ داروں نے مختلف طرح کے نشے ایجاد کر رکھے ہیں۔ مذہب، قومیت، رنگ ونسل اور تہذیب کے نام پر ایسے ایسے نشے ایجاد کر رکھے ہیں جنہیں یہ محنت کش پی کر سرمست ہو جاتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری اور استعماریت کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر وہ اپنے جبر واستبداد کی عمارتیں قائم کرتے ہیں۔ خضر کہتے ہیں کہ یہ نادان محنت کش نسلی اور قومی تعصّبات کے نشے میں چور ہو کر اور باطل قوتوں کو خدا مان کر اپنا تمام اثاثہ لٹا بیٹھے ہیں۔

سرمایہ داری اور معاشی عدم مساوات کے تعلق سے اقبال کا نظریہ بہت واضح ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کو غریبوں، مزدوروں اور پسماندہ طبقوں کی پسماندگی اور ذلت کا سبب مانتے ہیں اور ان کی قابل رحم حالت کے لیے اس نظام کو ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اقبال کے سامنے زمینداری اور سرمایہ داری کی وہ صدیوں پرانی استحصال اور جبر کی تاریخ ہے جس کی روشنی میں وہ کہتے ہیں:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا یہ ہے پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

سرمایہ دار ہوشیار اور چالباز ہوتا ہے جب کہ مزدور سادہ لوح ہوتا ہے۔ محنت کش اور مزدور سرمایہ دار کے فریب کو سمجھ نہیں پاتا اور اس کی چالوں میں آجاتا ہے اور اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے مات کھا جاتا ہے جب کہ اپنے مکر سے سرمایہ دار جیت جاتا ہے:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

خضر مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ طبقوں کو انقلاب کی دعوت دیتے ہیں، انہیں ظلم، جبر اور معاشی استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ ان کے سامنے امید کی شمع روشن کرتے ہیں اور پیشین گوئی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آنے والا وقت تیرا ہے، مشرق اور مغرب ہر طرف تیرے دور کی آمد کا پیش خیمہ تیار ہو رہا ہے۔ اقبال خضر کے ذریعے دنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

آٹھواں بند بھی سرمایہ داری سے متعلق ہے۔ خضر اپنے پیغام کو مزید وسعت دیتے ہوئے مزدور کی غیرت وحمیت کو بیدار کرنے کی کوشش

کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بلند عزم وہ ہے کہ اگر اسے وسیع ترین سمندر مل جائے تو اس پر بھی قناعت کر کے اسے قبول نہیں کرتا اور تو شبنم جیسی معمولی مراعات پر کب تک قناعت کرتا رہے گا۔ دراصل عیش وعشرت کا حقیقی سامان عوام کی بیداری کے نغموں اور نعروں میں پوشیدہ ہے۔ یہ نغمے سننے کے بجائے تم آخر کب تک سکندر اور جمشید جیسے بادشاہوں کے غافل کرنے والے یا سلا دینے والے نغمے سنتے رہو گے۔ آگے خضر طلوع صبح نو اور اس سے ظاہر ہونے والے نئے آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھ زمین کے بطن سے نیا سورج طلوع ہو رہا ہے، اس لیے تم ان ستاروں کا ماتم کب تک کرتے رہو گے جو غروب ہو چکے ہیں۔ اب اس نئے آفتاب سے اکتساب نور کرو۔ آج انسانی فطرت نے تمام زنجیروں اور بیڑیوں کو توڑ دیا ہے۔ اگر چہ انسان کا جنت سے نکالا جانا عظیم سانحہ تھا لیکن آخر اس بات کا غم کب تک کیا جاتا۔ انسان کی فطرت نے اس غم کو بھلا کر نئے حوصلہ اور ہمت سے نئی دنیا آباد کر ڈالی۔ خضر آگے کہتے ہیں کہ یہ بیداری ایک فطری امر ہے بالکل اسی طرح جیسے پھولوں کا کھلنا فطری ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ شاعر نے اس مضمون کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے کہ بہار باغبان سے کہہ رہی ہے کہ پھولوں کے سینے پر جو زخم لگے ہیں تم اس پر آخر کب تک مرہم لگاؤ گے یعنی کب تک انہیں کھلنے سے روکو گے۔ یعنی جس طرح پھولوں کو کھلنے سے نہیں روکا جا سکتا اسی طرح آزادی اور بیداری کے جذبے کو پروان چڑھنے سے روکنا بھی محال ہے۔ بند کے آخری شعر میں خضر دوبارہ اس بات کو دہراتے ہیں کہ اے محنت کش مزدور سرمایہ دار کے گرد طواف کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بجائے اپنے حق کو پہچان اور اپنے اندر احساس خودی بیدار کر:

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو　　اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

مذکورہ شعر میں کرمک مزدور کا استعارہ ہے اور شمع سرمایہ دار کا۔ ان استعاروں سے اس دور کی دونوں کی تقابلی حیثیتوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ شاعر نے مزدور طبقے کی غفلت، اپنے حقوق کو نہ پہچاننے، سرمایہ داروں کے وفادار بنے رہنے، احساس خودی سے عاری ہونے اور غلامی پر فخر کرنے کو پتنگوں کے شمع کے گرد طواف کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال خضر سے عالم اسلام کے تعلق سے پانچواں سوال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان شدید باہمی اختلاف، عربوں کی بغاوت اور خلافت عثمانیہ کے زوال کے سبب ملت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مغربی طاقتوں نے سازش کے تحت مسلمانوں کی سیاسی قوت کو زمین دوز کر دیا تھا اور مغرب کی اس سازش میں ترکوں کے خلاف عرب ان کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ خضر کہتے ہیں کہ تو مجھے ترک وعرب یعنی عالم اسلام کی داستان کیا سناتا ہے، مجھ سے امت مسلمہ کے عروج وزوال کی داستان پوشیدہ نہیں ہے۔ تثلیث کے فرزند یعنی عیسائی اب حضرت ابراہیم کی میراث یعنی ان کی خوبیوں اور اخلاق حسنہ کے حامل ہیں جو کبھی مسلمانوں کی ہوا کرتی تھیں۔ اب مسلموں نے اس وراثت سے منہ پھیر لیا ہے اور خاک حجاز کلیسا کی بنیاد کی اینٹ بن گئی ہے۔ یعنی عربوں نے ان کی غلامی اختیار کر لی ہے، جس کی جہ سے کلاہ لالہ رنگ جو باعث افتخار سمجھی جاتی تھی، رسوا ہو کر رہ گئی ہے۔ عثمانی سرخ ٹوپی لگاتے تھے۔ کلاہ لالہ رنگ خلافت عثمانیہ کا استعارہ ہے۔ خضر آگے کہتے ہیں کہ اہل فارس انگریزوں سے ایسی شراب کا طلبگار ہے جو اسے اسلامی تہذیب سے دور کر رہی ہے اور نافرمان بنا رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ مغرب کی نقالی میں اپنی تہذیبی قدریں کھو رہے ہیں۔ یہ وہ تمام اسباب ہیں جن کی وجہ سے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے جس طرح تیزاب سونے کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ آج دنیا بھر میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے اور تو اس صورت حال پر مضطرب اور بے چین اس لیے ہے کہ تیرا دل راز سے آگاہ نہیں ہے۔ اس تخریب سے تعمیر کے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ دنیائے اسلام کا پہلا بند اس فارسی شعر کے ساتھ ختم ہوتا ہے:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند　　می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

رومی کے حوالے سے خضر کہتے ہیں کہ رومی کا قول ہے کسی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کرنا ہو تو پہلے اس کی بنیاد اکھاڑی جاتی ہے، اس کے بعد ہی اس کی تعمیرِ نو عمل میں لائی جاتی ہے۔ یعنی یہ تخریب وہی تعمیر سے پہلے کا عمل ہے۔ امت زوال کی اس انتہا سے اب عروج کی طرف بڑھے گی۔

اگلے بند میں خضر مسلمانوں کو اپنے اندر خود اعتمادی، شعورِ خودی پیدا کرنے، دین کی طرف رجوع کرنے اور باہمی اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہیں۔ مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں ہیں، سلطنت ان کے ہاتھوں سے جا چکی ہے لیکن خضر پر امید ہیں کہ اس زوال نے اس قوم کی روح کو بیدار کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ سلطنت ہاتھ سے چلی گئی ہے، اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن گیا ہے تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ امت مسلمہ کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور وہ بیدار ہونے لگی ہے۔ خضر کہتے ہیں کہ ہڈی جوڑنے والی دوا کی بھیک مانگنے سے اس کا شکستہ رہنا ہی بہتر ہے یعنی مسلمانوں کے دوسرے ملکوں سے مدد کی بھیک مانگنے سے بہتر ہے کہ وہ پریشان حال رہیں، لیکن اپنا وقار نہ کھوئیں۔ اس لیے کہ اگر تیرا وجود اگر ایک معمولی چیونٹی کے برابر بھی ہو تو حضرت سلیمان جیسے عظیم حکمراں کے سامنے حاجت روائی کے لیے دست طلب نہیں پھیلانا چاہیے۔ خضر دوسروں پر انحصار کرنے اور ان سے مدد طلب کرنے کے بجائے خود عمل کرنے اور خود اعتمادی کی تلقین کرتے ہیں۔ آگے کہتے ہیں کہ اہل مشرق یعنی مسلمانوں کی نجات ان کے باہمی اتحاد و اتفاق میں مضمر ہے۔ لیکن افسوس کہ ایشیا کے لوگ ابھی تک اس نکتے سے آگاہ نہیں ہیں۔ خضر کہتے ہیں کہ مسلمان اب سیاست چھوڑ کر دین کے حصار میں داخل ہو جائیں یعنی اپنے دین کی طرف رجوع کریں کیوں کہ ملک اور سلطنت سب حرم یعنی دین کے تحفظ کا معمولی سا پھل ہیں۔ یعنی یہ دین کے وسیلے سے ہی مسلمانوں کو میسر آئی تھیں۔ اس لیے اگر دین پر عمل پیرا ہو گے تو تمہیں سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ خضر کہتے ہیں کہ حرم کی پاسبانی کے لیے روئے زمین پر آباد بلا تفریق رنگ نسل اور حسب و نسب تمام مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ حرم کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے جب دریائے نیل کے ساحل سے کاشغر تک مسلمان ایک ہو جائیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے　　نیل کے ساحل سے لے لر تا بخاک کاشغر

خضر انتشار اور اختلاف کی صورت میں ہونے والے انجام سے باخبر بھی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر قوم میں اختلافات باقی رہے تو قوم مسلم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گی اور اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے، خواہ شاہی خیموں میں رہنے والے ترک ہوں یا اعلیٰ نسب عرب، سب فنا ہو جائیں گے۔ رنگ و نسل پر مبنی تفریق کی لعنت اگر دین پر مقدم ہو گئی تو ملت اسلامیہ اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہ جائے گی جس طرح راستے پر پڑا ہوا غبار اڑ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ خضر کہتے ہیں کہ اپنے اسلاف جیسی جرات اور حوصلہ پیدا کرو تا کہ جہاں بھر میں پھر سے اسلامی سلطنت اور خلافت کا نظام قائم ہو سکے۔

اقبال نے ملت اسلامیہ کے درمیان نسل اور دیگر بنیادوں پر تفریق کے ساتھ ان کی فرقہ بندی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ خضر کی زبانی کہتے ہیں کہ تم حضرت ابوبکر اور حضرت علی کی عظمت اور بڑائی بیان کرنے میں لڑتے اور اختلاف کرتے ہو اور اس بے جا فرقہ واریت میں اپنی توانائی اور صلاحیت ضائع کرتے ہو۔

نظم کے آخری بند تک آتے آتے نظم میں یاس و ناامیدی کے پردے زائل ہونے لگتے ہیں، افسردگی کی فضا چھٹنے لگتی ہے۔ اس کی فریاد اب تاثیر میں بدل چکی ہے۔ مغرب کے افق پر زوال کی سیاہ لکیریں نظر آ رہی ہیں۔ حریت کا خواب تعبیر کے مراحل طے کر رہا ہے:

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی　　اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج　　موج دریا کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے　　اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں　　آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

خضر کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کے طفیل رب ذوالجلال سے جو فریاد کرنی تھی وہ فریاد ہو چکی، اب اس فریاد کی تاثیر دیکھنے کا وقت ہے۔ تو نے ابھی مغرب کی عظمت اور سربلندی دیکھی ہے، اب دیکھنا موج مضطر یعنی اسلام دشمنوں کی سازشیں خود ان کے لیے کس طرح زنجیر بنتی ہیں۔ اسلام کا بنیادی مقصد تمام انسانوں کی نجات اور ان کی حریت تھا، اب وہ عنقریب پورا ہونے والا ہے۔ سمندر ایک کیڑا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں جل کر خاک ہو جاتا ہے اور اپنی خاک سے دوبارہ جنم لیتا ہے۔ امت مسلمہ کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ خضر کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ اپنے انتہائی زوال کے بعد سمندر کی مانند دوبارہ عروج حاصل کرے گی۔ خضر اقبال کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ مری باتوں کو غور سے سن! میری گفتگو میں تجھے آنے والے دور کی تصویر نظر آئے گی، اگر چہ یہ تصویر ابھی کافی دھندلی ہے لیکن رفتہ رفتہ واضح ہوتی چلی جائے گی۔

خضر آگے کہتے ہیں کہ آسمان کے پاس ابھی ایک آزمودہ فتنہ موجود ہے جس کا نام تقدیر ہے اور تقدیر کے آگے تدبیر کے تمام تر حربے بے بس اور ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خضر آخری شعر میں یہ پیغام دیتے ہیں کہ تو مسلمان ہے اس لیے ناامید مت ہو اور اسلام کی عظمت و سربلندی کی آرزو اپنے دل میں زندہ رکھ اور قرآن کی اس آیت کریمہ پر کامل ایمان رکھ جس میں اللہ فرماتا ہے ''اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں فرماتا''۔

نظم میں اقبال نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ امت مسلمہ کو پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ انہیں ان کی کمیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کیا ہے۔ زوال کے اسباب اور کس طرح ترقی ممکن ہے، یہ بتانے کی کوشش کی ہیں۔

'خضر راہ' اردو شاعری کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اقبال کی اس نظم کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ انقلاب کی نمائندہ نظم ہے، اس کے باوجود اس نظم کا لہجہ دھیما ہے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کی کشمکش، عالم اسلام کی زبوں حالی، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ، آزادی اور غلامی کی جدوجہد جیسے موضوعات کو جس شائستگی اور سنجیدگی کے ساتھ اس نظم میں پرویا ہے وہ ان کی فنی اور فکری غیر معمولی صلاحیتوں کی واضح دلیل ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ نظم انتہائی اہم ہے۔ پوری نظم فنی محاسن سے آراستہ نظر آتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے تلمیحات سے خوب کام لیا ہے اور ان کے ذریعے اپنے موضوع کو پر اثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ نادر تشبیہیں اور استعارے اس نظم کی دلکشی میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اس نظم میں اقبال نے صنعتوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی اس میں نادر ترکیبیں استعمال کی ہیں مثلاً شہید جستجو، قلزم ہستی، ضمیر کن فکاں، اقوام نو دولت، ساز دلبری، شاخ آہو وغیرہ۔ یہ نظم ہر اعتبار سے عمدہ ترین اور بہترین نظم ہے۔ یہ نظم دنیا کے شاہکار شعری فن پاروں میں سے ایک ہے۔

5.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ ''خضر راہ'' اقبال کی ایک طویل اور فلسفیانہ نظم ہے۔

☆ اقبال کی یہ نظم اپنے موضوع، اسلوب، انداز بیان، اپنی فکری اور فنی خصوصیات اور تاثر کے لحاظ سے غیر معمولی اور منفرد نظم ہے۔

☆ اقبال نے اس نظم میں زندگی کی حقیقت، حرکت وعمل، مسلمانوں کے زوال کے اسباب، مغرب کے کھوکھلے پن، سرمایہ داری کے جبر، مزدور کے اوپر ہونے والے مظالم اور سلطنت وحکومت کے بارے میں فلسفیانہ اور حکیمانہ گفتگو کی ہے۔

☆ اقبال نے اس نظم میں حضرت خضر کا علامتی کردار تخلیق کیا ہے جن سے اقبال اس نظم میں چند سوالات پوچھتے ہیں اور پھر خضر کی زبانی اقبال ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نظم میں ڈرامائیت ہے۔

☆ اقبال کی یہ نظم بیسویں صدی میں رونما ہونے والے عظیم انقلاب کی صدائے بازگشت ہے۔ اس دور کی مجموعی صورت حال اقبال کی اس نظم کا محرک ہے۔

☆ اقبال خضر کے ذریعے جو دانائے راز ہیں، عالم اسلام اور دیگر پسماندہ طبقوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے لیے ایک لائحۂ عمل پیش کرتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم میں زندگی کا اجتماعی شعور اور اس کا مابعد الطبعیاتی تصور پیش کیا ہے۔

☆ یہ نظم اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے 37 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ 12 اپریل 1922 میں ترنم میں پڑھ کر سنائی تھی۔

☆ نظم کے اشعار پڑھتے ہوئے اقبال پر رقت طاری تھی اور سامعین بھی زار وقطار رو رہے تھے۔

☆ اس نظم میں اقبال ایک شاعر، ایک مفکر، ایک فلسفی اور ایک انقلابی کے طور پر نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں اقبال کی انقلابی فکر بہت واضح طور پر ظاہر ہوئی ہے لیکن لہجہ دھیما اور بہت سنجیدہ ہے۔

☆ نظم ''خضر راہ'' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اقبال شدید بے چینی اور اضطراب کے عالم میں دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں۔

☆ دریا اقبال کی نظموں میں ایک اہم کردار کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ دریا جو وقت کی علامت ہے، تاریخ کی علامت ہے، تسلسل اور حرکت وعمل کی علامت ہے، اضطراب اور انقلاب کی علامت ہے، گہرائی کی علامت ہے، اسرار ورموز کی علامت ہے۔ دریا کی موجوں پر سکوت طاری ہے اور شاعر کی فکر طلاطم خیز اور مضطرب ہے۔ دریا کا سکوت دراصل مسلمانوں کے فکری اور عملی جمود کی علامت ہے۔

☆ مسلمانوں کے اس فکری جمود نے اقبال کو سخت بے چین کر دیا ہے۔ نظم میں دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو میں اقبال مضطرب نظر آتے ہیں اور سوال اٹھاتے ہیں۔ دوسرے پہلو میں اقبال ایک فلسفی اور مفکر کے طور پر ایک علامتی پیکر خضر کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

☆ اقبال خضر سے پانچ سوال کرتے ہیں۔ سوالوں کے جوابات کے اعتبار سے اقبال نے پانچ ذیلی عنوانات کے تحت نو بند نظم کیے ہیں۔ صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ ومحنت اور دنیائے اسلام۔

5.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
جویا	:	جستجو کرنے والا	محونظر	:	دیکھنے یا نظارہ کرنے میں مصروف
تصویرآب	:	پانی کی تصویر	موج مضطر:		بے قرار لہر
مست خواب	:	نیند میں ڈوبا ہوا	انجم کم ضو	:	کم روشنی والے ستارے
گہوارہ	:	جھولا	طفل	:	بچہ

سخن گستر	:	بات کرنے والا	حیرت فروش:	بہت زیادہ حیران
صحرانورد	:	جنگلوں، صحراؤں میں بھرنے والا	گرم ناؤنوش:	پینے پلانے میں مصروف
سخت کوش	:	بے حد محنتی، جفاکش	تگاپوئے دمادم:	لگاتار بھاگ دوڑ
بانگ رحیل	:	کوچ کرنے یا روانہ ہونے کا اعلان	آہو :	ہرن
سلسبیل	:	بہشت کا ایک چشمہ / نہر	کشت ونخیل:	کھیتی اور کھجور کے درخت
پیہم دواں	:	مسلسل حرکت میں رہنے والا	سرآدم :	انسان کی حقیقت
کوہ کن	:	پہاڑ کھودنے والا، فرہاد مراد ہے	قلزم :	سمندر
خاکستر	:	راکھ	پائے کوب:	ناچنے والا
طب مغرب	:	یورپ کا طریقۂ علاج	خواب آوری:	غافل کردینے کا عمل
مزد	:	مزدوری، اجرت	ساحرالموط:	موط کا جادوگر، سامری مراد ہے
شاخ نبات	:	مصری کی ڈلی	غنچہ ساں :	کلی کی مانند
تجلی زار	:	روشنیوں کی کثرت کی جگہ	کلاہ لالہ رنگ:	سرخ رنگ کی ٹوپی، مراد ترکی ٹوپی
پارس	:	فارس/ایران	مینا گداز :	صراحی کو پگھلا دینے والی
حصار دیں	:	دین کا قلعہ	ترک خرگاہی:	شاہی خیمے والا ترک، ترک قوم

5.5 نمونہ امتحانی سوالات

5.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نظم 'خضر راہ' اقبال کے کس شعری مجموعے میں شامل ہے؟

2۔ 'خضر راہ' اقبال نے کہاں پڑھ کر سنائی تھی؟

3۔ اقبال نے کس سنہ میں اپنی نظم 'خضر راہ' پیش کی تھی؟

4۔ اقبال نے نظم میں کس جمہوری نظام کو ہدف تنقید بنایا ہے؟

5۔ اقبال خضر سے کتنے سوال کرتے ہیں؟

6۔ خضر راہ کے شاعر کون ہیں؟

7۔ جواب خضر کے تحت کتنے ذیلی عنوانات ہیں؟

8۔ اقبال نے خضر سے کتنے سوال کیے ہیں؟

9۔ نظم خضر راہ میں کتنے بند ہیں؟

10۔ نظم خضر راہ کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟

5.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نظم 'خضر راہ' کے پس منظر پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ اقبال کی فکری تشکیل میں کن عناصر نے بنیادی کردار ادا کیا۔ واضح کیجیے۔

3۔ شامل نصاب نظم ''خضر راہ'' پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

4۔ نظم 'خضر راہ' کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

5۔ اقبال نے 'جواب خضر' کے تحت کون کون سے عنوان قائم کیے ہیں؟

5.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کی نظم گوئی پر اظہار خیال کیجیے۔

2۔ نظم خضر راہ کے حوالے سے اقبال کے شعری خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ''خضر راہ'' کا تجزیہ اپنے لفظوں میں کیجیے۔

5.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	کلیات اقبال	محمد اقبال
2۔	بال جبریل (شعری مجموعہ)	محمد اقبال
3۔	بانگ درا	محمد اقبال
4۔	فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
5۔	اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم

اکائی6 : نظم ''مسجد قرطبہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		نظم ''مسجد قرطبہ''
	6.2.1	نظم کا پس منظر
	6.2.2	''مسجد قرطبہ'' کا تجزیاتی مطالعہ
6.3		اکتسابی نتائج
6.4		کلیدی الفاظ
6.5		نمونہ امتحانی سوالات
	6.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	6.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	6.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
6.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

اقبال کا شمار نہ صرف اردو زبان کے بلکہ دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں غیر معمولی فکر اور مربوط فلسفے کی آمیزش نظر آتی ہے۔انہوں نے اردو زبان وادب کو عظیم شاہکار عطا کیے ہیں اور غیر معمولی شعری تخلیقات کے ذریعے اردو شاعری کے خزانے میں اہم ترین اضافہ کیا ہے۔انہوں نے 'خضر راہ'، 'مسجد قرطبہ'، طلوع اسلام'، 'ذوق وشوق'، 'طلوع اسلام' جیسی بہترین نظمیں تخلیق کر کے اردو شاعری کی عظمت میں چار چاند لگائے ہیں۔اقبال کی زیر نظر نظم ''مسجد قرطبہ'' اپنے موضوع، اپنی فکری اور فنی خصوصیات، طرز اظہار اور تاثر کے لحاظ سے ایک منفرد نظم ہے۔یہ ایک علامتی نظم ہے۔مسجد قرطبہ کو علامت بنا کر اقبال نے ملت اسلامیہ کے عروج وزوال کی داستان بیان کی ہے۔اقبال نے اس نظم میں زندگی کی حقیقت، وقت کے جبر، حرکت وعمل، تصور عشق اور فلسفۂ وقت پر حکیمانہ گفتگو کی ہے۔

زیر نظر اکائی میں آپ اردو زبان کے عظیم شاعر اقبال کی شاعری کی خصوصیات، ان کی فنی اور فکری انفرادیت اور ان کی نظم 'مسجد قرطبہ' کا

تجزیاتی مطالعہ کریں گےاوراس کی شعری خصوصیات سے آگہی حاصل کریں گے۔اس اکائی میں اکتسابی نتائج کے ساتھ مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں نمونے کےطور پر امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں،جن میں معروضی جوابات کے حامل سوالات،مختصر جوابات کے حامل اورطویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔اکائی کے آخر میں کچھ کتابوں کے نام مع مصنف درج کیے گئے ہیں،جن کے مطالعے سے اقبال اور ان کی شاعری سے متعلق آپ کومزید معلومات فراہم ہوں گی۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- ☆ اقبال کی شعری خصوصیات سے آگاہ ہوسکیں۔
- ☆ اقبال کی فنی اورفکری انفرادیت کوسمجھاسکیں۔
- ☆ اقبال کی نظم گوئی سے واقف ہوسکیں۔
- ☆ نظم 'مسجدقرطبہ' کا تجزیہ کرسکیں۔

6.2 نظم ''مسجدقرطبہ''

مسجدقرطبہ

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات — سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود
قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرش معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود
کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل
مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ ارباب فن سطوت دین مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

آہ وہ مردان حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں

حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں

چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذت تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

6.2.1 نظم کا پس منظر:

زیر نظر نظم کا موضوع مسجد قرطبہ ہے جو اسپین کے ایک عظیم اسلامی دور کی نشاندہی کرتی ہے اور مسلمانوں کے عروج، ان کے اخلاص اور ان کے جذبۂ ایمانی کی یادگار ہے۔ اس کے نقش و نگار میں مسلمانوں کے عروج اور عظمت کی وہ داستان پوشیدہ ہے جسے اقبال اس نظم کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسپین کئی صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ اس لیے اقبال کو اس خطے سے خصوصی تعلق خاطر ہونا قطعا فطری تھا۔ اقبال نے اسپین اور فتح اسپین سے متعلق چند دوسری نظمیں مثلاً ''طارق کی دعا'' اور ''ہسپانیہ'' کے عنوان سے لکھی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں'' کے عنوان سے بھی ہے۔ یہ نظم دراصل عبدالرحمٰن اول کی تصنیف میں درج اشعار کا آزاد منظوم ترجمہ ہے۔

اقبال 1932 میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے تھے۔ کانفرنس میں شرکت کے بعد 1933 میں اسپین پہنچے۔ وہاں اسپین کے وزیر تعلیم پروفیسر آسن کی درخواست پر میڈورڈ یونیورسٹی میں انہوں نے ''دی انٹلیکچول اسلام اینڈ اسپین'' کے موضوع پر لکچر دیا۔ اس سفر میں اقبال کو اسپین کے مختلف شہروں طلیطلہ، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلہ کی سیاحت کا موقع ملا۔

711 میں جب مسلمان اندلس میں داخل ہوئے عموماوہ عیسائی گرجا گھروں کا ایک حصہ نماز کے لیے استعمال کرلیا کرتے تھے۔ 785 میں عبدالرحمٰن اول نے ونسنٹ گرجے کو ایک لاکھ دینار کے عوض خرید لیا اور گرجے کی تعمیر کے لیے دوسری جگہ دے دی۔ اس طرح اس مسجد کا سنگ بنیاد عبدالرحمٰن اول نے رکھا۔ اس مسجد کی تعمیر و توسیع کا کام عبدالرحمٰن اول کے دور سے شروع ہوکر ہشام اول، عبدالرحمٰن دوم اور الحکم سے ہوتے ہوئے 987 میں منصور کے دور میں تکمیل کو پہنچا۔ یہ مسجد وادیٔ کبیر دریا پر تعمیر شدہ پل کے قریب واقع ہے۔ خلافت بنی امیہ کے خاتمے کے بعد 20 سالہ نوجوان عبدالرحمٰن نے 750 میں عباسیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے افریقہ کا رخ کیا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے وہ پانچ سال بعد اندلس کے ساحل پر پہنچا۔ وہاں اموی دور کی شاہی افواج موجود تھیں۔ انہوں نے عبدالرحمٰن کو اپنا کمانڈر بنالیا اور 756 میں امارت قرطبہ کے قائم ہونے پر وہ وہاں کا امیر بن گیا۔ یہ خطہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں خلافت بنی امیہ کا ایک صوبہ تھا۔ عبدالرحمٰن اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا تھا۔ ولید بن عبدالملک کے دور میں موسیٰ بن نصیر جو شمالی افریقہ کے گورنر بنے۔ اسپین کے حکمراں عیش پرست اور ظالم تھے اس لیے وہاں کی معاشی صورت حال ابتر ہوچکی تھی۔ امرا اور پادریوں نے عوام کو ٹیکس کے بوجھ تلے دبا دیا تھا۔ اس ظلم اور بدحالی سے تنگ آکر لوگ ہجرت کرکے موسیٰ بن نصیر کے زیر انتظام شمالی افریقہ میں پناہ لینے لگے۔ ان حالات میں موسیٰ بن نصیر نے وہاں کی عوام کو ظلم سے نجات دلانے کا منصوبہ بنایا اور انہوں نے 711

میں مشہور بربر جرنل طارق بن زیاد کو 7000 فوج کے ساتھ اسپین پر لشکر کشی کے لیے روانہ کر دیا۔ ان کا سامنا وہاں کے حاکم راڈرک کی ایک لاکھ سے زیادہ فوج سے ہوا۔ 19 جولائی 711 کو طارق بن زیاد نے فتح حاصل کی۔ اندلس کا شہر قرطبہ اکتوبر 711 کو عبدالملک بن مروان کے غلام مغیث بن حارث رومی کے ہاتھوں فتح ہوا جہاں یہ تاریخی مسجد واقع ہے۔ اقبال نے کئی صدیوں بعد اس مسجد میں اذان دینے اور نماز ادا کرنے کا شرف حاصل کیا۔ اقبال نے یہ نظم ہسپانیہ (اسپین) کی سرزمین پر قائم اسی مسجد قرطبہ میں تخلیق کی تھی۔ یہ نظم ان کی اندلس کی سیاحت کی یادگار ہے۔

6.2.2 مسجد قرطبہ کا تجزیاتی مطالعہ:

''مسجد قرطبہ'' اقبال کی مشہور زمانہ نظم ہے جو ان کے شعری مجموعے بال جبریل میں شامل ہے۔ اس نظم کی فضا علامتی ہے۔ اس نظم میں ایجاز، علامتی پیرایۂ اظہار، استعاراتی اسلوب، جاہ وجلال، حسن و جمال، اظہار، مرقع سازی، وسعت فکری، اور فنی کاریگری سب یکجا ہوگئی ہیں۔ اس کا شمار اقبال کی شاہکار نظموں میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں وقت کے جبر، عشق کے دوام اور زندگی کے پیہم رواں ہونے کا تصور ملتا ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اجتماعیت، رجائیت اور قومیت کا تصور پیش کیا ہے۔ وقت کے مجرد تصور کے ساتھ عشق کی غیر معمولی قوت اور اس کی دائمی بقا کا اظہار کیا ہے۔ نظم ''مسجد قرطبہ'' میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم قصیدے کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

یہ نظم ایک عہد کی تہذیب وتمدن اور اس عہد کے اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اقبال نے فلسفیانہ اور حکیمانہ طرز اظہار اختیار کیا ہے۔ وقت کی برتری، عشق کی لازوال قوت اور اس قوت سے سرشار بندۂ مومن کا جذبۂ ایمانی جس کے آگے ہر شئے مسخر ہو جاتی ہے، کو خاص طور سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم قاری پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ نظم کے مطالعے سے وہ منظر آنکھوں کے سامنے ظاہر آجاتا ہے جس کا تاثر اس نظم کی تخلیق کا محرک بنا ہوگا۔ اندلس کی سرزمین ہے، شام کا وقت ہے اور تاریکی گہری ہوتی جارہی ہے، شاعر کے سامنے امت کی عظمت رفتہ کی امین ایک عظیم تاریخی مسجد ہے جو صدیوں سے بے اذاں ہے۔ اقبال کے ذہن میں یادیں گھر کرنے لگتی ہیں، خیالات کی موج بے کراں انگڑائی لینے لگتی ہے اور اقبال اس کے سیل کے ساتھ بہتے ہوئے اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جس میں یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ تاریخ کے اوراق الٹتے چلے جاتے ہیں اور یہ مسجد اس عہد کے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی، اخلاص اور عشق حقیقی میں ان کی سرشاری کی علامت بن جاتی ہے۔

نظم کے پہلے بند میں شاعر نے وقت کے فلسفے پر فلسفیانہ اور حکیمانہ گفتگو کی ہے۔ وقت جو ہر شئے پر محیط ہے۔ وقت کے دائرے سے کائنات کی کوئی شئے باہر نہیں ہے۔ وقت ہی کے ذریعے خالق حقیقی اپنی قدرت اور قوت کا اظہار کرتا ہے۔ اقبال نے زندگی بلکہ کائنات کی ہر شئے کی بے معنویت اور اس کے وقت کے تابع ہونے کا اظہار کیا ہے۔ اقبال نے وقت کو سلسلۂ روز وشب یعنی گردش لیل ونہار (دن اور رات) سے تعبیر کیا ہے۔ وقت انہی دو کائیوں کے درمیان گردش کرتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی سلسلۂ روز وشب یعنی وقت کے دائرے میں زندگی کے تمام حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں۔ تمام تغیرات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ وقت اسی گردش سے نت نئے واقعات کے نقش تیار کرتا رہتا ہے، دنیا کے سارے انقلاب ظاہر ہوتے ہیں اور یہی موت وحیات کی اصل ہے۔ اسی گردش دوراں کے سبب پرانی چیزیں ختم ہوتی رہتی ہیں اور نئی چیزیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ وقت کا یہ تسلسل بستیوں کو بیابانوں میں اور بیابانوں کو بستیوں میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ یہ تعمیر وتخریب کی منزلوں کے درمیان ہو کر گزرتا رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ وقت ایک بہاؤ اور ایک دریا ہے جو ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔

یہ سلسلۂ روز وشب اپنے وجود کے اعتبار سے ریشم کے دو رنگ والے (سیاہ وسفید) تار کی مانند ہے جس سے ذات اپنی صفات کی قبا تخلیق

کرتی ہے یعنی اسی سلسلۂ روز وشب کے دائرے میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور حادثات کے ذریعے اللہ کی جمالی وجلالی صفات نمایاں ہوتی ہیں۔اقبال وقت کی کارفرمائیوں کا ایک واضح تصور پیش کرنا چاہتے ہیں۔

رات اور دن کا یہ سلسلہ جسے شاعر نے زمانے کا نام دیا ہے دراصل ازل کے ساز کی وہ فغاں ہے جس کے ذریعے قدرت ممکنات کے زیر و بم یعنی عروج وزوال کو نمایاں کرتی ہے۔یعنی اتار چڑھاؤ کا یہ سلسلہ تخلیق کائنات کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔یہ سلسلۂ روز وشب یعنی زمانہ کائنات کا صراف ہے جو سب کے اچھے اور برے اعمال کو پرکھتا ہے۔مجھے بھی پرکھتا ہے اور تجھے بھی۔یعنی کوئی اس سے ماورا نہیں ہے۔اور اگر ہم میں سے کوئی اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا اور جس کی خودی ناقص ہوتی ہے وہ فنا ہوجاتا ہے۔زمانہ اسے فراموش کردیتا ہے۔جس کی خودی عشق سے سرشار ہوتی ہے اس کو دوام حاصل ہوتا ہے۔موت اسے فنا نہیں کرسکتی۔اس سلسلۂ شب وروز کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک حرکت اور بہاؤ ہے،جس میں تغیر نہیں ہے۔وقت کے تسلسل کا یہ جو تصور ہے وہ مجرد ہے اور کسی بھی تغیر سے بے نیاز ہے۔اس کی حقیقت رات اور دن ہونا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ پیہم رواں دواں ہے۔گویا زندگی کی حقیقت بھی وقت کی مانند مسلسل جدوجہد کرنا اور پیہم رواں دواں رہنا ہے۔اقبال کا ایک اور شعر دیکھیے جو مذکورہ خیال کی تصدیق کرتا ہے:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہے جواں ہر دم رواں، پیہم رواں ہے زندگی

اقبال اس بند کے آخری دو اشعار میں دنیا کی بے ثباتی اور کم مائیگی کے بارے میں واضح طور پر اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان نے اپنے علم ہنر سے جو نادر اور نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں وہ تمام معجزات علم وہنر ناپائدار اور فانی ہیں۔کائنات کا یہ تمام سلسلہ عارضی اور فنا ہوجانے والا ہے۔یہاں ہر شئے فنا ہوجانے والی ہے۔خواہ وہ اول ہو یا آخر ہو،ظاہر ہو یا باطن ہو،کوئی نیا نقش ہو یا پرانا۔یہاں کسی چیز کو ثبات نہیں ہے اور سب کی آخری منزل فنا ہے۔

اردو میں بہت کم نظمیں ایسی ہیں جو آغاز سے ہی اس قدر پراثر ہوں۔پہلے مصرعے سے یہ نظم فکر کو اس قدر مہمیز اور حواس کو متحرک کردیتی ہے کہ جیسے ہم کسی طوفان خیز دریا کے کنارے کھڑے ہوں جو ہر چیز کو اپنے ساتھ بہالے جارہا ہو اور اس کے بہاؤ میں کائنات کی ہر شئے بہتی جارہی ہو۔ہر مصرعے کے ساتھ یہ بہاؤ تیز تر ہوتا جاتا ہے۔

نظم میں وقت کے جبر کا پہلو اس قدر شدید ہوجاتا ہے کہ نظم میں مایوسی اور ناامیدی کی فضا حاوی ہونے لگتی ہے۔وقت کے ویران صحرا میں مقید ہونے کا احساس شعور پر غالب آنے لگتا ہے۔پھر وقت کے اس صحرا میں چند تصویریں نمودار ہونے لگتی ہیں۔اب جبر اختیار میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ناامیدی کے اندھیرے چھٹنے لگتے ہیں۔انسان کی کم مائیگی کا رنگ ماند پڑنے لگتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات ودوام
جس کو کیا ہے کسی مرد خدا نے تمام

دوسرے بند میں اقبال نے عشق حقیقی پر فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔اقبال کا یہ تصور عشق روایتی نہیں ہے بلکہ یہ اردو شاعری کے مروجہ تصور عشق سے قطعاً منفرد ہے۔یہ تصور عشق متحرک اور فعال ہے۔یہ بے پناہ قوت اور خلاقانہ صفت کا حامل ہے۔دوسرے بند کو اقبال پہلے سے مربوط کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ اگر چہ کسی بھی شئے کو دوام نہیں ہے اور ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے لیکن جس نقش یا شئے کو مرد مومن نے مکمل کیا ہو یعنی بنایا ہو وہ کبھی فنا نہیں ہوتی اور اسے دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس دوام کا سبب یہ ہے کہ مرد مومن کا کوئی بھی عمل لازوال عشق حقیقی کے ذریعے فروغ پاتا ہے اور اس میں اس کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ عشق زندگی کی اصل اور روح ہے۔ عشق لافانی ہے اور موت اس پر حرام ہے۔ مرد خدا کا عمل لافانی اور لازوال عشق کے سبب فروغ پاتا ہے، اس لیے اس کا عمل بھی عشق کی طرح لافانی اور لازوال ہو جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگر چہ زمانے کی لہر بڑی تیز اور تند ہے۔ پیہم گردش میں رہتی ہے اور ہر شئے کو بہالے جاتی ہے یعنی فنا کر دیتی ہے لیکن عشق خود ایک سیل یعنی بہاؤ ہے جو وقت کے تیز و تند سیل کو روک لیتا ہے۔ یعنی عشق کو زمانے کی گردش مٹا نہیں پاتی۔ اقبال کہتے ہیں کہ عشق زمانے کی گردشوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور ان پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

عشق حقیقی کی تقویم میں عصر حاضر کے علاوہ اور بھی زمانے پنہاں ہیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس حقیقت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جو عشق حقیقی سے سرشار ہو۔ عشق حقیقی کے ذریعے عرفان ذات حاصل ہو جاتا ہے اور وہ وقت کا اسیر نہیں رہتا۔ عشق کے 'اصل حیات' ہونے کے تصور کے بعد کائنات کے تمام مظاہر اور تمام تصورات عشق کے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں اور اب وقت کے بجائے عشق کائنات پر غالب آنے لگتا ہے۔ وقت جو اس قدر مہیب اور جابر ہے، عشق اس پر بھی غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ وقت کے کبھی نہ رکنے والے سیل کو عشق کا سیل بہالے جاتا ہے:

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال عشق حقیقی کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عشق انتہائی پاکیزہ ہے اور اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اقبال نے اسے دم جبرئیل اور دل مصطفیٰ ﷺ سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ عشق نفس جبرئیل ہے یعنی حضرت جبرئیل کی قوت اور پاکیزگی عشق کی بنا پر ہے (حضرت جبرئیل کی تخصیص اس لیے کی ہے کیوں کہ وہ ملائکہ میں سب سے افضل ہیں اور نبیوں اور رسولوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اللہ نے انہیں خاص طرح کی قوت عطا کی ہے) اور یہ عشق رسول ﷺ کا دل ہے جو خدا کے عشق سے لبریز تھا اور کامل پاکیزہ جذبوں اور نور الٰہی سے مزین تھا۔ عشق کی بدولت ہی یہ کائنات وجود میں آئی اور اللہ کا رسول اور اللہ کا کلام معرض وجود میں آئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی عشق حقیقی کے جذبے کی بنا پر انسان کو سر بلندی اور عظمت ملی ہے۔ انسانی زندگی کی روحانیت اور تابناکی عشق کی ہی مرہون منت ہے۔ عشق ہی صہبائے خام ہے اور عشق ہی کاس الکرام ہے۔ عشق ہی کی بدولت صہبائے خام میں لذت ہے اور ساقی کا ایسا پیالہ ہے جس سے سب اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہوتے ہیں۔

عشق ہی کعبہ کا فقیہ ہے جو شرعی اور مذہبی معاملات میں لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق ہی خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا امیر اور سپہ سالار ہے۔ عشق ایک ایسا مسافر ہے جس کے ہزاروں مقام ہیں یعنی اس کے ظاہر ہونے کی بے شمار شکلیں ہیں۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کے مضراب سے زندگی کے ساز کے تاروں میں نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کو

منور کرتا ہے یعنی اسی کی بدولت انسان بلندی اور عظمت حاصل کرتا ہے اور یہی زندگی میں جوش وخروش بھر کر اسے متحرک اور فعال بناتا ہے۔

تیسرے بند تک آتے آتے نظم وقت کے ویران پن کے حصار سے نکل آتی ہے۔ اب زندگی کا احساس واضح ہونے لگتا ہے۔ اقبال فلسفہ حیات پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کا مرد مومن اپنی غیر معمولی قوت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اب وقت کے صحرا میں ظاہر ہونے والی انسانی تصویر حرکت کرنے لگتی ہے۔ اقبال عشق کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے مسجد قرطبہ کو مخاطب کرتے ہیں جو حرم کی طرح پاک ہے۔ اے حرم قرطبہ تیرا وجود عشق کی بنیاد پر قائم ہے اس لیے عشق کی طرح تجھے بھی دوام حاصل ہے یعنی تیری تعمیر ان رہروان شوق نے کی ہے جو عشق حقیقی کے جذبے سے سرشار تھے اور ان کے عشق نے جس طرح انہیں دوام بخشا ہے اسی طرح تجھے بھی دوام حاصل ہے۔ زمانہ انہیں نقوش کو مٹا سکتا ہے جن کی تعمیر وتشکیل میں عشق کی کارفرمائی نہ ہو۔

اقبال اس حقیقت سے آگے مزید نقاب کشائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رنگ ہو یا خشت وسنگ یعنی مصوری ہو یا فن سنگ تراشی ہو یا پھر موسیقی ہو یا شاعری، اس کا کمال اور معجزہ یہ ہے کہ اس کی تعمیر وتخلیق میں خون جگر یعنی عشق حقیقی کی کارفرمائی ہو۔ جذبۂ عشق سے عاری فن بے معنی اور ناپائدار ہوتا ہے۔ خون جگر اقبال کے یہاں عشق کے مترادف کے بطور استعمال ہوا ہے۔

اقبال انسان کی عظمت اور شان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ مومن کا دل عرش اعظم کی طرح عظمت رکھتا ہے کیوں کہ مومن کے دل میں خدا جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر چہ انسان کی تخلیق کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ہوئی ہے اور اس کی پرواز کی حد نیلگوں آسمان تک ہے لیکن جب یہ انسان عشق کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے اور اس کا دل حقیقی عشق سے مزین ہو جاتا ہے تو اس کی پرواز حدوں سے آگے نکل جاتی ہے اور وہ اللہ کے جلووں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اس کا دل روشن ہو جاتا ہے اور وہ بذات خود محرم راز درون مے خانہ یعنی دانائے راز بن جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ فرشتوں کو اگر چہ سجدے کی توفیق میسر ہے، وہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں مگر سجدے کے سوز وگداز سے وہ محروم ہیں جو اس کی اصل اور اس کی روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا مرتبہ فرشتوں سے بلند ہے۔

اس بند کے آخر میں اقبال اپنے جذبۂ عشق اور جذبۂ ایمانی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں جو ایک ہندوستانی کافر ہوں، اس کے باوجود اے قرطبہ تو میرا ذوق وشوق دیکھ، میرے دل میں بھی درود وسلام ہے اور میرے لبوں پر بھی درود وسلام ہے۔ میرے ہر رگ وریشے میں عشق سمایا ہوا ہے اور میرے روم روم سے 'اللہ ھو' کا نغمہ گونج رہا ہے۔ اقبال خود کو کافر ہندی اس لیے کہتے ہیں کیوں کہ ہندوستان میں اکثریت غیر مسلم ہے۔ وہ اسلامی ملکوں اور وہاں رہنے والی عوام سے کہنا چاہتے ہیں کہ میں ایک ایسی سرزمین سے ہوں جہاں کفر کا غلبہ ہے لیکن اس کے باوجود میرے جذبۂ ایمانی میں کوئی کمی نہیں ہے، لیکن تمہارے جذبۂ ایمانی کو کیا ہوا ہے۔

اس نظم کے چوتھے بند میں اقبال مسجد قرطبہ کو مخاطب کر کے مرد مومن کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے جلال و جمال سے مرد مومن کا جلال و جمال نمایاں ہوتا ہے۔ تیرا جلال و جمال مرد مومن کے جلال و جمال کی دلیل ہے۔ یعنی تجھے دیکھ اندازہ ہوتا ہے کہ جب تو اس قدر جلیل وجمیل ہے تو تیرے معمار کتنے جلیل وجمیل ہوں گے۔ تیری بنیاد پائدار ہے اور تیرے بے شمار ستون شام کے صحرا میں کھجور کے پیڑوں کی قطاروں کی مانند حسین منظر پیش کرتے ہیں۔ تیرے در و بام پر ایمن کا نور برس رہا ہے اور تیرے منار کی بلندی حضرت جبریل کی جلوہ گاہ ہے جہاں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے:

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل وجمیل تو بھی جلیل وجمیل

تیری بنا پائیدار تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

تیرے در وبام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبریل

اقبال آگے کہتے ہیں کہ اگرچہ اندلس کی سرزمین سے اسلامی سلطنت ختم ہوگئی ہے تاہم ملت اسلامیہ ہمیشہ زندہ وجاوید رہے گی۔ یہ دین ابراہیم اور دین موسیٰ کے پیغام کی محافظ ہے۔ اس کی اذانوں میں اللہ کا نام گونجتا رہے گا۔ ایمان والوں کے لیے زمین وآسمان کے کوئی حدود نہیں ہیں۔ دجلہ، دینوب اور نیل اس کے جذبہ کی موجیں ہیں یعنی یہ سب اس کے جذبہ ایمانی کی گواہ ہیں۔ مرد مومن ایک ایسا سپاہی ہے جس کی زرہ لاالہ ہے۔ وہ صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔ شمشیر کے سائے میں وہ صرف اللہ کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔

نظم کا پانچواں بند چوتھے بند سے مربوط ہے۔ اقبال مزید مرد مومن کے اوصاف اور صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ مسجد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مسجد قرطبہ تیری عظمت اور شان دیکھ کر بندۂ مومن کا جذبۂ عشق، اخلاص، اس کے شب وروز کی حقیقت اور اس کا ناز ونیاز اور اس کے عزم وحوصلے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے دن عشق سے سرشار ہوکر تب وتاب میں گزرتے ہیں اور رات یاد الٰہی میں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اور ناز

اقبال کہتے ہیں کہ مرد مومن صفات الٰہیہ سے متصف ہوکر روحانی قوتوں کا حامل ہوجاتا ہے۔ دراصل یہ حدیث قدسی کا مفہوم ہے جس کو اقبال نے شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ جب بندہ اللہ کا قرب حاصل کرلیتا ہے تو اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ، اس کی آنکھیں اللہ کی آنکھیں، اس کا کان اللہ کا کان اور اس کی زبان اللہ کی زبان ہوجاتی ہے یعنی اعضا مومن کے ہوتے ہیں لیکن اس کے اعضا سے اللہ اپنا فعل جاری کرتا ہے۔ بندہ اپنے رب کا تقرب حاصل کرلیتا ہے اور اس مرتبے پر فائز ہوجاتا ہے کہ وہ اللہ کے پسندیدہ کاموں کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ایمانی قوت سے کائنات کو مسخر کرلیتا ہے۔ بظاہر انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے لیکن وہ ایمانی قوت اور جذبۂ عشق کی بنیاد پر خدائی صفات کا حامل ہوجاتا ہے اور اس کا دل دنیا کی خواہشات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ خواہشات کے پیچھے نہیں بھاگتا بلکہ اللہ کی خوشنودی اور رضا کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کی خواہشات اور

امیدیں بہت قلیل یعنی کم ہوتی ہیں جب کہ اس کے مقاصد بہت عظیم اور غیر معمولی ہوتے ہیں۔ وہ انسان دوست، سخی دوسروں کی مدد کرنے والا، دلوں کو جیتنے والا اور خوش اخلاق ہوتا ہے۔ وہ جب گفتگو کرتا ہے تو اس کے لہجے میں بہت نرمی ہوتی ہے اور جب وہ تلاش حق میں نکلتا ہے تو پورے جوش وخروش اور سرگرمی کے ساتھ نکلتا ہے۔ وہ اپنوں کے لیے نرم خو اور باطل کے سامنے غضبناک ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے قانون اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے کسی بھی حال میں تجاوز نہیں کرتا۔ خواہ بزم ہو یا جنگ کا میدان ہو، ہر جگہ اس کا دل بغض وعناد سے پاک اور اس کی نیت خالص ہوتی ہے۔ مرد مومن کا یقیں ہی ایسا مرکز ہے جس کی وجہ سے رضائے الٰہی دوسروں کا نصب العین بنتی ہے۔ اس کے یقین کے سوا یہ تمام کائنات محض وہم وخیال اور فریب ہے۔ مرد خدا ہی عقل کا سرچشمہ ہے اور یہی عشق کا حاصل ہے۔ کائنات کی محفل کی تمام تر رونق اور رعنائی اسی کے دم سے ہے۔ اقبال نے اس بند میں اولیاء اللہ اور صالحین کے اوصاف بیان کیے ہیں۔

چھٹے اور ساتویں بند میں اقبال مرد مومن کی جہد پیہم اور جذبۂ عشق سے سرشاری کا ذکر کرتے ہیں۔ قرطبہ مرد مومن کی اسی جہد مسلسل اور اسی غیر معمولی جذبے کی علامت ہے۔ وہ پھر تاریخ کے اوراق الٹنے لگتے ہیں اور ان بندگان خدا اور عربی شہسواروں کی عظمت اور شان کو بیان کرتے ہیں جنھوں نے اندلس کی سرزمین کو فتح کیا تھا، اپنے بلند عزائم، جذبۂ ایمانی اور غیر معمولی جرأت کی بنا پر عظیم کارنامے انجام دیے اور اس عظیم مسجد کی تعمیر کی۔ اندلس کی تاریخ اقبال کے ذہن وفکر میں کرب کے احساس کو شدید تر کر دیتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ وہ مردان حق اور مجاہدین جو خلق عظیم کے پیکر تھے اور صدیق وامین تھے، انہوں نے اپنے ایمان اور کردار کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی۔ اللہ نے انہیں وسیع وعریض سلطنتیں عطا کی تھیں لیکن وہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ دراصل حکمرانی یہی ہے کہ داد عیش دینے کے بجائے حاکم خود کو عوام کا خادم سمجھے۔ یہی وہ اہل ایمان ہیں جنھوں نے اہل یورپ کو فکر وشعور عطا کیا اور انہیں علوم ومعارف سکھائے:

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ وروشن جبیں

اقبال کہتے ہیں کہ ان ہی مردان حق نے دنیا کو تہذیب وتمدن اور علم ومعرفت کے خزانے عطا کیے۔ یورپ جو آج دنیا میں ترقی کی بلندیوں پر ہے، انہیں مردان حق کا شعور اہل یورپ کے لیے مشعل راہ بنا ہے۔ وہ نیک دل، کشادہ ذہن اور خوش اخلاق تھے اور اندلس کے رہنے والوں میں آج بھی یہ خصلتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ وہاں کی فضا میں بوئے یمن بسی ہوئی چوں کہ اندلس میں بسنے والے بیشتر باشندے یمنی تھے۔ اور وہاں کے ساز میں لحن حجازی ہے۔

موضوع کی طرح اقبال کی یہ نظم بھی تعمیر اور تشکیل کے مراحل سے گزرتی چلی جاتی ہے گویا ہم اقبال کے فکری اور فنی ارتقا کو تاریخ کے تدریجی ارتقا کے ساتھ پروان چڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال لفظوں کو ایسے پروتے اور اس میں فکری شعور کی آمیزش کرتے چلے جاتے ہیں جیسے معمار یکے بعد دیگرے پتھروں کو جوڑتا چلا جاتا ہے۔

اقبال ماضی کے اوراق الٹتے الٹتے حال میں واپس آ جاتے ہیں اور مسجد کے بے اذان میناروں اور بے صلوٰۃ وخطبات محراب ومنبر کو دیکھ کر انتہائی افسردہ ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں اے قرطبہ تیری زمین ستاروں کی نظر میں آسمان کی مانند بلند ہے لیکن افسوس کہ اس سرزمین پر صدیوں سے اذان کی آواز نہیں گونجی۔ جذبۂ ایمانی اور عشق سے سرشار انقلاب برپا کرنے والوں کا وہ قافلہ کس وادی اور کس مقام پر ہے خدا ہی جانے، جو تیری عظمت رفتہ بحال کرے گا اور تیری بلند میناروں سے اذانوں کی آوازیں گونجیں گی:

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

ساتویں بند میں اقبال نے عہد حاضر یا ماضی قریب میں انقلابی تحریکوں نے جن ملکوں میں انقلاب برپا کیے ہیں ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ اقبال ایک ایسے انقلاب کی آرزو کرتے ہیں جو امت مسلمہ کو راہ راست پر لائے اور اسے دوبارہ عروج بخشے۔ اقبال دنیا کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے عالم اسلام میں بھی انقلاب برپا ہونے کی امید ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جرمنی اصلاح دین کی شورش دیکھ چکا ہے جس نے تمام پرانے اور فرسودہ نقوش مٹا دیے۔ پیر کنشت کی حرمت حرف غلط کی مانند ہوگئی یعنی مذہب سے اس کی اجارہ داری ختم ہوگئی اور لوگ اپنے مذہبی معاملات میں خود ہی غور وخوض کرنے لگے۔ فرانس نے بھی انقلاب کا دور دیکھ لیا جس کے نتیجے میں شخصی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا اور اس انقلاب نے پورے یورپ میں نئے دور کا آغاز کر دیا یعنی جمہوریت کو فروغ دیا۔ رومی جو کہنہ پرستی کے سبب بوڑھے ہو چکے تھے وہ بھی جدت طرازی کی لذت پا کر جوان ہو گئے۔ اقبال کہتے ہیں یہ امت مسلمہ بھی اضطراب سے دوچار ہے۔ کچھ بے قراری سی نظر آتی ہے جو کہ طوفان اور انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اس بے قراری اور اضطراب کا کیا نتیجہ ظاہر ہوگا وہ خدا ہی جانتا ہے۔ اس راز کا علم صرف خدا کو ہے۔ یہ زبان کچھ کہنے سے عاجز ہے۔ سمندر میں اضطراب تو ہے اور ایسا لگتا ہے کہ طوفان برپا ہونے والا ہے لیکن اس کی تہہ سے کیا ظاہر ہوگا اور آسمان کیا رنگ بدلے گا، اس کا علم خدا کو ہی ہے۔ امت مسلمہ کے لیے اقبال نے سمندر کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ امت مسلمہ میں اضطراب ہے۔ اس میں بیداری آ رہی ہے لیکن دیکھتے ہیں کہ یہ اضطراب کیا انقلاب لے کر آئے گا، امت اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر پائے گی یا نہیں۔

دراصل شاعر پھر سے وقت کے سیل رواں کے کنارے کھڑا ہو جاتا ہے اور حال کے اس سیل رواں میں بہہ جانے کی خواہش کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ وقت کی گردش میں پھر ماضی کو تلاش کرنے لگتا ہے۔ ہر شئے وقت کے سمندر میں ڈوبنے لگتی ہے اور وہ ہے وقت جو ہر انقلاب اور کوشش کو کامیاب اور ناکام بناتا ہے۔

آٹھویں بند میں اقبال دریا کے کنارے غروب آفتاب کا وہ منظر پیش کرتے ہیں جہاں سے نظم کا آغاز ہوتا ہے۔ پہاڑ کی وادی میں آسمان کے کنارے شفق کی سرخی چھائی ہوئی ہے مانو آفتاب لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا ہو۔ بدخشاں افغانستان کا ایک خطہ ہے جہاں کے لعل مشہور ہیں۔ شفق کی سرخی کو لعل بدخشاں سے تشبیہ دی ہے۔ شام کے اس دھندلکے اور اس دلفریب منظر میں کسان کی بیٹی کا سادہ مگر پرسوز نغمہ گونجتا ہے جو فضا کو نغمہ

ریز کر دیتا ہے۔ جوانی کا زمانہ دل کی کشتی کے لیے ایک سیلاب کی مانند ہے جو اسے بہالے جاتا ہے یعنی عہد شباب میں ایسی نغمہ سنجی سننے والے پر بے حد اثر کرتی ہے۔

نظم وقت کے فلسفے سے شروع ہو کر وقت کے پراسرار منظر پر ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وقت کا دھندلکا جس کے سحر میں ہر شئے گم ہوتی نظر آتی ہے۔ نیم تاریکی میں وقت کے ساتھ دریا بہہ رہا ہے اور شاعر حال کے گزر جانے کا منتظر ہے۔ وہ طلوع صبح نو کے آثار دیکھ رہا ہے:

آب روان کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

آگے اقبال کہتے ہیں کہ اگر میں افکار کے چہرے سے پردہ اٹھادوں اور پیشین گوئی کر دوں تو یورپ میری ان نواؤں کی تاب نہ لا سکے گا۔ اقبال یورپ پر مسلط ہونے والے زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اقبال جس عہد میں اپنے افکار کا اظہار کر رہے تھے وہ یورپ کے عروج کا دور تھا۔ دنیا کی بیشتر قوموں اور ملکوں کو یورپین ریاستوں نے محکوم بنا رکھا تھا اور اقبال ان کے خلاف دبی آوازوں اور بغاوتوں کو محسوس کر رہے تھے۔

اس آخری بند میں اقبال فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے امت مسلمہ کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ جو قوم اپنی فکر اور اپنے عملی رویوں میں تبدیلی کے عمل سے غافل ہے وہ زندگی کی حرارت محسوس نہیں کر سکتی۔ زندگی کی روح حرکت و عمل میں ہے۔ زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم کا نام ہے۔ زندگی کی اصل انقلاب کی کشمکش میں ہے۔ جو قوم ہر لمحہ اپنا محاسبہ کرتی ہے اس کی حیثیت دست قضا میں شمشیر کی مانند ہے۔ جن نقوش میں خون جگر شامل نہ ہو وہ نامکمل ہی رہتے ہیں۔ اسی طرح خون جگر کے بغیر نغمے محض سودائے خام بن جاتے ہیں۔ یعنی عشق، اخلاص اور حرکت و عمل کے بغیر سب بے کار اور بے معنی ہے۔

نظم ایک یقین پر اختتام پذیر ہوتی ہے گویا یہی اس کی آخری منزل ہے جس کی تلاش میں شاعر ماضی، حال اور مستقبل کے صحراؤں میں بھٹکتا ہے۔ یہ یقین سخت ترین تاریکی اور وقت کی خوفناکی میں امید بن جاتا ہے۔ جبر میں اختیار کی شمع روشن ہونے لگتی ہے۔

اقبال نے اس نظم میں تصور حیات اور فلسفۂ وقت پر حکیمانہ گفتگو کی ہے۔ عشق حقیقی اور مرد مومن کا تصور بھی اس نظم میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس نظم میں اقبال کا فکری عکس نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اقبال نے دلکش پیرائے میں موضوع کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ فنی محاسن کے اعتبار سے بھی یہ نظم آراستہ نظر آتی ہے۔ دلکش تشبیہیں، نادر استعارے اور موزوں تلمیحیں استعمال کر کے اقبال نے نظم کو بہت موثر بنا دیا ہے۔

6.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' اپنے موضوع، اپنی فکری اور فنی خصوصیات، طرز اظہار اور تاثر کے لحاظ سے ایک منفرد نظم ہے۔ یہ ایک علامتی نظم ہے۔

☆ مسجد قرطبہ کو علامت بنا کر اقبال نے ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کی داستان بیان کی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں زندگی کی حقیقت،

وقت کے جبر، حرکت وعمل، تصور عشق اور فلسفۂ وقت پر حکیمانہ گفتگو کی ہے۔

☆ ''مسجد قرطبہ'' اقبال کی مشہور زمانہ نظم ہے جو ان کے شعری مجموعے بال جبریل میں شامل ہے۔ اس نظم کی فضا علامتی ہے۔ اس نظم میں ایجاز، علامتی پیرایۂ اظہار، استعاراتی اسلوب، جاہ وجلال، حسن و جمال، اظہار، مرقع سازی، وسعت فکری، اور فنی کاریگری سب یکجا ہوگئی ہیں۔ اس کا شمار اقبال کی شاہکار نظموں میں ہوتا ہے۔

☆ اس نظم میں وقت کے جبر، عشق کے دوام اور زندگی کے پیہم رواں ہونے کا تصور ملتا ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اجتماعیت، رجائیت اور قومیت کا تصور پیش کیا ہے۔ وقت کے مجرد تصور کے ساتھ عشق کی غیر معمولی قوت اور اس کی دائمی بقا کا اظہار کیا ہے۔ نظم ''مسجد قرطبہ'' میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم قصیدے کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

☆ یہ نظم ایک عہد کی تہذیب وتمدن اور اس عہد کے اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اقبال نے فلسفیانہ اور حکیمانہ طرز اظہار اختیار کیا ہے۔ وقت کی برتری، عشق کی لازوال قوت اور اس قوت سے سرشار بندۂ مومن کا جذبۂ ایمانی جس کے آگے ہر شئے مسخر ہو جاتی ہے، کو خاص طور سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆ یہ نظم قاری پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ نظم کے مطالعے سے وہ منظر آنکھوں کے سامنے ظاہر آجاتا ہے جس کا تاثر اس نظم کی تخلیق کا محرک بنا ہوگا۔ اندلس کی سرزمین ہے، شام کا وقت ہے اور تاریکی گہری ہوتی جارہی ہے، شاعر کے سامنے امت کی عظمت رفتہ کی امین ایک عظیم تاریخی مسجد ہے جو صدیوں سے بے اذاں ہے۔

☆ اقبال کے ذہن میں یادیں گھر کرنے لگتی ہیں، خیالات کی موج بے کراں انگڑائی لینے لگتی ہے اور اقبال اس کے سیل کے ساتھ بہتے ہوئے اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جس میں یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ تاریخ کے اوراق الٹتے چلے جاتے ہیں اور یہ مسجد اس عہد کے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی، اخلاص اور عشق حقیقی میں ان کی سرشاری کی علامت بن جاتی ہے۔

6.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
حریر	:	ریشم
زیروبم	:	اتار چڑھاؤ
کہن	:	پرانا، قدیم
سبک سیر	:	تیز رفتار
سیل	:	بہاؤ
صہبا	:	سرخ شراب
کاس	:	پیالہ
جنود	:	جند کی جمع بمعنی فوج، لشکر

ابن السبیل	:	مسافر
خشت	:	اینٹ
چنگ	:	ایک قسم کا باجا
نمود	:	ظہور، عیاں، نمائش
دہقاں	:	کسان
نوا	:	آواز، لے، راگ
کشود	:	کھول (کھلنا)
سپہر کبود	:	نیلا آسمان
سر	:	راز
گردوں	:	آسمان
کنشت	:	عیسائیوں کی عبادت گاہ

6.5 نمونہ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مسجد قرطبہ کس ملک میں ہے؟

2۔ مسجد قرطبہ کا سنگ بنیاد کس نے رکھا تھا؟

3۔ نظم مسجد قرطبہ کس شاعر کی تخلیق ہے؟

4۔ نظم مسجد قرطبہ میں کتنے بند ہیں؟

5۔ نظم 'مسجد قرطبہ' کس سنہ میں لکھی گئی؟

6۔ اقبال کس کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے؟

7۔ اقبال نے کس سنہ میں نظم ''مسجد قرطبہ'' تخلیق کی تھی؟

8۔ اقبال نے میڈورڈ یونیورسٹی میں کس موضوع پر لکچر دیا تھا؟

9۔ اندلس کو کس جرنیل نے فتح کیا تھا؟

10۔ اقبال کس سنہ میں اندلس پہنچے؟

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کے 'تصور مرد مومن' پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ اقبال کی فکری تشکیل میں کن عناصر نے بنیادی کردار ادا کیا؟ واضح کیجیے۔

3۔ شامل نصاب نظم ''مسجد قرطبہ'' پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

4۔ نظم 'مسجد قرطبہ' کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

5۔ اقبال کی نظم گوئی کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کی نظم گوئی پر اظہار خیال کیجیے۔

2۔ اقبال کے فلسفۂ وقت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ''مسجد قرطبہ'' کا تجزیہ اپنے لفظوں میں کیجیے۔

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	کلیات اقبال	محمد اقبال
2۔	بال جبریل (شعری مجموعہ)	محمد اقبال
3۔	ضرب کلیم	محمد اقبال
4۔	ارمغان حجاز	محمد اقبال
5۔	اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم
6۔	فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم

اکائی 7 : نظم ''طلوعِ اسلام'' کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		اقبال کا تصور اسلام
7.3		نظم ''طلوعِ اسلام'' کا متن
7.4		نظم ''طلوعِ اسلام'' کا تجزیہ
7.5		اکتسابی نتائج
7.6		کلیدی الفاظ
7.7		نمونۂ امتحانی سوالات
	7.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	7.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	7.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
7.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

علامہ اقبال نہ صرف برصغیر بلکہ پورے دنیائے ادب میں ایک ممتاز فلسفی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کر کے ادبی وفنی سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔اقبال نہ صرف شاعر ہیں بلکہ مفکر اور دانائے راز بھی ہیں۔وہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے مقصد کے قائل تھے۔دیکھا جائے تو شعروفن کا انسانی زندگی کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہوتا ہے،اس کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر اقبال کو کسی فلسفیانہ نظریے اور تصور کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ خود اپنے مطالعے اور فکر سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔

اس اکائی میں ہم علامہ سر محمد اقبال کی شعر گوئی کے آغاز کے حوالے سے جانکاری حاصل کریں گے۔اقبال کے تصور اسلام کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔اس کے علاوہ نظم ''طلوعِ اسلام'' کی تشریح اور تجزیہ پڑھ کر،اقبال کے فن اور فلسفے سے بھی واقفیت حاصل کریں گے۔نیز یہ بھی معلوم کریں گے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے کس انداز سے امت مسلمہ کو متحرک کرنے کی سعی کی۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اقبال کے نظریہ اسلام کو بیان کر سکیں۔

☆ نظم ''طلوع اسلام'' کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔

☆ نظم ''طلوعِ اسلام'' کا تجزیہ کر سکیں۔

7.2 اقبال کا تصور اسلام

علامہ اقبال اسلامی ماحول میں پیدا ہوئے اور اسی میں نشو ونما پائی۔ ان کی روح میں سوز عشق اسلامی ہے۔ دین اسلام ایک مکمل نظام حیات اور ضابطہ زندگی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دین ہدایت پر مشتمل ہے۔ اسلام کی تفہیم کے حوالے سے بات کی جائے تو سب سے بہترین طریقِ کار خود حضرت محمد ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ملتا ہے۔

اسلامی فکر کی تفہیم میں اقبال کو واقعی بصیرت کامل حاصل ہے۔ اقبال کی فکر میں اسلام کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال نہ صرف پیامبر شاعر اور فلسفی تھے بلکہ انہوں نے ہمت و جرأت، عمل پیہم، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر ایمان باللہ اور خدمتِ اسلام کی بھی دعوت دی۔ انہیں اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر غیر متزلزل یقین تھا۔ ان کے نزدیک فرد کی زندگی میں کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا تعلیمات اسلام پر کاربند رہنا۔ نظم ''زہد و رندی'' میں اقبال کے متعلق ایک مولوی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا:

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

اقبال نے مذہبی عقائد کو جس انداز سے پیش کیا، وہ عام ملاؤں اور فقیہوں کے انداز سے الگ ہے اور یہ انوکھا انداز اقبال کے اندر آخر تک قائم رہا۔ اس انوکھے پن کی وجہ سے وہ شروع ہی میں یہ کہتے نظر آتے ہیں:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلماں ہوں میں

اقبال کے نزدیک اسلام ہی انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل کرتا ہے اور فاشزم، کمیونزم یا دورِ حاضر کے دیگر خود ساختہ نظریات حیات اسلام کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو پوری انسانیت کے لیے ہر نقطۂ نظر سے باعثِ نجات ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اسلام اور اس کے دیے ہوئے آئینِ حیات کو دنیا کے سارے سیاسی مسائل و معاشرتی افراتفری اور الجھنوں کا واحد حل سمجھا ہے۔ اقبال کو اسلام سے بہت گہری ذہنی و جذباتی وابستگی تھی۔ اقبال نے مسلمانوں کے اندر اس احساس کو پیدا کیا ہے کہ اسلام کوئی فرسودہ اور از کار رفتہ نظام نہیں ہے جو اس زمانے میں کام نہ کر سکتا ہو، بلکہ انہوں نے اپنے کلام سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ اسلام ازلی اور ابدی اصولوں کا حامل دین ہے۔ اقبال نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر مثبت طور پر کہا کہ تمہاری مصیبتوں اور پریشانیوں کا اگر کوئی حل ہے تو وہ

صرف یہ ہے کہ تم قرآن کی پیروی کر کے اپنی زندگیوں پر اسلام کے دستور اور آئین کو نافذ کرو۔

علامہ اقبال ابتدا ہی سے مختلف نظریات اور افکار سے باخبر رہے ہیں البتہ اسلام ان کی رگ رگ میں بس گیا تھا۔ اقبال کے مطابق اسلام سے وابستگی کا مطلب یہ نہیں کہ جنت ملے بلکہ ان کے عقائد کے پیشِ نظر یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ مسلمان کو بے غرض دیکھنا چاہتے تھے۔ بے غرض کا مطلب یہ کہ مسلمان کا ہر عمل خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہو دینوی فائدے حور و قصور کے لیے نہ ہو۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام ایک حرکی (Dynamic) دین ہے۔ اس لیے انہوں نے اسلام کو مسلمانوں کی زندگی کے لیے ایک فعال قوت کے طور پر پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اقبال کے پورے کلام کو دیکھا جائے تو اس کی اساس اسلام اور قرآن پر ہی استوار نظر آتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو چار عناصر سے متصف ہونے کی تمنا کر کے فرمایا:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اسلام اعتدال کا مذہب ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام ایک عملی، روشن خیال اور ترقی پسند دین ہے، جب کہ جاہل پیروں کا دین نظام خانقاہی پر استوار ہے۔ 29 دسمبر 1930 کو علامہ اقبال نے الٰہ آباد کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے مصائب و مشکلات کے باوجود مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ انہوں نے اسلام کے جمود کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ اس کے اندر موجود اجتہاد کی خوبیوں کے قائل رہے ہیں۔

اقبال کے پیشِ نظر اساسی اور ابدی اسلام قرآن میں موجود ہے۔ اقبال کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ مسلمانوں کے دل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ایک جماعت ہو جو ذی علم اور صاحب دل ہو اور جذبۂ ایثار اپنے اندر رکھتی ہو۔ اقبال کے نزدیک اسلام ہمیں رسمِ محبت کو عام کرنے کے لیے نہیں جگا رہا ہے بلکہ اس کی فضیلت کچھ اور ہی ہے۔ جیسے علامہ اقبال کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے:

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری محبت کی فراوانی

اقبال کہتے ہیں کہ محبت کی فراوانی اور جہاں گیری کا نام ہی اسلام ہے۔ اقبال کے مطابق مسلمانوں کے غلط نمائندے یعنی ملا نے اس دین کو اتنا تنگ کر دیا کہ فقہی اور فروعی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے ہاں کھانا پینا، شادی بیاہ ممنوع ہوگئی اور جن مکتبوں میں ایسی تعلیم رائج ہوگئی، ان کے بارے میں یوں گویا ہیں:

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے

اچھے زمانوں میں انہیں مکتبوں اور خانقاہوں کی بنا پر غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، لیکن آج کل انہیں کی وجہ سے خود

مسلمان بھی ان سے دور بھاگ رہا ہے، کیوں کہ اب ان خانقاہوں میں غیر اسلامی طور وطریقے نے جنم لیا ہے اور وہاں اب صرف قوالیاں ہوتی ہیں اور کرامات کا بیان فروخت کیا جارہا ہے، اب صرف ذکر کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے اور فکر سے اجتناب کیا جارہا ہے۔ اقبال ان سے خفا ہیں اور کہتے ہیں:

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

اسلام جمود کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ خانقاہوں میں مردے کی طرح بیٹھنے کا نام ہے، بلکہ اسلام زندگی میں حرارت پیدا کرنے کا نام ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام سراپا حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔

اقبال کی فکر اسلام کے رنگ میں رنگی تھی۔ اس لیے اقبال شناسوں کے نزدیک فکر اقبال کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس اسلام پر استوار ہے۔ ان کی شاعری میں تنوع تو ہے لیکن اس کی اساس قرآن اور اسلام پر ہی استوار ہے۔ ان کے نزدیک اسلام اور اس کا دیا ہوا دستورِ حیات دنیا کے تمام سیاسی ومعاشی مسائل اور خلفشار کا واحد حل ہے۔ انہوں نے دین اور سیاست کو شانہ بشانہ چلانے کے لیے اپنے پیغام سے ملت کو آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ مشہور شعر زبان زد خاص وعام ہے:

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سے سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلام صرف فرائضِ پنجگانہ کو ادا کرنے کا درس نہیں دیتا بلکہ یہ زندگی گزارنے کے تمام طریقوں اور اصولوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے جگہ جگہ اپنے کلام میں قرآن کو پیش کیا۔ انہیں قرآن سے اس قدر لگاؤ تھا کہ ہر مجلس اور کانفرنس میں قرآن کو ہی سب پر مقدم رکھتے تھے۔ چناں چہ اقبال جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے جارہے تھے تو ہندوستان ٹائمز کے ایک نمائندے نے ان سے کہا کہ وہ کیا خاص بات لے کر اس کانفرنس میں شریک ہونے جارہے ہیں۔ تو اقبال نے ان سے کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں، لیکن قرآن ہے، میں اسی کو پیش کروں گا۔ اقبال کہتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال قرآن کے دماغ سے سوچنے اور قرآن کی نظر سے دیکھنے والے مفکر شاعر ہیں۔ وہ قرآن میں غوطہ زن ہونے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ مسلمان کی زندگی میں ایک نیا پن ظاہر ہوجائے۔ وہ اپنے ضمیر پر ہمہ وقت قرآن کے نزول کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک مسلم کو اگر اس دنیا میں زندہ رہنا ہے تو وہ بغیر قرآن کے ناممکن ہے۔ اقبال نے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ ان کے مصائب کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کی پیروی کریں اور اپنی زندگیوں میں اسلام کے آئین کو نافذ کریں۔ اقبال کو اس معاملے میں مضبوط عقیدہ اور حق الیقین تھا کہ قرآن بغیر قیود زمان ومکان ہدایت اور رہبری کا ایک منبع ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو ہر ماحول میں ایک نیا عالم پیدا کردیتی ہے۔ وہ ہر زمانہ کے مطابق حق اور ہدایت کے اصول فراہم کرتی ہے۔ اقبال کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کی حقیقی فلاح وبہبود قرآنی تعلیمات سے وابستہ ہے۔ اس

لیے اگر وہ اس کے احکام کے پابند رہیں گے تو زمانہ پر فتح پا سکتے ہیں۔

اقبال نے اسلام کے پیش نظر جو باتیں بتائی ہیں، ان میں اس کا پہلا رکن ادائیگی نماز ہے۔ مگر آج اسی سے لگ بھگ ہر مسلمان بیگانہ نظر آتا ہے۔ نماز صرف اخلاق اور مذہب ہی کی درستی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ملت کی شیرازہ بندی اسی سے ممکن ہے۔ اسی کی بدولت اتحاد ملت اور عالمگیر اخوت کا پرچار کیا جا سکتا ہے۔ اسی کی وجہ سے امتیازی برتری و کمتری کو دور کیا جا سکتا ہے۔ یہی نماز ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اقبال کے نزدیک انسانوں میں اتحاد کے لیے فقط اسلام ہی ایک مضبوط لائحہ عمل ہے۔ وہ جب بھی اسلام کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ سے ان کی مراد روحانی نظام ہی ہے۔ اسلام اور مسلم اقبال کے لیے خاص اصطلاحات تھیں جن کو وہ اپنے کلام میں کئی جگہ استعمال کر چکے ہیں۔ اقبال نے اسلامی ممالک، اکابرینِ اسلام اور ان کے کارناموں، تعمیرات، متبرک مقامات، بلاد عربیہ اور ملت اسلامیہ سے متعلق کئی موضوعات کو اپنے کلام سے آراستہ کیا۔ اسلام سے اقبال کو نہایت محبت تھی۔ ملی جذبے کے تحت دلی، بغداد، حجاز، قرطبہ، قسطنطنیہ اور مدینہ، غرض سب کی عظمتوں اور رفعتوں کا پرسوز تذکرہ کیا۔

اقبال کے نزدیک قوم یا ملت کی بنیاد رنگ، نسل، زبان یا وطن نہیں بلکہ نظریۂ توحید ہے۔ اسلام نسلی، خاندانی، لسانی، علاقائی اور باقی تمام تعصّبات کا قلع قمع کر کے ایک عالمگیر برادری کو قائم کرتا ہے۔ اقبال نے انہیں چیزوں کو پیش کر کے اسلام کو نا قابل تفہیم اکائی سمجھا ہے اور یہ بتایا کہ اس میں امتیازات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ان کے مطابق اس میں نہ شیعہ سنی ہے اور نہ ہی کوئی وہابی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی درس دیا کہ سب مل کر آگے بڑھیں اور طبقاتی امتیازات اور فرقہ بندی کے بت کو ہمیشہ کے لیے توڑ ڈالیں۔ نظریہ اسلام کے پیش نظر اقبال کا پیغام یہی ہے کہ توحید کے ذریعے کالا گورا بن کر اس کا ہمسر بن جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام اور قرآن کی عملی تفسیر خود حضور ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ یہی وجہ سے کہ اقبال سچے عاشقِ رسولؐ کی مانند اسلام کی خاطر داری اور آبیاری کرتے رہے۔ اقبال اسلام کی حقیقت اور حضور پرنورؐ کے پیغام سے آشنائی حاصل کر چکے تھے۔ اقبال نے ضربِ کلیم میں ''اسلام'' کے عنوان پر ایک نظم لکھی ہے، جس سے اسلام کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے:

روح اسلام کی ہے نور خودی نار خودی — زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصل نمود — گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر — دوسرا نام اسی دین کا ہے ''فقرِ غیور''

اقبال نے اسلام کی حقیقت بیان کرتے ہوئے دین اسلام کا دوسرا نام ''فقرِ غیور'' رکھا ہے۔ اس فقر سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مسلمان کی یہ شناخت ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے سربسجود نہیں ہوتا۔ اسلام سے ہی فقر کی شان پیدا ہوتی ہے۔ اقبال کی فکری اساس اسلام اور قرآن پر استوار ہے۔

اقبال کے نزدیک اسلام مسلمانوں کی پناہ گاہ ہے اور اسلام ہی کے ذریعے مسلمانوں کی زندگی قائم رہ سکتی ہے۔ اقبال کے کلام میں اسلام سے مراد امن و سلامتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے اقبال جس نظام کو چاہتے تھے وہ اسی امن و سلامتی والے اسلام میں انہیں نظر آتا ہے۔ اس لیے انہوں نے

اپنے غور وفکر اور تلاش وتحقیق سے دینِ فطرت کی صداقت کو بھی حاصل کیا تھا۔ یہ وہ دینِ فطرت ہے جس کو نازل کرنے والا خالق کائنات ہے اور جسے آخر میں پیغمبر آخر الزمانؐ نے تکمیل تک پہنچایا۔ یہی وہ دین حق ہے جسے اقبال نے اپنی فکر کا منبع، روح کا سکون اور اپنے دل کی دھڑکن کے طور پر پیش کیا ہے۔

دیکھا جائے تو اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ ملت اسلامیہ سے وابستہ ہے۔ غرض یہ کہ اقبال خود مسلمان ہیں اور اس تمام عالم کو اسلام ہی کے زیر سایہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس کے ذریعے دنیا کی نجات ہوسکتی ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ انسانیت، صداقت اور حقیقت کا آسان ترین راستہ اسلام ہی ہے۔

7.3 نظم ''طلوعِ اسلام'' کا متن

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تُنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا ،گیادورگراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے — شکوہ ترکمانی ، ذہن ہندی ، نطق اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل ! — نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں — جدا پارے سے ہوسکتی نہیں تقدیر سیمابی
وہ چشم پاک بیں کیوں زینت برگستواں دیکھے — نظر آتی ہے جس کو مرد غازی کی جگر تابی

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کردے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترک شیرازی دل تبریز وکابل را — صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز وساز زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گردراہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی ،مکیں آنی ، ازل تیرا ، ابد تیرا خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا تری نسبت براہیمی ہے ،معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا،عدالت کا،شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہاں گیری ، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی ، نہ افغانی
میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک! ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
گمان آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر،صدق سلمانی
ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری یہ سب کیا ہیں،فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شئے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے ، مشربِ نابے
دلِ گرمے ، نگاہِ پاک بینے ، جانِ بیتابے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہگذر ہیں ،کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورتِ گرتقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہوجا، خدا کا ترجماں ہوجا

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا

غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہوجا

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام وسحر سے جاوداں ہوجا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پر نیاں ہوجا

گزر جا بن کے سیل تندروکوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونین میں تیغ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلس قبایان تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
''پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را

بیاساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد　　بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد
کشیدہ ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا　　صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد
سرت گردم توہم قانونِ پیشیں سازدہ ساقی　　کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں بر گیرو بیباکانہ ساغرکش　　پس ازمدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدرو حنین آور　　تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیل از خونِ مانمناک میگردد　　ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد
سرخاک شہیدے برگہا ئے لالہ می پاشم　　کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد

''بیاتا گل بیفشانیم ومے در ساغر اندازیم
فلک راسقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

7.4 نظم ''طلوع اسلام'' کا تجزیہ

علامہ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں بانگِ درا کی نظموں میں حیرت انگیز رنگا رنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔انہوں نے مختصر اور طویل نظمیں لکھیں جن کا معیار ان کے اپنے پیش روؤں سے بھی بلند نظر آتا ہے۔ جہاں تک ان کی طویل نظموں کا تعلق ہے۔نظم ''طلوعِ اسلام'' بھی ان کی ایک طویل نظم جو کہ نو بندوں اور بہتر 72 اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم ان کے پہلے مجموعہ کلام بانگِ درا حصۂ سوم کی آخری نظم ہے۔اس کتاب میں تین نظمیں ایسی ہیں جو بلند پایہ اور بلند معیار کی ہیں۔

جیسے شمع اور شاعر،خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام ،ان نظموں کے موضوعات بھی جدا گانہ نظر آتے ہیں ۔ اقبال کا شعری مجموعہ بانگِ درا 1924 میں شائع ہوا۔اقبال نے یہ نظم 1922 لکھی تھی۔انہوں نے اس نظم کو 1923 میں حمایت اسلام کے ایک سالانہ جلسے میں خود پڑھا تھا۔ اقبال ایک فلسفی شاعر اور دانشور کے طور پر ابھرے اور ملت اسلامیہ کا درد ان کے سینے میں پیوست تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ملت اسلامیہ کے عروج وزوال کا حقیقت پسندانہ انداز میں مشاہدہ کر کے اس کے اثرات بھی قبول کیے۔اس نظم سے بھی یہی معلومات فراہم ہوتی کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانی افواج کی کوششوں کو ناکام کر کے ساری دنیا کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ ترک ابھی زندہ ہیں۔ یونانی افواج کو پسپا کر کے بے نظیر شجاعت اور حمیت کا مظاہرہ کیا تھا۔اقبال نے اس واقعے کو اپنے ولولہ انگیز اور پُر جوش الفاظ میں شعری جمالیات کے ساتھ بیان کیا اور اقوام مشرق کو اس نظم کی صورت میں ایک پیغام دیا،جس میں رجائیت (Optimism) کا پیغام نظر آتا ہے۔ چناں چہ علامہ اقبال نے اس وقت کے مغرب کے زوال اور شکست کو مشرق کے عروج کے نقطۂ آغاز کے طور پر سمجھا۔ان کے نزدیک مسلمانوں میں جو عرصۂ دراز سے ذلت اور پستی چھائی ہوئی تھی،وہ اب ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مصطفیٰ کمال کی کامرانی اور فتح کو اسی نظم ''طلوعِ اسلام'' سے تعبیر کیا ہے۔اس لیے اقبال کے نزدیک اگر مسلمان اپنے اندر ایمانی حرارت اور جذبے کو از سرنو پیدا کریں،تو وہ دن دور نہیں جب وہ پوری دنیا کو فتح کر سکیں گے۔اقبال نے نہ صرف مشرقی اقوام کو بلکہ پوری دنیا کو ناامیدی سے اجتناب کرنے اور امید کے ساتھ جینے کا پیغام دیا۔اس لیے انہوں نے اپنے پیغام میں کہا:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

امیداوراعتماد سے ہی قوم ترقی کی راہ پر کامیابی سے ہم کنار ہوسکتی ہے۔اقبال کو یقین تھا کہ مسلمانوں کو پھر سے ترکوں جیسی شان وشوکت، فکر کی فراوانی اور عربوں جیسی تہذیب اور فصاحت و بلاغت نصیب ہوگی۔

نظم کے پہلے بند میں اقبال سورج کے طلوع ہونے کے امکانات کو ظاہر کر کے اس بات کی طرف یہ اشارہ دیتے ہیں کہ صبح نمودار ہونے کے ساتھ ہی غفلت کی نیند ختم ہوگی۔دراصل نیند موت کی علامت ہے جب کہ رات تاریکی اور ظلمت کی علامت ہے۔شب کے آخری لمحات میں ستاروں کی روشنی مدھم پڑنے کے بعد صبح نمودار ہونے لگتی ہے۔دنیا کے لوگ جو گہری نیند میں ہوتے ہیں، آفتاب کے طلوع ہوتے ہی وہ بیدار ہوجاتے ہیں۔مطلب یہ کہ شاعر مدھم ستاروں کے اجالے کو مغربی فکر وفلسفہ اور سورج کی روشنی کو اسلام کی تعلیمات کے مانند سمجھتا ہے۔اسی تعلیم، روشنی اوراس بیداری کی بدولت مشرق کی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم لہو پھر سے گردش کرنے لگے گا۔چوں کہ مسلم اقوام پر یورپی اقوام کا غلبہ تھا اور امت کا اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، علمی اور معاشی طور پر دیوالیہ نکل چکا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کے گہوارے یعنی مشرق کو مردہ قرار دیا گیا تھا، جس میں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ایسے میں اقبال نے عروج کا نعرہ بلند کیا جس کو بڑے سے بڑا حکیم، فلسفی اور طبیب حتیٰ کہ بوعلی سینا اور فارابی جیسے دانشور اور فلسفی بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔مغربی تہذیب اور طوفان نے جتنی تیزی سے اپنی مقبولیت قائم کر کے چھوٹی چھوٹی قوموں بالخصوص مسلم اقوام میں بسنے والوں کو جس طرح مغلوب، مقہور اور محکوم بنایا، اب اس کے مقابلے میں آج مسلم قومیں پوری شدت کے ساتھ ردعمل میں مصروف ہیں۔مغرب کے اسی طوفان کی تیزی سے مسلمانوں میں اسلام سے مزید محبت اور جذبے کو فروغ ملا ہے اور انہیں دوبارہ تعلیماتِ اسلامی سے ہمکناری حاصل ہوگی۔جیسے سمندر کی لہروں کے تیز تھپیڑوں سے ہی قیمتی موتی پلتے اور پرورش پاتے ہیں۔اقبال نے یہاں موتی کو بطورِ استعارہ استعمال کیا ہے۔یعنی مسلمانوں کی دین اسلام کے ساتھ محبت اور وابستگی کی شدت کو بیان کیا گیا ہے۔اقبال امید اور یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اب وہ وقت قریب ہے جب اللہ کی مدد سے مرد مسلمان پھر سے ترکمانی شان، بلند افکار وخیالات اور عربوں جیسی تہذیب، فصاحت اور بلاغت کے حق دار ہوں گے۔اور انہیں پھر سے روشن خیالی نصیب ہوگی۔اس کے باوجود بھی اگر مسلمان اب بھی خواب غفلت میں ہیں اور اگر اب بھی زوال کے آثار نمودار ہو رہے ہیں تو اے اقبال تو اپنے پُر جوش الفاظ اور کلام سے انہیں ان کی خفتگی اور غفلت شعاری سے نجات دلا دے۔یعنی انہیں اس گہری نیند سے بیدار کر۔چاہے اس آواز اور اس نغمے میں تلخی ہی کیوں نہ ہو، جو بے قراری اور اضطرابی کیفیت چمن، آشیاں اور شاخوں میں ظاہر ہوگئی تھی، وہ قائم رہے گی۔مطلب جو جوش اور ولولہ ہمارے اسلاف میں تھا، آج اسی جوش اور جذبے کا پرچار ہونے لگا ہے۔جس کی وجہ سے یہ آزادی کے بالکل قریب ہیں۔اب مسلمانوں میں اسلامی قواعد وضوابط کا پاس ولحاظ موجود اور برقرار ہے۔اس لیے یہ غیر اسلامی تہذیب وتمدن سے متنفر ہیں۔اب یہ ایسے غازی بن گئے ہیں کہ انہیں جنگی ساز وسامان کی ضرورت نہیں۔اب یہ خدائے ذوالجلال سے دست بہ دعا ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں پھر سے تمناؤں، جستجوؤں، امیدوں، جوش اور جذبوں کے چراغ روشن ہوجائیں اور ان میں حقیقی معنوں میں جذبۂ عشق پیدا ہوجائے تاکہ یہ دوبارہ بغیر کسی خوف وخطر دین اسلام کے شیدائی بن جائیں۔

دوسرے بند میں اقبال فرماتے ہیں کہ جس طرح موسم بہار میں بادلوں سے برسنے والے بارش کے قطروں سے پوری زمین میں تازگی پیدا

ہوجاتی ہے اور تخلیقی قوتوں کے اثرات نمودار ہوتے ہیں اور نئی فصل لہلہانے لگتی ہے، بالکل اسی طرح کی حالت اس وقت مسلم اقوام کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی ہے۔یعنی ان کے یہ آنسوں کے قطرے موتیوں سے بھی زیادہ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں پھر سے ایک نئی قوت پیدا ہوگی جس سے دنیا میں فتح ونصرت کے پرچم لہرائے جائیں گے۔مطلب یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی امت سمندر میں پھر سے موتی یعنی (مردِمجاہد) پیدا کرے گی،جن کے ذریعے اسلام کے جھنڈے گاڑھ دیے جائیں گے۔ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور وہ انتشار وافتراق کے شکار ہوگئے تھے۔اب ایک بار پھر وہ باطل طاقتوں کے مقابلے متحد ہونے لگے ہیں اور یکجا ہوکر وہ طاغوتی نظام کے خلاف صف آرا ہوں گے۔پوری امت حصولِ منزل کی خاطر رواں دواں ہے۔ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے جاں باز ساتھیوں نے دلیرانہ اور جرأت مندانہ اقدام سے مسلمانوں کے دل جیت کر ان کو اپنی طرف مائل کیا۔بالکل اسی طرح جس طرح چمن میں چلنی والی ہوا پھولوں کی خوشبو کو اپنا ہم سفر بنا کر چلتی ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوتی ہے۔اس لیے ترکوں کی طرح باقی علاقوں کے مسلمان بھی اب بیداری کے عالم میں قدم رکھ چکے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکوں پر غموں کے پہاڑ ٹوٹے اور اپنے مقام ورتبے کو پانے کے لیے انہوں نے ہر طرح کی قربانیوں کو اپنے سینے سے لگایا،لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ لاکھوں ستاروں کے غروب ہونے سے ہی صبح کی روشنی پھیلتی ہے۔یعنی مشکلات کو جھیلنے اور قربانیوں کے بعد ہی کامرانیاں قدم چوم لیتی ہیں۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اپنے اردگرد کے حقائق کی واقفیت رکھنا کسی ملک کا نظامِ حکومت سنبھالنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔کافی جدوجہد،محنت وریاضت سے بصیرت حاصل ہوتی ہے اور کائنات کے تمام اسرار ورموز سے بھی واقفیت ملتی ہے۔

اقبال نرگس کے پھول کو انسانی آنکھ سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ یہ ہزاروں سال سے بینائی سے محروم رہتی ہے،لیکن اس کے باوجود بھی اسے روشنی نہیں ملتی، بڑی مشکل سے چمن میں کوئی دیدہ ور (صاحب نظر) پیدا ہوتا ہے۔اے بلبل! تو اپنے پرجوش ترانے جاری رکھ تاکہ کبوتر کے نازک اور کمزور جسم میں شاہین کا جگر پیدا ہو۔مراد یہ کہ اے شاعر (اقبال) اب تمہارے لیے یہ ضروری ہے بلکہ ذمہ داری ہے کہ ان بےعمل اور کاہل لوگوں کو اپنے ولولہ انگیز نغموں سے متحرک کرو،تاکہ ان میں مجاہدانہ ومومنانہ جوش اور جذبہ پیدا ہو۔اس مقصد کے لیے یہ اہم ہے کہ اپنے سینے کے راز اپنی قوم کے سامنے آشکار کر،تاکہ یہ بیدار ہوجائیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور حقیقت سے پھر سے آگاہ ہوجائیں،جن کو سمجھنے سے یہ قاصر ہیں۔

تیسرے بند میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان ہی اپنے رب ذوالجلال کا نائب ہے۔کیوں کہ اے مسلمان تجھ میں ہی اللہ کی صفات موجود ہیں اور تو ہی قدرت کاملہ کا مظہر ہے،تیرا ہاتھ گویا اللہ کا ہاتھ ہے جو غالب،کام کرنے والا کاموں کو درست کرنے والا اور کاموں کو آسان کرنے والا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کارکشا کارساز

اس لیے تو بےاعتمادی کا شکار نہ بن تیرے لیے نہایت ہی ضروری ہے کہ تو اپنے اندر یقین اور اعتماد کو بحال کر کے ہر طرح کے شکوک وشبہات سے دور ہوجا۔اس لیے اے مسلمان! اپنی منزلِ مقصود پر جو آسمانوں سے بھی کہیں آگے ہے گہرائی سے غور کر۔تو ایک ایسے بلند مقام کا طلبگار اور حق دار ہے،جس کے سامنے ستارے بھی راہ کی گرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس لیے تو صرف دنیاوی مقاصد کے لیے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ کائنات کو زیر کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔اس لیے اقبال کہتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یہ دنیا اور اس میں رہنے والے سب فانی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عالم امکان فانی ہے، لیکن جذبۂ عشق حقیقی سے سرشاری کی بدولت صرف تو ہی ہے جس کا وجود ازل سے ابد تک باقی رہے گا۔ تیرا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے خدا کا گھر تعمیر کیا تھا۔ اس لیے تیری منصبی ذمہ داری کچھ اور ہے۔ یعنی تجھے ساری دنیا کو تعمیر کر کے اسے منظّم کرنا ہے۔ تو اس کائنات میں بطور امانت دار سرگرم عمل ہے۔ تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کے حقیقی اور باعمل پیروکار کی حیثیت سے لافانی رہے گا۔ تیری ہی وجہ سے دنیا میں پوشیدہ رازوں سے پردے اٹھ سکتے ہیں، کیوں کہ قدرت کاملہ نے تجھے حقائق سے پردے اٹھانے کی صلاحیت بخش دی ہے کہ ملت اسلامیہ کی تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ مسلمانوں ہی کی بدولت سرزمین ایشیاء محفوظ رہی ہے، اور انہیں سے اب قوموں کو بچایا جا سکتا ہے اور بنی نوع انسان کو نفع پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے تیرے لیے اب لازم ہے کہ تو پھر سے اپنے اسلاف کی تعلیمات، صداقت، عدل وانصاف، بہادری، سچائی وغیرہ پر پھر سے عمل پیرا ہو اور وہ صفات خود میں پیدا کرتا کہ تجھ سے دنیا کی رہنمائی کا کام لیا جا سکے، کیوں کہ قدرت نے تجھے ہی اس کے لائق قرار دیا ہے۔ تو ہی انسانوں کو حقائقِ زندگی سے واقف کرا سکتا ہے اور فلاح و بہبود کا سامان فراہم کرا سکتا ہے۔

نظم کے چوتھے بند میں اقبال اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ فطرت کا یہ اصول اور مقصود ہے بلکہ مسلمانی کا راز بھی یہی ہے کہ انسانوں سے مسلمان محبت اور بھائی چارے کے رویے کو پوری دنیا میں عام کریں۔ دیکھا جائے تو تعلیمات اسلام میں بھی اسی پر زور دیا گیا ہے کہ دنیا میں محبت اور انسان دوستی کو بڑھاوا دیا جائے۔ اس لیے اے مسلمانو! تم ان رنگ، نسل اور خون کے امتیاز میں مت پڑو، بلکہ ان بتوں کو توڑ کر ایک ہی ملت بن کر رہو اور اسی میں گم ہو جاؤ۔ کیوں کہ رنگ، نسل اور قوم اتحاد، محبت اور اخوت کے لیے سمِ قاتل سے کم نہیں۔ اتحاد و اتفاق، اخوت اور محبت کے لیے لازم ہے کہ تو اپنی شناخت تورانی، ایرانی اور افغانی کے طور پر نہ کر بلکہ ملت کے فرد کے طور پر تیری شناخت ہو۔ اقبال کا مقصد یہی ہے کہ سب مسلمان ایک ہو جائیں اور علاقائی حدود کو رد کر کے ایک بنیں۔ انہوں نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تو کب تک غیروں کے درمیان اپنی انفرادیت زائل کرتا رہے گا، جب کہ تیرے بازوؤں میں قہستانی علاقہ کے شاہین کی سی قوت موجود ہے۔ تجھ میں ایسی طاقت ہے کہ تو اپنی دنیا خود تعمیر کر سکتا ہے اور جہد و عمل کی زندگی گزار کر اپنی عظمت و بقاء کا سامان بھی خود تلاش کر سکتا ہے۔ مردِ مومن کی ذات میں ایمان، یقین اور اعتماد کا جو عنصر موجود ہوتا ہے وہ اس سے خالی دنیا میں گویا روشن چراغ ہے۔ اس روشن چراغ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صحرا کی اندھیری رات میں کوئی چراغ روشن ہو رہا ہو اور وہاں سے گزرنے والوں کے لیے ایک صحیح راستہ نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب یقین محکم اور سچائی کا راستہ سامنے ہو تو مسلمان کے لیے اس راستے سے گزرنا بالکل آسان ہے۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ایران و روم کے قیصر و کسریٰ کے دبدبے، ہیبت اور بادشاہت اور ان کے ظلم و جبر کا کیسے خاتمہ ہوا۔ ان کے ظلم و جبر کو حضرت علیؓ کی قوت و شجاعت، ابوذر غفاریؓ کے فقر اور درویشی کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی صداقت نے ختم کر ڈالا تھا۔ موجودہ دور میں ضرورت ہے کہ مسلمان ایسی صلاحیتوں اور قوتوں کو پیدا کر کے انہیں بروئے کار لائیں تا کہ وہ باطل قوتوں کا خاتمہ کر کے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا سامان کر سکیں۔ اقبال کے مطابق مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ملت کے احرار اور مسلمان کے جرأت مند بہادر اسلاف بڑی شان و شوکت اور بہادری سے اپنے دشمنوں کے مقابل صف آرا ہوئے تھے اور ان کو شکست دی تھی۔ ایسے مناظر

تاریخ کا زریں باب بنے ہوئے ہیں اور انہیں صدیوں سے پڑھا جا رہا ہے۔ اس بات کو بھی ذہن نشین کر لیا جائے کہ ایمان محکم ہی کے طفیل زندگی پائیدار اور استوار ہو سکتی ہے۔ اس کو ہم جرمن اور ترکستان کی تاریخ سے سمجھ سکتے ہیں کہ مضبوط ایمان ہی کی بدولت ترکستان نے کئی طرح کے اسلحہ سے لیس جرمن کو شکست دی تھی اور اپنی مضبوط حکومت قائم کی تھی۔ یہ بالکل درست ہے کہ جب انسان میں یقین و اعتماد پیدا ہوتا ہے تو اسے بے سروسامانی میں بھی روح الامین حضرت جبریلؑ جیسے بال و پر حاصل ہو جاتے ہیں اور جبریل امینؑ جیسی بلند پروازی کی خاصیت بھی عطا ہو جاتی ہے۔

پانچویں بند میں اقبال نے یقین و اعتماد کے موضوع کو نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے یہ اہمیت کا حامل بند ہے۔ ان کے مطابق ایک انسان کے لیے اسلحہ اور تدبیریں اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ وہ غلامی کی ذلت آمیز زندگی سے دور نہ ہو اور جب تک افراد ملت یقین و اعتماد کی منزل تک نہ پہنچ جائیں، کیوں کہ اسی یقین اور اعتماد کی بدولت غلامی کی زنجیروں کو کاٹا جا سکتا ہے۔ مردِ مومن کی نگاہیں اتنی زبردست اور اثر کن ہوتی ہیں کہ وہ قوموں کی تقدیر بھی بدل دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ولی یا بادشاہ بنے، الہام یا تعلیم رسولؐ کے ذریعے حقائق اشیا سے آگاہ ہو جائے۔ مگر یہ سب نکتۂ ایمان کی شرحیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک انسان کے اندر ایمان پختہ ہو تو یہ تمام چیزیں فطری طور انسان کو حاصل ہو کے رہتی ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسا کامل یقین ہونا چاہیے جو کہ نہایت ہی مشکل امر ہے، کیوں کہ عام طور پر انسان کے دل میں ہوس، لالچ اور خواہشات کا انبار ہوتا ہے جو اوپر مذکورہ چیزوں کے لیے رکاوٹ بنتا ہے۔ قدرت کا قانون ہے کہ ہر انسان کو مادی حقوق کا اہل بنایا گیا ہے، لیکن مفاد پرست اور خودغرض لوگوں نے انہیں آقاؤں اور غلاموں، طاقت وروں اور کمزوروں، گوروں اور کالوں، میں تقسیم کیا ہے۔ اس امتیاز کی وجہ سے خلق خدا کے درمیان فساد، ظلم اور تضاد قائم ہوا، مگر زبردستی کام لینے والے اور شدت اختیار کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے کہ خبردار! خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اور اس کی سزائیں بھی بڑی سخت ہوتی ہیں۔ اس حقیقت سے مفر نہیں کہ ہر چیز یا تو مٹی سے بنی ہے یا پھر نور سے۔ ان تمام چیزوں کا تخلیق کار صرف اللہ ہے۔ اس لیے ان کی حقیقت بھی ایک جیسی ہے۔ سب انسان اللہ کے فرمان اور رسولؐ کے ارشاد کے مطابق حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں۔ اس کو ہم اس مثال کے ذریعے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ذرے کا دل چیرا جائے تو اس میں سے سورج کا خون ہی ٹپکے گا۔ اقبال نے ذرے اور سورج کی مثال دے کر انتہائی خوب صورت انداز میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر شئے کی تخلیق و اصلیت ایک ہے۔ محکم یقین، مسلسل جہد و عمل اور دنیا کو فتح کرنے والی محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی جدوجہد، یہ سب دلیروں، بہادروں اور مجاہدوں کی تلواروں کی مانند ہیں۔ یعنی یہ ایسے اسلحے ہیں جن سے دنیا کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ ان بہادروں اور دلیروں کی فطرت کی بلندی، نظر کی وسعت، محبت الٰہی کی شراب سے سرشاری، دل میں جوش اور ولولہ، نگاہ خواہشِ دنیا سے پاک اور روح میں سوز و گداز اور تڑپ کا ہونا باعثِ فتح و نصرت ہے۔ مذکورہ بالا تمام صفات ہی سے ایک فرد مردِ کامل اور مومن بن سکتا ہے۔

نظم کے چھٹے بند میں اقبال کہتے ہیں کہ یونانی فوج عقابی شان کے ساتھ ترکوں پر حملہ آور ہوئی تھی لیکن وہ نہایت ہی ذلت اور بے بال و پر ہو کر پسپا ہو گئے اور شکست کھا گئے تھے۔ اس لیے یونانی افواج ترکوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں۔ جو لوگ یونانیوں کی آبدوز کشتیوں پر ناز جتاتے تھے، مگر ترکوں نے خدا کے فضل سے انہیں سمندر میں غرق کیا۔ حالاں کہ ترکوں کے پاس اتنے وسائل اور اتنی مہارت نہیں تھی لیکن پھر بھی انہوں نے ان کو شکست دے دی، جن لوگوں کو اپنے سائنسی علوم پر اور مادی ترقیوں پر ناز تھا، بالآخر ان کے ہاتھ شکست کے سوا کچھ نہ آیا۔ اس کے برعکس ترکی فوج جو ارضِ خدا پر عاجزی و انکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے تھے، وہ ان دشمنوں کے مقابلے نہ صرف زور آور ثابت ہوئے بلکہ ان کے غرور اور تکبر کو مٹی میں

ملا دیا۔ان کا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لے کر آیا۔یعنی پیدل چلنے والا ترک، برقی طاقت پر دارومدار رکھنے والی یونانی فوج کے مقابلے یہ ثابت کر دکھایا کہ زندگی کا راز باطل طاقتوں کے خلاف لڑنے میں ہے نہ کہ منھ موڑ کر بھاگ جانے میں۔اسی جدوجہد کے نتیجے میں ترک کامیاب ہوگئے۔بالفاظ دیگر جن یونانیوں کو بجلیوں کی بدولت اطلاع ملتی تھی، وہ آج بے خبر اور ناکام ثابت ہوئے۔

حرمِ کعبہ کے متولی شریف حسین کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے کعبہ رسوائی کا شکار ہوگیا۔اس کے برعکس ترک سپاہیوں کے کردار اور ان کی نظر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے حقیقتِ حال کا صحیح اندازہ لگا کر ہمت اور جواں مردی، روشن ضمیری اور بلند نظری و دانش مندی سے اسلام کی پیروی کی۔اتنا ہی نہیں بلکہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر باغیوں سے مردانہ وار مقابلہ کیا۔پانی کی طرح اپنا خون بہایا، لیکن کعبے کی حرمت کو مٹنے نہ دیا۔یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام کے جتنے اور جس قدر سچے مسلمان ہیں اور جس قدر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے والے فرشتے تھے، سب یک زبان تھے کہ یہ ترکی مسلمان بڑے ثابت قدم، جانباز اور حوصلہ مند ثابت ہوئے۔چناں چہ کہتے ہیں کہ جن مسلمانوں کا ایمان پختہ اور مضبوط یقین ہوتا ہے، وہ اس دنیا میں سورج کی طرح تابناک زندگی گزارتے ہیں۔وہ لالچ اور حرص وہوس کے پجاری نہیں ہوتے بلکہ ہر طرح کی بدیوں اور برائیوں سے دور ہوتے ہیں۔جب تک کہ انسان دنیا کی لالچ اور طمع میں مبتلا ہے تب تک اسے اچھائی کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔اس نظم سے یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ مضبوط ایمان والے کبھی شکست کے شکار نہیں ہوتے بلکہ وہ ہر مشکل کو آسانی کے ساتھ طے کر کے کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور جہاں بھی جائیں وہاں اپنی نہ ختم ہونے والی روشنی سے اجالا کرتے ہیں۔ جیسے سورج ایک براعظم میں طلوع ہوتا ہے تو دوسرے براعظم میں غروب ہوتا ہے۔مسلمان ہونے کا مطلب مٹنا نہیں بلکہ ہر بار ابھر کر سامنے آنا ہے۔اگر افرادِ ملت کے دلوں میں ایمان راسخ ہوتا ہے تو ملت تعمیر و ترقی سے ہم کنار ہوسکتی ہے اور اسی مضبوط طاقت کی بدولت ملت کی تقدیر سنور جاتی ہے۔یعنی اسی قوت سے قوم کی بگڑی تقدیر بن جاتی ہے۔اس حوالے سے علامہ اقبال کے ہی ایک شعر سے مزید رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

یہی وہ قوت ہے جس سے ملت کی تعمیر و ترقی اور تنظیم ہوتی ہے۔

اقبال کا کلام اور ان کی طویل نظمیں ہیئت اور موضوع کے حسن سے پُر ہیں۔انہیں موضوع کے ساتھ ساتھ تکنیک پر بھی ایسی گرفت تھی کہ وہ جہاں اور جس طرح چاہیں بات کو ڈھنگ اور آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔اس نظم میں بھی کئی دفعہ اس عمل کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

نظم کے ساتویں بند میں ایک بار پھر مسلمانوں سے ہی خطاب ہے۔وہ اس بات پر زور دیتے نظر آتے ہیں کہ ترکوں کی زندگی اور جدوجہد سے سبق حاصل کیا جائے اور اس نصیحت کو نظر انداز نہ کریں کہ اگر وہ آزاد ہوگئے تو تم بھی آزاد ہوسکتے ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ تم پہلے اپنے آپ سے آگاہی حاصل کرو اور اپنی حقیقت سے آگاہ ہوجاؤ، کیوں کہ تمہیں تو اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہو۔اس لیے خودی کے راز سے پوری طرح آشنا ہوجاؤ اور خدا کے ترجمان بن جاؤ۔تاکہ تم اس دنیا میں حکومتِ الٰہی کو قائم کرسکو۔دیکھا جائے تو دنیائے انسانیت بُری طرح ہوس، لالچ اور خواہشاتِ نفس میں اسیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان انتشار و افتراق میں مبتلا ہیں۔ہر انسان اپنی خواہشات کو معبود بنا بیٹھا ہے۔اس لیے اقبال مرد مسلماں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے مسلمان تو بھائی چارے کا جذبہ پیدا کر، محبت کا پیکر بن جا اور انسان دوستی کا عملی ثبوت فراہم کر اور ہر طرح کی

نفرتوں کو مٹا کر ہمیشہ کے لیے ایک بن جا، مگر اس وقت امت کی صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان ہندی، خراسانی، افغانی، تورانی کی قوم اور وطن، رنگ اور نسل کے امتیاز میں لگے ہوئے ہیں اور مختلف فرقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ اس ملت کی مثال سمندر کی موجوں کی مانند ہے جو اپنا جداگانہ وجود رکھتی ہیں، لیکن ایک نقطے پر پہنچ کر یہ آپس میں مربوط ہیں نہ کہ جدا، اور اسی میں ان کی عافیت بھی ہے۔ اے مسلمان! تیرے بال و پر ، رنگ و نسب کی گرد سے غبار آلودہ ہیں، حالاں کہ تو حرمِ کعبہ سے جڑا ہوا ہے جو اتحاد و اتفاق اور یگانگت کی سب سے بڑی مثال اور علامت ہے۔ اب اے حرم کے پرندے (یعنی، مسلمان) تو اڑنے سے پہلے اس گرد و غبار کو صاف کر اور باہمی اتحاد و اتفاق کے لیے جدوجہد اور مسلسل عمل جاری رکھ، تاکہ تو دنیا میں اپنی زندگی وقار اور عزت کے ساتھ گزار سکے۔ اب اے غافل انسان! تیرے لیے ضروری ہے کہ تو اپنی خودی کو پہچان کیوں کہ تیری خودی میں تیری زندگی کا راز اور اس کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ تیری زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ تو اپنے آپ کو پہچان اور خودی کی معرفت بھی حاصل کر۔ جب تو ان مراحل کو طے کرے گا، تو تجھ میں اس قدر قوت پیدا ہوگی کہ تو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر حیاتِ جاوید اں حاصل کرے گا۔ تو زندگی کے مصائب، آلام اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے فولاد کی طرح مضبوط بن جا اور جدوجہد کو جاری رکھ۔ یعنی باطل قوتوں کے مقابلے میں تو فولاد کی طرح مضبوط ہو جا، البتہ جب مسلمان بھائیوں سے معاملہ ہو تو ریشم کی طرح ملائم ہو جا۔ یعنی ان کے ساتھ نرم طبیعت سے پیش آ اور سراپا محبت والفت کا پیکر بن جا۔ تیرے علم اور تیری محبت کی کوئی انتہا نہیں اور اس پوری کائنات کے ساز و سامان میں تو ہی اعلیٰ و ارفع ہے اور تیری نوا سے بڑھ کر کوئی نوا نہیں۔ مطلب اللہ تعالیٰ نے صرف تجھے ہی ان نعمتوں سے نوازا ہے، جس کی وجہ سے تیرا رتبہ اور تیرا مقام دوسری قوموں سے زیادہ بلند ہے۔

اس بند میں علامہ اقبال کا مقصد امت مسلمہ کو اس کا صحیح مقام اور حیثیت یاد دلانا ہے۔ انہوں نے انتشار و افتراق، نفرت و نفاق کو چھوڑ کر اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے عملی جدوجہد ناگزیر ہے۔

آٹھویں بند میں اقبال مسلمانوں سے پُر زور لہجے میں کہتے ہیں کہ کیا تجھے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ آج تک دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ نہیں کیا۔ یہ افسوس ناک صورتِ حال ہے کہ انسان خلافت کے بجائے ملوکیت کے ظلم و جبر کا شکار ہے۔ جب تک ملوکیت قائم ہے تب تک ایک انسان دوسرے انسان کو غلام بناتا رہے گا۔ یہ کس قدر افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ انسان اپنے ہی بھائیوں کو غلام بنا کر ان کا شکار کر رہا ہے۔ یہ مغرب اور دورِ جدید کی تہذیب کس حد تک آنکھوں کو دھوکہ دے رہی ہے، یعنی بظاہر یہ دلکش ہے، لیکن یہ ایسے زیور کے مانند ہے جس میں جھوٹے نگینے لگے ہوئے ہیں۔ مطلب دیکھنے میں یہ بڑی حسین اور پرکشش ہے، لیکن حقیقت میں اس کے اندر برائیاں ہی برائیاں ہیں۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

آگے چل کر اقبال مزید یہ اشارہ دیتے ہیں کہ مغربی فلسفیوں اور دانشوروں کو جس حکمت و دانائی پہ ناز تھا، یعنی جس سائنس پر اہل یورپ فخر کرتے تھے، آج وہی سائنس انسانوں کے حق میں لعنت بنتی جا رہی ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے ہوس پرستی اور استعمار پسندی وجود میں آئی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ یہاں خطرناک اور مہلک ہتھیاروں کی طرف اشارہ ہے کہ جو صرف انسانوں کی تباہی کے باعث بنے ہوئے ہیں۔

اہلِ مغرب نے جو تہذیب دی ہے، اس کی بنیاد سرمایہ داری اور ظلم و جبر پر ہے۔ اس لیے وہ پائیدار نہیں ہو سکتی۔ یعنی یہ نظام فکر و تدبر سے مضبوط نہیں ہو سکتا بلکہ وقت آئے گا جب ان کے اس نظام کا خاتمہ ہوگا۔ اقبال کے نزدیک صرف عمل ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے اور انسانی زندگی جنت میں تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہی عمل صحیح نہ ہو تو یہ زندگی کے لیے جہنم بن سکتی ہے۔ اس لیے انسان اپنی فطرت میں

نہ فرشتہ ہے نہ شیطان۔یعنی انسان کو اپنی فطرت سے نیک اور بد نہیں جانا جاتا بلکہ اس کے اعمال اور کردار سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔اے بلبل (شاعر) تو باغ کے باقی بلبلوں کو بھی نغمے سکھادے۔کیوں کہ تو اس گلستان میں موسمِ بہار کی ہوا کی مانند ہے۔جس کی وجہ سے باغ کے پھولوں میں رونق آتی ہے اور وہ کھل اٹھتے ہیں۔مطلب یہ کہ اے شاعر یا اے مسلمان تو اس دنیا میں باعثِ رحمت اور برکت ہے۔اس لیے تجھ پر لازم ہے کہ تو باقی انسانوں کو محبت کے گیت (پیغام) سے سرفراز کر اور اپنے خدا کی اطاعت کے درس سے لوگوں کو نواز دے، کیوں کہ انسان کو فقط اللہ کی اطاعت سے سکون مل سکتا ہے اور آزادی کا جذبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔چناں چہ ترکوں نے اپنے موجودہ طریقۂ کار سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ پھر سے جدوجہد کریں تو پوری دنیا کو پیغام امن سنا سکتے ہیں۔اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ پیغام ہے کہ اٹھو، کمزور اور ناتوان تمہارے پیغام کو سننے کے لیے مضطرب ہیں۔تمہیں بڑی مدت کے بعد ایسا موقعہ فراہم ہوا ہے کہ اسلام کی خوبیاں پوری دنیا پر ظاہر کرسکو۔اس لیے اب ملت کی فلاح و بہبودی کے ایام قریب ہیں اور قوم اب دوبارہ اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالا مال ہوکر منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو رہی ہے۔

اس نظم کے نویں اور آخری بند میں اقبال امید و رجائیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اے ساقی! آمدِ موسم بہار ہے، درختوں کی سرسبز شاخوں سے ایک کمزور پرندے کی صدائیں گونج رہی ہیں کہ بہار کے ساتھ ساتھ ہمارا محبوب بھی آیا ہے جس سے ہمارے بے قرار دل میں سکون اور اطمینان نصیب ہوا ہے۔یعنی حالات اب ایسے ہو رہے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں خوشیاں پھوٹنے لگی ہیں۔بہار کے بادلوں نے ہر وادی اور صحرا میں گویا اپنے خیموں کو گاڑ دیا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے آبشاروں کی دلکش صدائیں آرہی ہیں۔اقبال کہتے ہیں کہ اے ساقی! میں تجھ پر قربان۔اب موقع ہے کہ تو اپنے اسلاف اور اگلے مجاہدوں کے نقش قدم پر چل کر پوری دنیا کو پیغام اسلام سے واقف کر۔کیوں کہ تمام قومیں اس وقت زخموں سے نڈھال ہیں اور تو اب اسلامی مرہم سے ان کا علاج کر کے صحت یاب بنادے اور اپنے انعام و اکرام کے سلسلے کو بحال کر، کیوں کہ بڑی مدت کے بعد اس پرانی شاخ سے بلبل کی آواز آنے لگی ہے اور نغمہ گانے والوں کا گروہ لمبی قطار میں محو نغمہ سرائی ہے۔تجھے ان عبادت گزاروں [نادان مولویوں] سے دور رہنا ہوگا جو شراب [جدوجہد] کی مخالفت کرتے ہیں۔اس کے بجائے تو بغیر کسی جھجک کے پینا پلانا شروع کردے، کیوں کہ بڑی مدت کے بعد چمن کی شاخوں سے نغمۂ بلبل سننے کو نصیب ہوا۔اے ساقی! عاشقوں کو بدر و حنین کے سردار حضورؐ کے بارے میں بتا۔محمدؐ جنہوں نے رازہائے دروں کو محفوظ رکھا، وہ اب مجھ پر عیاں ہو رہے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ کی قوم ایک بار پھر ہماری کوششوں اور قربانیوں سے تازہ ہونے لگی ہے اور محبت و ہمدردی کے اس بازار میں ہمارا نقدِ جان (ایمان) کھرا ثابت ہوا ہے۔آج میں اس شہید کے روضہ پر لالہ کے پھول چڑھا رہا ہوں جس کے لہو سے ہماری ملت کے درخت سرسبز و شاداب ہیں۔یہاں اقبال نے واقعہ کربلا اور شہادت امام حسینؑ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اے مسلمان! آ، تا کہ ہم سب مل کر پھولوں کی برسات کریں اور دل کے پیالے کو محبت سے بھریں یعنی نعرۂ تکبیر سے آسمان کی چھت میں سوراخ کر کے نئے دور اور نئی زندگی کی بنیاد رکھیں۔

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ نظم طلوعِ اسلام (9) بندوں اور (72) اشعار پر مشتمل ہے۔

☆ طلوعِ اسلام 'بانگ درا' کی آخری اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثال نظم سمجھی جاتی ہے۔

☆ یہ نظم 1923ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔

☆ علامہ اقبال نے مصطفیٰ کمال کی کامیابی و کامرانی کو 'طلوعِ اسلام' سے تعبیر کیا ہے۔

☆ اس نظم کو اس زمانے میں لکھا گیا جب مصطفیٰ کمال پاشا بے سروسامانی کے باوجود یورپی سازشوں کی زنجیریں توڑ کر ترکی کو آزاد کرا چکے تھے۔

7.6 کلیدی الفاظ

لفظ	:	معنی
تنک تابی	:	مدھم روشنی
گراں خوابی	:	گہری نیند، غفلت میں پڑے رہنا
نُطق اعرابی	:	عربوں جیسی قوت گفتار
شکوہ ترکمانی	:	ترکوں کی سی شان و عظمت
چشمِ پاک بیں	:	پاکیزہ نظر
برگستواں	:	سپاہی اور گھوڑے کا جنگی لباس
جگر تابی	:	باطن کی تڑپ، بے چینی
سرشک	:	آنسو
نیساں	:	وہ بارش جس کے قطرے سیپیوں میں گر کر موتی بن جاتے ہیں
گہر	:	موتی، مراد عظیم جذبوں والے مسلمان
ربود	:	چھیننا
عثمانی	:	مراد ترک
جہاں بینی	:	دنیا کا جائزہ
لم یزل	:	لافانی
چرخ نیلی فام	:	نیلا آسمان
مغلوب گماں	:	شک و شبہ میں مبتلا
آنی	:	ایک لمحے کا
حنابندِ عروس لالہ	:	گلزار عالم کی دلہن کو آراستہ کرنے اور اس کو مہندی لگانے والا
معمار جہاں	:	اس سے مراد حضرت ابراہیمؑ ہیں جنہوں نے کعبہ کی تعمیر کی تھی
ممکنات زندگی	:	زندگی کی ترقی کے امکانات
جوہر مضمر	:	چھپی ہوئی صلاحیتیں

ارمغاں : تحفہ

ملتِ بیضا : ملت اسلامیہ

امامت : رہنمائی

مقصودِ فطرت : فطرت کی مرضی

رمز : پوشیدہ بات، اشارہ

جہاں گیری : حکومت

قہستانی : پہاڑی علاقہ

استبداد : ظلم، سختی

احرار ملت : ملت کے آزاد (مراد مسلمان جو خدا کے احکام کی روشنی میں کفر کی لگائی ہوئی پابندی سے آزاد تھے)

قیصر : روم کے بادشاہ کا لقب

کِسریٰ : ایران کے بادشاہ کا لقب

جادہ پیما : راستہ طے کرنے والا

المانی : جرمنی کا باشندہ

انگارہ خاکی : اس سے مراد انسان

روح الامین : حضرت جبرئیلؑ کا لقب

تورانی : ترک

ولایت : کسی بادشاہ کی حکومت، یا ولی ہونا

چیرہ دست : غالب، زور آور

تعزیریں : سزائیں

بے بال و پر نکلے : یونانیوں کو اپنے بازو بیکار نظر آئے، وہ اس حملے میں ترکوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

مدفون دریا : دریا میں غرق

زیر دریا تیرنے والے : مراد یونانی جو آبدوز کشتیوں میں آئے تھے، ترکوں نے ان کی کشتیاں ڈبو دی تھیں

پیرِ حرم : کعبہ کا متولی، شریف حسین

تتاری : تاتاری، ترک

نوریانِ آسمان : فرشتے

صورت گر : بنانے والا

کن فکاں	:	ہوجا کہا، پس ہوگیا (ارشاد خداوندی، کائنات کا وجود میں آنا)
شرمندۂ ساحل	:	مراد جس نے خود کو محدود کرلیا ہے
غبار آلودہ	:	مٹی سے بھرے ہوئے
غبار آلودۂ رنگ ونسب	:	مراد رنگ ونسل میں فرق کرنا
مرغِ حرم	:	کعبہ کا پرندہ، مراد مسلمان
پرفشاں ہونا	:	پھڑ پھڑا کر پروں کو جھاڑ دینا
حلقۂ شام وسحر	:	وقت کی قید
مصاف	:	صف آرائی، میدانِ جنگ
حریر	:	ریشم، ریشمی لباس
پرنیاں	:	ایک قسم کا ریشمی پھول دار کپڑا جو بڑا نفیس اور نرم ہوتا ہے
صیدزبوں	:	خستہ حال شکار، تابع فرمان
خیرہ کرنا	:	نظروں کو جھپکا دینا
ریزہ کاری	:	زیور میں چھوٹے چھوٹے نگینے جڑنا
تیغ کارزاری	:	لڑنے پر آمادہ تلوار، مراد جدید اسلحہ جو سائنس کے زور سے بنائے جارہے ہیں
تدبر	:	غور وخوض کرنے کا عمل
فسوں کاری	:	جادوگری
نوری	:	مراد فرشتہ، نیک کردار
ناری	:	آگ کا بنا ہوا، مراد بدکردار
خروش آموز بلبل	:	بلبل کی طرح جوش وخروش پیدا کرنے والا
جولانگہ	:	جولان گاہ، گھوڑے دوڑانے کا میدان، مراد دخل وعمل کا میدان
اطلس قبایان تتاری	:	اطلس قبا کی جمع، یعنی ترکستان کے نوجوان سپاہی جو چمکیلا لباس پہنے ہوئے ہیں

7.7 نمونۂ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کی نظم 'طلوع اسلام' کس بحر میں لکھی گئی؟

2۔ طلوع اسلام اقبال کے کس مجموعے میں شامل ہے؟

3۔ اس نظم کے پہلے بند میں ستاروں کا ٹمٹمانا کس بات کی دلیل ہے؟

4۔ اس نظم کے ہر بند میں کتنے اشعار ہیں؟

5۔ طلوعِ اسلام کے معنی کیا ہیں؟

6۔ نظم کے حوالے سے اقبال کی کیا آرزو ہے؟

7۔ اقبال نے نظم ''طلوع اسلام'' کب لکھی؟

8۔ اقبال نے یہ نظم کب اور کہاں پڑھی؟

9۔ مصطفیٰ کمال کون ہے؟

10۔ نظم ''طلوع اسلام'' کتنے بند پر مشتمل ہے؟

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کی شعر گوئی کا آغاز کب ہوا؟

2 علامہ اقبال کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

3۔ اقبال کی نظم 'طلوعِ اسلام' کس زمانے میں لکھی گئی؟

4۔ اہلِ مغرب نے جو تہذیب دی ہے، اس کی بنیاد کس پر ہے؟ وضاحت کیجیے۔

5۔ مسلمان اس دنیا میں باعثِ رحمت اور برکت ہے، اس لیے اس پر کون سی چیزیں لازم ہیں؟

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کے تصورِ اسلام پر مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ اقبال کی شعر گوئی پر ایک مفصل نوٹ تحریر کیجیے۔

3۔ نظم 'طلوعِ اسلام' کا اپنے الفاظ میں ایک جائزہ پیش کیجیے۔

7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ کلیاتِ اقبال (اردو و فارسی)	علامہ محمد اقبال
2۔ فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
3۔ نقوشِ اقبال	مولانا ابوالحسن ندوی
4۔ اقبال سب کے لیے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
5۔ اقبال کی تیرہ نظمیں	اسلوب احمد انصاری

اکائی 8 : نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 اقبال کی نظموں میں قوم کا تصور

8.3 کلامِ اقبال میں حب الوطنی

8.4 نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا متن

8.5 نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا تجزیہ

8.6 اکتسابی نتائج

8.7 کلیدی الفاظ

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

علامہ اقبال نے ابتدائی دور میں وطنی قومیت کا پرچار کیا لیکن بعد میں وہ اس قومیت کے تصور کے خلاف ہو گئے جس کی بنیاد رنگ، نسل، زبان یا وطن پر ہو۔ اصل میں اقبال ایک عالمگیر ملت کے قیام کے آرزومند تھے۔ وہ تمام انسانوں میں اخوت، یگانگت اور بھائی چارے کے خواہش مند تھے۔ اس اکائی میں اقبال کی مختلف نظموں کے حوالے سے ان کی حب الوطنی سے واقفیت حاصل ہوگی۔ اقبال کا ابتدائی تصور وطنیت اور قومیت نظم ''ہندوستانی بچوں کے قومی گیت'' کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اقبال کے تصور قومیت کو بیان کر سکیں۔

☆ علامہ اقبال کی وطن دوستی کو بیان کرسکیں۔

☆ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا تجزیہ کرسکیں۔

8.2 اقبال کی نظموں میں قوم کا تصور

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ اس لیے اقبال نے قومیت کو دائرۂ اسلام میں رکھ کر اس تصور کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر ان کے تصور قومیت کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے اس تصور قومیت کی بنیاد اسلامی اعتقادات پر منحصر ہے۔ چناں چہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

اسلام قومیت کے تصور سے ان چیزوں کو سامنے لاتا ہے کہ اخوت اور بھائی چارہ قوم کی بنیادوں میں ایک اہم بنیاد ہے۔ اس لیے اس دین سے یہ درس ملتا ہے کہ انسان کو رنگ و نسل، نام و نسب اور ملک و قوم کے ظاہری اور مصنوعی امتیازات سے نکل کر اجتماعی زندگی گزارنا اچھی قومیت کی بہترین مثال ہے۔ مگر بدقسمتی ہے کہ قوم مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہوگئی اور یہ انتشار ملک و ملت کے لیے نقصان کا باعث بنا۔ اقبال نے بار بار اپنے کلام میں اسی اخوت کی طرف لوٹنے کی نصیحت کی اور ایک مضبوط قوم میں ڈھل جانے کا درس دیا۔ چناں چہ وہ ایک عالمگیر ملت کے قیام کے آرزومند ہیں اور وہ بالخصوص مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

اقبال نے ملت اور اخوت کا پیغام اسی جذبہ اتحاد کے تحت مسلمانوں کو دیا ہے۔ انہوں نے رنگ و خون کی تفریق کو مٹا کر ملت میں گم ہوجانے کی تلقین کی، کیوں کہ اخوت و اتحاد کی قوت ہی سے ایک زندہ قوم اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

یہی مقصود فطرت، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

مشاہدہ کیا جارہا ہے کہ ملک، قوم، خون، نسل اور وطن جیسی مصنوعی حد بندیوں نے نوعِ انسانی کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا ہے اور اقبال نے اس کا علاج عالم گیر اسلامی معاشرے میں بتایا ہے۔ وحدت اور اخوت کا یہ احساس نوعِ انسانی کے اندر صرف اسلام کے ذریعہ ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام صرف انسان کی اخلاقی اصلاح ہی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی کے قیام کی بھی دعوت دیتا ہے۔ جس سے انسان

کے اندر قومی اور نسلی نقطۂ نظر یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق ہو۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

اتحاد اقوام کا تصور بنیادی طور پر اقبال کا ایک عالمگیر پیغام ہے اور تمام نوعِ انسانی کو اخوت کی دعوت دے کر قومیت کے محدود تصور اور اس کی ہوس کا علاج فراہم کرتے ہیں۔ اقبال نے اسلام کو ایک ازلی، ابدی، آفاقی اور عالمگیر دین بتایا ہے۔ انہوں نے اسے ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے راہِ ہدایت سے تعبیر کیا ہے۔ اس لیے اس کے پیروکاروں کو بھی اب رنگ و نسل، ملک و وطن اور خون کے امتیازات کو مٹا کر یکجا ہو کر زندگی گزار کر دنیائے انسانیت کی خاطر ایک عالمگیر برادری کی مثال قائم کرنی چاہیے۔

علامہ اقبال کے مطابق قومیت کی بنیاد اسلام پر ہونی چاہیے، نہ کہ ملک و نسب اور نسل و وطن پر۔ اتحاد اور دنیائے انسانیت میں تب تک ایک قوم بن جانے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوسکتا جب تک مغربی نظریۂ قومیت اور وطنیت پر اسلامی نظریہ قومیت اور وطنیت حاوی نہ ہو جائے۔ چناں چہ مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب میں بیسویں صدی کے افق پر جس نظریے نے سب سے زیادہ شدت اور قوت کے ساتھ سر ابھارا، وہ یہی نظریۂ قومیت ہے۔ مطالعے سے مزید اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ابتدائی دور میں حب الوطنی کے گیت گاتے نظر آتے ہیں، ان کے اس دور کے کلام میں نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانۂ ہندی اور تصویر درد وغیرہ جیسی نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں وطنیت نواز شاعر کا رنگ نظر آتا ہے، جو مغربی تصور قوم اور وطن پرستی کے مماثل ہے۔ البتہ جب اقبال انگلستان گئے تو وہاں پر انہیں یہ احساس ہوا کہ قوم پرستی اور عالمِ اخوت دونوں ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ خاص طور پر جب ترکی کے خلاف عالمِ عرب نے برطانیہ کی حمایت کی تھی، تو اقبال نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ سب مغربی تصور قومیت کی دین اور اثر ہے۔

آج کل تصور قومیت (Nationalism) اور وطنیت کے اثرات ہر طرف اور ہر ملک میں نظر آتے ہیں اور جس کا سرچشمہ یورپ کی سرزمین ہی ہے، اقبال کے نزدیک یہ شرک اور بت پرستی سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ملت اسلامیہ کی طاقت اور قوت کسی وطن سے نہیں بلکہ توحید اور وحدتِ ملت سے ہی محکم ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے اپنا نقطۂ نظر یہ بالکل واضح کر دیا تھا کہ ملت اسلامیہ کی طاقت کسی وطن سے نہیں بلکہ توحید اور وحدتِ ملت سے ہے، ان کا خیال ہے کہ پوری کائنات انسانی اولوالعزمی کی جولانگاہ ہے، اس لیے کسی مقام و سرزمین سے بندھ جانا تباہی اور آزادی کو کھو دینے کے مرادف اور اپنے پاؤں میں بیڑی ڈال لینے کے برابر ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہجرت کا اصول انسان کو عالمی انسانیت اور عالمگیر انسانی برادری کا ایک عظیم سبق تھا، جسے حضورؐ نے درس گاہِ نبوت سے دیا، ان کے عقیدہ میں اس قوم پرستی اور وطن کی بے جا طرف داری اور حق و ناحق پاس داری کے سبب قوموں میں رقابت پیدا ہوتی ہے، استحصال سر اٹھاتا ہے، سیاست میں بے ایمانی اور بے اصولی رونما ہوتی ہے اور جنگل کے قانون کو بڑھاوا ملتا ہے۔''
>
> (مولانا ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، ص 247-346)

چناں چہ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم ''وطنیت'' میں صاف طور پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دین نبویؐ ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اصل میں مغربی تہذیب اور مغربی مفکرین کا بنایا ہوا وطن کا یہ بت دین نبوی کا دشمن ہے۔ اقبال مسلمان سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ تو موحد ہے اور توحید کی بدولت تیرے اندر طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے تو اس بت کے مقابلے کے لیے تیار ہو جا۔ تیرا وطن نہ مشرق ہے اور نہ ہی مغرب بلکہ تیرا وطن اسلام ہے کیوں کہ یہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ تیرا روحانی تعلق کسی ملک سے نہیں ہے بلکہ تیری وابستگی رسول رحمتؐ سے ہے۔ تو نبیؐ رحمت کا غلام ہے۔ اس لیے اب اٹھ اور اس بت کو ختم کر کے پرانا نظارہ جو کبھی تیرے اسلاف نے دنیا کو دکھایا تھا پھر سے دنیا کو دکھا دے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو اپنا دیس بنایا۔ اس لیے سنت کے مطابق تو جس ملک میں چلا جائے گا، وہی تیرا وطن ہوگا۔

علامہ اقبال نے ساری عمر وطنیت کے غیر اسلامی تصور کو رد کیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

اقبال کے مطابق انسان کے واہمہ نے ہر زمانے میں نئے نئے بت تراشے ہیں، اسی طرح اس زمانے کا بت انسان نے قوم و وطن کی شکل میں بنایا ہے۔ علامہ اقبال نے اسلامی نقطۂ نگاہ اور حکمتِ فرنگ کے مقصد کا موازنہ کرتے ہوئے نظم ''مکہ اور جینوا'' میں یوں کہا ہے:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت عالم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیت آدم

علامہ اقبال کے مطابق موجودہ دور میں عالمی اداروں میں اقوام آپس میں ملتی ہیں،لیکن اس کے باوجود وحدتِ انسانی ظہور میں نہ آسکی۔ اہل مغرب کی حکمت کا مقصد قوموں میں تفریق رونما کرنا ہے اور قوموں میں اعلیٰ وادنیٰ کے امتیازات ابھارنا ہے۔اس کے برعکس اسلام تمام امتیازات کومٹا کر وحدتِ نسلِ انسانی کو قائم کرتا ہے۔یعنی تمام انسان ایک باپ کی اولاہیں اور سب برابر ہیں۔اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو مساوات کا درس دیتا ہے اسلام کے مطابق گورے کو کالے پر،عربی کو عجمی پر،سید کو شیخ پر،بادشاہ کو گدا پر اور امیر کو غریب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔البتہ اگر کوئی فضیلت یا ترجیح ہے تو وہ بس تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔اسی لیے مکہ معظّمہ (یعنی اسلام) نے خاکِ جینوا یعنی اقوام مغرب کو یہ پیغام دیا ہے کہ جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم قائم کرو۔مطلب اس کوشش کو تیز کرو کہ دنیا سے انسانوں کے بنائے ہوئے تمام امتیازات ختم ہوجائیں اور مساوات قائم ہوجائے جو امن وامان اور فلاح و بہبود کی ضامن ہے۔اقبال اخوت کے قائل تھے لیکن اس کی بنیاد انہوں نے اسلام پر رکھی ہے۔چناں چہ علامہ اقبال کہتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ،ہندوستاں ہمارا

اقبال کے نزدیک قومیت کی سب سے مضبوط جڑیں اسلامی عقائد اور شعائر میں پیوست ہیں۔مندرجہ ذیل یہ اشعار دیکھیں:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

علامہ اقبال کو اس بات کا گہرا شعور تھا کہ مغربی اور اسلامی تصور قومیت میں صرف جزوی اور فروعی نہیں بلکہ اساسی فرق ہے۔اپنی شاعری میں انہوں نے مغربی تصور قومیت کی بڑی شدت سے تنقید کی ہے۔وہ اس تصور کو انسانیت کے لیے ہلاکت خیز سمجھتے ہیں۔اقبال وطن پرستی کے خلاف اور وطن دوستی کے حق میں بات کرتے ہیں۔چناں چہ وہ خود آخر تک ایک اچھے وطن دوست شاعر رہے ہیں۔انہیں اس بات کا شعور تھا کہ تصور قومیت اس دور کا سب سے بڑا عذابِ دانش تھا،لیکن اقبال وہاں سے بھی کامیابی اور سلامتی سے نکل آئے۔جب کہ اس عہد کے بڑے بڑے شیوخ بھی وطن پرستی کے شعلوں اور شراروں سے اپنے دامن کو نہ بچا سکے۔چناں چہ اقبال کہتے ہیں:

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

اقبال نے تصور قومیت کے حوالے سے اس بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ فرد اور ملت یا فرد اور قوم کا باہمی تعلق ہے۔انہوں نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ افراد کے ہاتھوں میں ہی قوم کی تقدیر ہوتی ہے۔اسی لیے ایک جگہ فرمایا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اقبال فرد کو نہ صرف اجتماعیت سے الگ نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہیں، بلکہ اپنے آپ کو اس کے ساتھ وابستہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں، کیوں کہ اس کی نشو ونما اسی سے ممکن ہے اس لیے وہ اسی شجر سے منسلک رہے۔ ٹوٹے ہوئے پتے کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا ہے۔ ایک جگہ علامہ اقبالؒ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ملت کے ساتھ مربوط رہنا چاہیے۔ ملاحظہ کیجیے:

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے ، امید بہار رکھ

8.3 کلامِ اقبال میں حب الوطنی

دین اسلام نے حب وطن کو ایمان کے تقاضے کے طور پر سمجھ کر اسے پیش کیا، البتہ اس کے لیے بے جا طرفداری اور اندھی عصبیت سے منع کیا ہے۔ وطن سے محبت کرنا ایک فطری امر ہے جس سے کسی انسان کا کا دل کبھی خالی نہیں رہ سکتا۔ اسی جذبے کو فارسی اور اردو شاعری میں ہمیشہ سے پیش کیا گیا ہے۔

اقبال کی شاعری کے گونا گوں پہلو ہیں، جن میں حب الوطنی بھی ایک پہلو ہے۔ چناں چہ وہ ایک سچے اور پکے محبّ وطن شاعر گزرے ہیں۔ علامہ اقبال مذہبی رواداری اور بھائی چارے کے حامی بھی تھے اور انہوں نے ہندوستانی فلاسفروں اور سنتوں کی تعریفیں بھی کی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں چند اہم اور متاثر کن اور جذبہ حب الوطنی سے بھرپور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں میں ''ہمالہ''، ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اور ''نیا شوالہ'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے بڑی شدومد سے جغرافیائی اور خالص ہندوستانی وطن پرستی کا نظریہ اردو شاعری میں پیش کیا۔ دیکھا جائے تو بانگِ درا کی پہلی ہی نظم ''ہمالہ'' وطن پرستی کے جذبات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشور ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

آج کل کی وطنیت جس کی حمایت یورپی ممالک کرتے ہیں، اقبال کی نظر میں یہ بت پرستی اور شرک سے کم نہیں۔ چناں چہ اقبال کا ذہن اس معاملے میں صاف تھا کہ اسلام قومیت یا وطنیت کا قائل نہیں۔ بعض لوگ اقبال کے متعلق کہتے ہیں کہ اقبال پہلے وطنیت کی طرفداری کرتے تھے اور بعد میں وہ ملت کی طرف آئے، لیکن وہ شروع سے آخر تک وطن دوست ہوتے ہوئے بھی ملت اور اسلام کی آفاقیت کے قائل رہے ہیں۔ اس بات کا گواہ 1905ء کے بعد ان کا یہ کلام ہے، جو بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

بانگ درا میں اقبال نے وطن سے متعلق واضح طور فرمایا ہے کہ ملت اسلامیہ کی طاقت کسی وطن سے نہیں بلکہ توحید اور وحدت ملت سے ہے۔ لیکن حب الوطنی کے سلسلے میں نظم ''ترانۂ ہندی'' میں انہوں نے مذہبی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کا گیت گا کر اپنے ملک سے محبت کے اظہار میں کہا ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں،اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے، رشک جناں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں، ہندوستاں ہمارا
یونان ومصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی، نام ونشاں ہمارا

نظم ''بچے کی دعا''میں جہاں اقبال نے رب العزت سے علم میں اضافے ، برائی سے بچنے ، نیک راہ پر چلنے اور غریبوں ودردمندوں سے ہمدردی کی دعا مانگی ہے، وہیں انہوں نے اپنے وطن سے محبت اوراس کے حق میں دعا کا اظہار بھی اس شعر میں کیا ہے:

ہو مرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال نے اپنے ملک کو اس زمین پر جنت سے تشبیہ دی ہے اور اس میں حب وطن کی جھلک نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔اس کے علاوہ اس نظم میں ملک کی یکجہتی اور وحدت کا نغمہ گایا ہے۔مثال کے لیے چند اشعار دیکھیے :

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے ،میرا وطن وہی ہے

اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے وطن کے اوصاف اور اس کی عظمت و بلندی کو دل آویز انداز میں پیش کیا۔

حب الوطنی کے حوالے سے نظم ''نیا شوالہ'' اقبال کی کافی مشہور نظم سمجھی جاتی ہے۔اس کا مطالعہ کریں تو وطن کی محبت کے جذبے کو نہایت ہی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رنجش،شکوے اور گلے کی بنیاد پر جو نفاق پھیلا تھا،اس کو مٹانے اور باہمی اتفاق واتحاد اور یگانگت کو بحال کرنے کے لیے اقبال کہتے ہیں:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے تیرے فسانے
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس طرح علامہ اقبال کے بعض اشعار میں صرف وطن دوستی نہیں بلکہ وطن پرستی کی ترجمانی نظر آتی ہے۔اصل میں جب ہندوستان میں تحریک آزادی عروج پر تھی تو انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ دراڑیں ڈالنی شروع کیں اور ان کے درمیان آپسی اختلافات پیدا کیے جس کی وجہ سے وہ آپس میں ہی لڑنے لگے اور اصل مقصد سے دور ہوگئے۔ان آپسی اختلافات اور جھگڑے سے حصولِ آزادی میں روکاٹیں پیدا ہونے لگیں،جس سے اقبال بے حد متردد ہوئے۔اس لیے اقبال نے ایک ایسے شوالے کی بنیاد رکھنے کی دعوت دی جس میں دیر وحرم کا کوئی امتیاز نہ رہے۔غرض اس نظم میں اقبال اس قدر وطن کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں کہ انہیں وطن کی ہر چیز گویا دیوتا نظر آتی ہے۔یہ نظم اردو زبان وادب میں وطنی شاعری کا ایک بلند ترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاعری کے اعتبار سے یہ نظم اقبال کے دورِ وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے۔۔۔۔شاعر نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لیے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کر دیا ہے۔اکثر ناقدین اقبال کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر یہ اقبال کی بہترین نظم ہے۔'' (پروفیسر یوسف سلیم چستی،شرح بانگِ درا،ص 319)

علامہ اقبال کے دل کو وطن عزیز میں رونما ہوئے مسلسل فرقہ وارانہ اختلافات اور نفاق کا بڑا صدمہ پہنچا اور ان کا دل اس قدر مضطرب اور بے چین تھا کہ انہوں نے اپنی ایک نظم ''صدائے درد'' لکھی جس میں اس احساس کو اس طرح پیش کیا:

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے، اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سر زمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے　　وصل کیسا، یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب　　ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں　　اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اقبال اپنے وطن کے لوگوں سے یہ نصیحت کرتے رہے کہ اس چمن کو ایک دوسرے سے علاحدہ رہ کر آباد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یک جُٹ ہو کر اس کی آبیاری کرنے میں ہی شادابی ہے۔

اقبال نظم ''تصویرِ درد'' میں وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے عناصر کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرتے ہیں اور اپنے وطن کی صورت حال دکھ بھرے الفاظ اور انداز میں یوں پیش کرتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تر افسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اگر وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے عناصر کی بات کی جائے تو ان عناصر میں باہمی نفاق اور عناد، افتراق و انتشار، تنگ نظری و تنگ دلی اور بدگمانی جیسے عناصر شامل ہیں، جن سے اقبال نے متنبہ کیا تھا اور اس نظم کے حوالے سے انہوں نے مستقبل کے خطرے کی پیشین گوئی بھی کی ہے۔ اس لیے ان نظموں میں علامہ اقبال نے اہلِ وطن کو فرقہ پرستی، تنگ نظری، انتشار، بدگمانی وغیرہ سے دور رہنے کی نصیحت کی اور قومی اتحاد اور باہمی محبت اور اخوت پر زور دیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کی ابتدائی دور کی نظمیں ہیں جن سے ان کی حب الوطنی کے جذبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے ان نظموں کے ذریعے جذبۂ حب الوطنی کو فروغ دے کر قومی آزادی کی جدوجہد کو بڑی تقویت پہنچائی۔

اقبال کی اس دور کی نظمیں حب الوطنی، فکرِ وطن، آزادی وطن، بربادی وطن اور اہلِ وطن، غرض صرف وطن سے ہی متعلق ہیں، جن میں ان پر نوحہ خوانی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ سخت مضطرب الحال نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے درمیان موجودہ باہمی نفاق اور ٹکراؤ کا تذکرہ بڑے ہی دلگداز انداز میں کیا ہے۔ اقبال واقعی وطن دوست ہیں لیکن اس وطنیت سے بھی بیزار نظر آتے ہیں جس کی تبلیغ مغربی ممالک میں سامراجی اغراض کے لیے ہوتی ہے۔ ہندوستان کے سلسلہ میں وہ واضح کرتے ہیں کہ وطنیت اپنے ملک سے محبت کا نام ہے، جو ایک فطری جذبہ ہے۔

اقبال کے ملت اسلامیہ کے پیغام کے سلسلے میں کوئی ایسا پہلو نظر نہیں آتا، جس میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی تنگ نظری یا تعصب کو روا رکھا گیا ہو، یا جس کی بنیاد پر وطن یا اہلِ وطن یا دوسرے مذاہب و اقوام کے اکابرین کی محبت و عظمت کم ہوئی ہو۔ بلکہ مغرب نے جس طرح سیاسیات کا

رشتہ مذہب یا مذہبی قدروں سے توڑ کر جغرافیائی حدود یعنی وطن سے جوڑا تھا۔ اقبال نے سیاسیات کا رشتہ وطن سے توڑ کر روحانی قدروں یعنی مذہب سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کی اپنے ملک اور وطن سے محبت، ان کی شاعری، نثری افکار، خطبات اور بیانات میں واضح انداز میں نظر آتی ہے۔ وطن سے ان کی محبت کبھی کم نہیں ہوئی البتہ انہوں نے وطن کو سیاست سے الگ کر کے دیکھا ہے۔ اقبال کے مطابق جس طرح مغرب نے سیاست کا رشتہ مذہب سے توڑ کر جغرافیائی وطن سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اقبال نے سیاست کا رشتہ وطن سے توڑ کر مذہب سے ملانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ آخر تک ان کے کلام میں ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن میں ہندوستان سے والہانہ محبت و ہمدردی کا اظہار ہوا ہے۔ ان کے دور آخر میں بھی حب الوطنی کا گہرا رنگ موجود ہے۔ 1932 میں ان کا فارسی شعری مجموعہ ''جاوید نامہ'' شائع ہوا، جس میں جذبۂ حب الوطنی کا حسین ترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے ہندوستانی سنت وشوامتر کو بڑے عزت واحترام کے ساتھ پیش کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس میں ہندوستان کی روح کی بھی خوب صورت انداز میں تصویر پیش کی ہے، لیکن اس کی غلامی پر بھی آنسو بہانے سے نہیں رکے۔ ضرب کلیم کی دو نظمیں ''گلہ'' اور ''شعاعِ امید'' ایسی ہیں جن میں اقبال نے وطن سے محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک — بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

اسی طرح ارمغانِ حجاز میں بھی اقبال کی حب الوطنی اور اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کی خواہش کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گذر نیست

ترجمہ: ہندی غلاموں کی شب تاریک سحر آشنا نہیں ہے، گویا اس سرزمین پر آفتاب کا گذر ہی نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال کو اپنے وطن سے اس قدر لگاؤ تھا کہ انہوں نے یہاں کی مقدس و برگزیدہ شخصیات کو بڑی قدر اور عقیدت سے یاد کیا۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ انہوں نے 'رام' کو کس جوشِ عقیدت سے یاد کر کے کہا:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اور اسی طرح 'گرونانک' کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

علاوہ ازیں علامہ اقبال نے اپنے کلام میں سوامی رام تیرتھ، شنکر اچاریہ، بھرتری ہری، شیو، گوتم بدھ اور عارف ہندی کا تذکرہ بڑے احترام، محبت اور عزت سے کیا۔ چناں چہ علی سردار جعفری بھی اقبال کی حب الوطنی پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے ۔ان کی شاعری میں
سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان کی
آزادی کا جذبہ خونِ بہار کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔''

(علی سردار جعفری، اقبال شناسی ،ص11)

علامہ اقبال نے جب اپنے شاعرانہ کمال کو حب الوطنی کی اشاعت کے لیے وقف کیا۔ اقبال کی جن نظموں میں وطنیت اور وطن پرستی کے گیت نمایاں تھے، وہ نظمیں عوام میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ پڑھی اور سنی جا رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں جس انداز سے انسانیت اور حب الوطنی کا درس دیا ہے، ہندوستان میں بہت ہی کم شعراء ایسے نظر آئیں گے۔ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری وقت تک محبِ وطن رہے ہیں۔

8.4 نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا متن

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے ،میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کردیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم وہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے ،میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے ،میرا وطن وہی ہے

8.5 نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا تجزیہ

یہ نظم علامہ اقبالؒ کے مجموعہ کلام 'بانگِ درا' میں شامل ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں لکھی گئی ہے۔اُس وقت ہندوستان کی صورت حال یہ تھی کہ انگریزوں کے اقتدار کا دور دورہ تھا اور برطانیہ کا راج تھا،البتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنے اختلافات نہیں پائے جاتے تھے جتنے کہ بعد میں رونما ہوئے۔فرقہ واریت تھی لیکن تعصّبانہ ماحول کا اثر نہیں تھا۔مسلمان اور ہندو صرف انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔اس حوالے سے انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی تھی۔علامہ اقبال ہندوستان کی سرزمین سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔وہ پہلے نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان اور ہندوستان الگ الگ دو ملک بن جائیں،لیکن بعد میں جب تعصّبانہ ماحول زور پکڑنے لگا اور ایسے واقعات رونما ہو گئے کہ لوگوں کی سوچ ہی بدل گئی اور ایک تحریک چلی۔بعد میں یہ دونوں ملک (ہندوستان اور پاکستان) وجود میں آ گئے۔اس نظم کو لکھتے وقت علامہ اقبال نہیں چاہتے تھے کہ ملک کی تقسیم ہو،لہٰذا اُس وقت وہ اسی سرزمین سے اپنی محبت کا اظہار کرتے نظر آتے تھے۔اقبال کی وطن دوستی کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''اقبال وطن دوست ہیں ،لیکن وطن پرست نہیں۔اس لیے کہ اسلام نے حب وطن کو ایمان کا تقاضا سمجھتے ہوئے بھی اس کی پرستش ،بے جا طرفداری اور اس کے لیے اندھی عصبیت سے روکا ہے۔۔۔اقبال کا ذہن شروع ہی سے صاف تھا کہ اسلام،قومیت و وطنیت کا قائل نہیں۔''
>
> (نقوشِ اقبال،مولانا ابوالحسن علی ندوی،ص246)

اسی محبت اور وطن دوستی کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ نظم لکھی تھی۔اس میں انہوں نے ہندوستانی بچوں کی طرف سے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ملک کی وحدت اور یکجہتی کا گیت گا کر ہندوستان کے اوصاف کو ظاہر کرنے کے علاوہ اس کی عظمت کا بھی بڑے دلآویز انداز میں ذکر کیا ہے۔مولانا آزاد اور حالؔی کے زمانے سے شاعری میں بالخصوص اردو نظموں میں وطن کی محبت اور وطن پرستی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا،اسے علامہ اقبال نے جاری رکھ کر مزید وسعت بخشی۔اقبال کی یہ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' بھی اسی نوعیت کی نظم تصور کی جاتی ہے۔جس میں ہندوستان کی تاریخی،سیاسی،مذہبی اور صوفیانہ روایات کا اظہار کیا گیا ہے۔اس نظم میں انہوں نے ملک کی وحدت اور یکجہتی کا گیت گایا ہے۔

نظم کے پہلے بند میں علامہ اقبال نے قوم پرستی کی بہترین مثال قائم کی ہے۔انہوں نے یہ نظم بچوں کی طرف سے اپنے وطن کی محبت کے اظہار کے طور پر لکھی ہے۔کہتے ہیں کہ یہ وہ سرزمین ہے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچایا اور ہر خاص و عام میں فیض بانٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔سکھ مذہب کے پیشوا،بابا گرونانک جی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آپ اس زمین پر آئے اور خدا کی وحدت کا بول بالا ہوا اور اپنے پیروکاروں میں اس یقین کو جگایا کہ پروردگار صرف ایک ہے۔آگے ہندوستان میں رہنے والے مغلوں کی بات کی جن کی تاریخ

انہیں تاتاریوں سے ملاتی ہے۔ جب مغل ہندوستان میں آئے ،تب انہیں ہندوستان میں مستقل رہنے کی خواہش نہیں تھی، البتہ جب وہ یہاں رہنے لگے تو انہیں یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے ۔اقبال عرب علاقوں میں بسنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بھی یہاں آ کر اپنے وطن کو بھولنے پر مجبور ہو گئے۔

نظم کے دوسرے بند میں اقبال اپنے وطن کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں کے فلسفیوں اور دانشوروں نے اپنے علم و دانش سے ایسا جادو چلایا کہ یونان میں بسنے والے بھی ہمارے مفکرین کی فہم و فراست سے متاثر ہوئے اور علم و شعور کا ایک ایسا سمندر اس وطن سے جاری ہوا کہ دنیا سیراب ہوگئی۔آگے چل کر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یہ دھرتی ہی ایسی ہے جسے خدا نے اتنا زرخیز اور شاداب بنایا کہ اس سے اگنے والا ہر ذرہ سونے جیسی قیمتی دھات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب یہاں اس دھرتی پر مغل آئے تو اس زمین نے انہیں اس قدر امیر کر دیا کہ ان کی جھولیاں ہیروں سے بھر گئیں۔مراد یہ کہ یہ مٹی اتنی زرخیز تھی جس کی پیداوار نے مغلوں کو بے حد مال دار اور خوش حال بنا دیا۔یہی میرا وطن ہے جس میں ایسی خوبیاں موجود ہیں۔

اُس دور میں اقبال نے ہندوستان میں جذبۂ وطنیت کو گرما دیا تھا اور وطن پرستی پر ان کی کئی نظمیں عوام میں نہایت ہی جوش اور جذبے سے گائی اور سنی جا رہی تھیں۔اس حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم یوں رقم طراز ہیں:

> ''اقبال نے جب اپنے شاعرانہ کمال کو وطنیت کی خدمت کے لیے وقف کیا تو مسلمانوں کے علاوہ بلکہ ان سے زیادہ ہندو اس سے متاثر ہوئے:''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ملک کے طول وعرض میں گونجنے لگا،بعض ہندو مدارس میں مدرسہ شروع ہونے قبل تمام طالب علم اس کو ایک کورس میں گاتے تھے۔'' (فکرِ اقبال،خلیفہ عبدالحکیم،ص38)

تیسرے بند میں اقبال کہتے ہیں کہ فارس یعنی (ایران) گویا آسمان ہے اور اس پر چمکنے والے ستارے وہاں کے دانشور اور علم و حکمت سے لبریز لوگ ہو سکتے ہیں جو ایران چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستانی سرزمین میں داخل ہوتے ہی ان کے علم و شعور اور حکمت کی بنیاد پر انہیں اس قدر عزت و توقیر سے نوازا گیا کہ وہی ستارے اتنے اور ایسے چمکنے لگے جیسے آسمان پر کہکشاں ایک بہترین منظر پیش کرتی ہے یعنی علمی کہکشاں اور پھر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہی وہ زمین ہے جہاں لوگوں نے خدا کی وحدانیت کا ذکر سنا، جہاں کے بسنے والوں نے اللہ کو دیکھے بغیر ہی اس بات پر یقین کر لیا کہ اللہ صرف ایک ہے۔ ہر طرف اسی کی بادشاہی کے چرچے ہیں۔ایک حدیث بروایتِ حضرت ابن عباسؓ: آپ نے فرمایا کہ میں نے حضرت علی ابن طالبؓ سے سنا کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے ہند کی سرزمین سے ٹھنڈی ہوا محسوس ہوتی ہے۔'' حدیث کے اسی حصے کو بنیاد بناتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے یہ مصرعہ کہا کہ حضورؐ کو اسی سرزمین کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں محسوس ہوتی تھیں۔ جو اس بات کی دلیل اور ضمانت ہے کہ یہی وہ سرزمین ہوگی جہاں سے اسلام کا بول بالا ہوگا۔

نظم کے چوتھے اور آخری بند میں اقبال فرماتے ہیں کہ یہ وہ سرزمین ہے جہاں انسان خدائے برتر و بزرگ سے ہم کلام ہونے کی جرأت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔اس بند میں لفظ 'کلیم' استعمال ہوا ہے اور کلیم اللہ حضرت موسیٰؑ کا لقب ہے۔کلیم سے مراد کلام کرنے والا اور سینا اس وادی کا نام ہے جہاں کوہِ طور (یعنی طور کا پہاڑ) واقع ہے۔اقبال کے مطابق یہاں کے رہنے اور بسنے والے (باسی) رب کی قربت سے ہم کنار ہیں۔ یہاں

اقبالؒ نے اس امت کی عظمت کی داستان بیان کرنے اور سمجھانے کا ایک بہترین انداز اپنایا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس سرزمین کے بارے میں مزید اس بات کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ یہ وہ دھرتی ہے جس کے ساتھ جڑے ہوئے سمندر میں حضرت نوحؑ کی کشتی نے آ کر پڑاؤ ڈالا تھا۔ اسی وجہ سے اس سرزمین کی توقیر اتنی بلند ہے کہ جیسے آسمان۔ اور یہاں زندگی گزارنا، جنت میں گزارنے کے مترادف ہے۔ یہاں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ برصغیر کی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے مزین اور آراستہ کیا ہے۔ شاید اسی بنیاد پر علامہ اقبالؒ اسے جنت سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

یہ نظم اقبال کی قوم پرستی کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اس وقت کے حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اُس وقت انگریز حکمران ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر اپنے سیاسی اقتدار کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے مزید مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ غالباً یہ وہی دور ہے جب اقبالؒ پورے برصغیر میں ہندو مسلم کے اتحاد کے علمبردار تھے۔

8.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ☆ اپنی حب الوطنی پر مبنی شاعری کے حوالے سے اقبال وطن دوست تھے۔
- ☆ اس نظم کو علامہ اقبال نے بیسویں صدی کے شروع میں لکھا تھا۔
- ☆ اس وقت ہندو مسلم کے درمیان اتنے اختلافات نہیں تھے، جتنے بعد میں پیدا ہوئے۔
- ☆ یہ نظم ہندوستان کی تاریخی، سیاسی، مذہبی اور صوفیانہ روایات کا مظاہرہ کرتی ہے۔
- ☆ اسی دھرتی کے لوگوں نے خدا کی وحدانیت کا ذکر سنا اور اللہ کو دیکھے بغیر ہی اس بات پر یقین کر لیا کہ اللہ واحد ہے۔

8.7 کلیدی الفاظ

لفظ	:	معنی
چشتی	:	حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیر
نانک	:	سکھ مذہب کے بانی، گرو نانک جی جنہوں نے پنجاب میں توحید کا درس دیا
تاتاری	:	ترکستان کے باشندے، تیموری ترک یعنی مغل بادشاہ جنہوں نے ہندوستان میں سولہویں صدی عیسویں سے اٹھارویں صدی عیسویں تک حکومت کی اور مسلم ثقافت کو فروغ دیا۔
حجازی	:	حجاز کے رہنے والے یعنی مسلمان
یونانی	:	یونان کے رہنے والے، مراد یونان کے فلسفی جو ہندوستان کے فلسفے کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے تھے
ترک	:	ترکی کا باشندہ، مراد وہی تاتاری یا مغل
کہکشاں	:	ستاروں کا ایک جھرمٹ
فارس	:	اس سے مراد ایران ہے۔ زمانہ قدیم میں ایران کے ایک علاقہ کا نام فارس تھا، بعد میں پورے ایران کو فارس کہا گیا

لَے	:	سُر، آواز
میرِعربؐ	:	آنحضورؐ
نوحِ نبی	:	مشہور نبی جن کی بددعا سے پانی کا ایسا طوفان آیا تھا کہ سوائے ان لوگوں کے جو ان کی کشتی میں بیٹھے اور خدا پر ایمان رکھتے تھے، پوری قوم غرق ہوگئی تھی
کلیم	:	حضرت موسیٰؑ کا لقب
سینا	:	وادی سینا جہاں کوہِ طور واقع ہے
سفینا (سفینہ)	:	کشتی۔ شعری ضرورت کے تحت الف سے لکھا گیا
زینا (زینہ)	:	سیڑھی، اونچائی پر جانے کا ذریعہ

8.8 نمونۂ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں کتنے بند ہیں؟

2۔ اقبال کی کسی ایک نظم کا نام بتایئے جس میں وطنیت کے حوالے سے بات کی گئی ہو؟

3۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کس زمین پر پیغامِ حق سنایا؟

4۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت علامہ اقبال نے کس زمانے میں لکھا؟

5۔ اس نظم میں اقبال نے کس کی طرف سے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے؟

6۔ بانگ درا میں شامل پہلی نظم کا عنوان کیا ہے؟

7۔ ''بچے کی دعا'' کس کی نظم ہے؟

8۔ اقبال کا فارسی شعری مجموعہ ''جاوید نامہ'' پہلی بار کب شائع ہوا؟

9۔ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اقبال کے کس مجموعے میں شامل ہے؟

10۔ ''اقبال شناسی'' کس کی تصنیف ہے؟

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نانک کون تھے اور انہوں نے پنجاب میں کیا درس دیا تھا؟ بیان کیجیے۔

2۔ مغلوں نے ہندوستان میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ وضاحت کیجیے۔

3۔ درج ذیل بند کی تشریح کیجیے۔

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے

پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

4۔ نظم 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' کے مرکزی خیال کی وضاحت کیجیے۔

5۔ نظم 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' کا خلاصہ بیان کیجیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کی حب الوطنی پر اظہار خیال کیجیے۔

2۔ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا تجزیہ کیجیے۔

3۔ اقبال کی نظموں میں قوم کے تصور پر روشنی ڈالیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ کلیات اقبال (اردو و فارسی)	علامہ محمد اقبال
2۔ نقوشِ اقبال	مولانا ابوالحسن ندوی
3۔ اقبال سب کے لیے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
4۔ اقبال اور اردو نظم	پروفیسر آلِ احمد سرورؔ
5۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو	جگن ناتھ آزاد
6۔ فکرِ اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
7۔ اقبال شناسی	علی سردار جعفری

بلاک III: اقبال کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی 9: بانگِ درا کی شامل نصاب غزلیں

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 بانگِ درا کا تعارف

9.3 اقبال کی غزل کی خصوصیات

9.4 بانگِ درا کی شامل نصاب غزلیں

9.4.1 غزل نمبر 1: نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی

9.4.2 غزل نمبر 2: ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

9.4.3 غزل نمبر 3: الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے

9.4.4 غزل نمبر 4: کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں

9.5 اکتسابی نتائج

9.6 کلیدی الفاظ

9.7 نمونۂ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اقبال اردو زبان کے صرف ایک عام سے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا شمار بیسویں صدی کے عظیم المرتبت شاعروں اور مفکروں میں ہوتا

ہے۔اقبال کے کلام میں شاعری وفلسفہ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کے یہاں ایک واضح نظام فکر پایا جاتا ہے۔اقبال کے کلام کو سمجھنے کے لیے ان کی فکر کی گہرائیوں کا مشاہدہ اور ان کے فن کی نزاکتوں کا غائر مطالعہ ضروری ہے۔اقبال کبھی والہانہ انداز سے انسانی جذبات کو منعکس کرتے ہیں تو کبھی اپنے افکار عالیہ سے تقدیر کے سربستہ رازوں کو منکشف کرتے ہیں اور کبھی اپنے حکیمانہ مشوروں سے ملت کی رہنمائی کرتے ہیں۔اقبال کی شاعری اپنے اندر گہرائیاں اور وسعتیں رکھتی ہے۔جس طرح ان کی زندگی میں مشرق ومغرب کے علم وحکمت کا امتزاج ملتا ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی مشرقی روحانیت اور مغربی علم وحکمت کا اجتماع نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال ایک کامیاب نظم گو شاعر ہی نہیں بلکہ غزل گو شاعر بھی ہیں۔ان کے دور میں غزل کے مختلف انداز موجود تھے جیسے روایتی غزل، رومانوی غزل اور غزل مسلسل وغیرہ۔اقبال نے جس دور میں غزل گوئی کی طرف توجہ دی اس عہد میں فانی بدایونی، سیماب اکبرآبادی، عزیز لکھنوی، اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، ریاض خیرآبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔اقبال کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو سے استفادہ کے ساتھ ساتھ غزل کے روایتی اور جدید رجحانات کو بھی قبول کیا۔اس لیے ان کی غزلوں کو روایت اور جدیدیت کا سنگم کہا جاتا ہے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ بانگِ درا کا تعارف پیش کر سکیں۔
- ☆ اقبال کی غزل کی خصوصیات کو بیان کر سکیں۔
- ☆ شامل نصاب غزلوں کا مطالعہ کر سکیں۔

9.2 بانگ درا کا تعارف

اقبال کا پہلا مجموعہ بانگ درا ہے جو 3 ستمبر 1924 کو شائع ہوا۔یہ اقبال کی 1901 سے 1924 تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔بانگ درا میں اقبال کی چوبیس سال کی تخلیقات شامل ہیں۔یہ مجموعہ ان کے اردو مجموعوں میں سب سے ضخیم ہے۔تاریخی اعتبار سے یہ مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے۔پہلے حصے میں 1901 سے 1905 تک کا کلام ہے اس کے بعد اقبال انگلستان چلے گئے اس لیے دوسرا حصہ 1905 سے 1908 تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔یورپ سے واپس آنے کے بعد سے 1924 تک لکھی گئی نظموں کو تیسرے حصے میں رکھا گیا ہے۔اس مجموعے میں 143 نظمیں اور 28 غزلیں موجود ہیں۔موضوعات کے اعتبار سے ان میں تنوع ہے۔بچوں کے لیے لکھی جانے والی نظمیں، اخلاقی نظمیں، اور حب الوطنی سے متعلق تمام نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔طویل نظموں میں تصویر درد، شکوہ، شمع اور شاعر، جواب شکوہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ، طلوع اسلام وغیرہ شامل ہیں۔ان میں بیشتر طویل نظمیں ''بانگ درا'' کے تیسرے حصے میں شامل ہیں۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور زمانۂ طالب علمی یعنی 1901 سے شروع ہو کر 1905 پر ختم ہوتا ہے۔یہ وہ عرصہ ہے جس کے دوران میں اقبال نے اردو ادب کو قومی اور وطنی شاعری کا بہترین سرمایہ دیا ہے۔ایک روشن خیال اور صاحب فکر نوجوان کی حیثیت سے اقبال مغربی تصورات سے

متاثر ہو رہے تھے۔ وطن، قومی اتحاد اور بیرونی سامراج کے خلاف جدو جہد کے جذبات نے ان کے افکار میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ بانگ درا کی پہلی نظم 'ہمالہ' ہے۔ یہ نظم ایک وطن پرست انسان کی مردہ حسیات کو زندہ کرنے کے لیے برقی رو کا کام کرتی ہے۔ یہ نظم 1901 میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم نے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

اقبال کو نہ صرف ہندوستان کے کوہ و صحرا سے وابستگی اور انسیت تھی بلکہ انہوں نے ہندوستان کی کئی شخصیات کو بھی نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ادبی شخصیتوں میں مرزا غالب' داغ' سر سید احمد خاں' عبدالقادر، عرفی، شیکسپیئر وغیرہ ہیں۔ اقبال کے پہلے دور کا کلام جوش و اثر اور ترنم و آہنگ سے مالا مال ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بھی متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں۔ اقبال کا عہد ہندوستان کی محکومی کا عہد تھا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کی اس حالت زار کو بادیدۂ نم دیکھا۔ کیوں کہ انہیں اس غلامی کا شدید احساس تھا۔ ان کی نظم ''پرندے کی فریاد'' ان کے اس احساس کی غمازی کرتی ہے۔ اس نظم کا ڈھانچہ انگریزی نظم سے مستعار لیا گیا ہے لیکن نظم کا سارا آب و رنگ شاعر کے اپنے تخیل کی ایجاد ہے۔ قیدی پرندے کی تمثیل میں اقبال نے دراصل ایک غلام قوم کا حال دل بڑے ہی درد بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں ہندوستانی آپس میں دست و گریبان تھے۔ تقسیم بنگال کے مسئلے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر اقبال کے دل سے بے اختیار ''صدائے درد'' نکل پڑتی ہے۔ اپنی نظم ''صدائے درد'' میں اقبال نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر اس نفاق انگیز فضا کا تدارک نہ کیا جائے تو وہ ہندوستان کی وطنیت کے تصور کو متاثر کرے گی۔ یہ نظم 1902 میں مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں اقبال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی خرمن کے دانوں سے تعبیر کیا ہے اور ان کے اختلافات پر بے انتہا افسوس کیا ہے۔ اقبال نے پوری نظم میں ان تمام نزاعات کی مذمت کی ہے جن سے ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں میں تفرقہ کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس طرح 'سید کی لوحِ تربت' شاعر' ترانہ ہندی' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' نیا شوالہ اس دور کی یادگار نظمیں ہیں جن میں حب وطن اور قومی یکجہتی کے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔

اقبال کی قومی شاعری کا دوسرا دور 1905 کے بعد سے شروع ہوتا ہے جب انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان کا سفر کیا۔ اس وقت ان کی طبیعت اور شخصیت میں پختگی آ چکی تھی۔ قیام یورپ کے دوران اقبال کو یورپ کی مختلف قوموں کے باہمی رقابتوں کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس زمانے کے کلام کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ نئے مشاہدات اور خیالات نے ان کے دل میں ایک جوش طلاطم پیدا کر رکھا تھا۔ ان خیالات کو انہوں نے اپنی نظم ''شیخ عبدالقادر'' میں ظاہر کیا ہے جو یورپ میں ان کے ہم سفر اور ہم مشرب تھے۔ اقبال نے یورپ کے منفی اور مثبت اقدار کا مطالعہ کیا جس سے نظر میں وسعت' فکر میں گہرائی اور فن میں ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ انگلستان کے قیام کے زمانے کے کلام سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں محض خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے حق میں مضر ہے۔ دوسرے وہ یورپ کی وطنیت اور قوم پرستی کے نظریے سے سخت بیزار نظر آتے ہیں اور ان کی تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لیے مہلک سمجھتے ہیں۔ اس دور کے کلام میں انہوں نے بلا قید مذہب و ملت ہندوستان کی عظیم المرتبت شخصیتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانی اقدار کے حامل تھے۔ ان عظیم شخصیتوں میں سوامی رام تیرتھ' مہاتما بدھ' رام چندر جی' گرو نانک غلام قادر روہیلہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اقبال نے بیک وقت غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ بحیثیت غزل گو اقبال نے داخلی جذبات کی نمائندگی بھی کی اور خارجی جذبات

کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اقبال کی شاعری کا ابتدائی دور قدیم رنگ کا پاس دار رہا۔ مرزا داغ دہلوی سے استفادہ کی وجہ سے ان کی غزل گوئی پر قدیم رنگ تغزل چھایا رہا۔ اقبال کی غزل گوئی کا پہلا دور روایتی انداز سے وابستہ ہے۔ بانگ درا کی حصہ اول کی غزلیں اسی روش کی نمائندگی کرتی ہیں۔

غزل گوئی کے دوسرے دور میں اقبال نے زبان کی نزاکتوں اور لفظوں کے محل استعمال پر توجہ دی ہے۔ اس دور میں داغ کے مخصوص رنگ سخن اور انداز فکر کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد اقبال، غالب کی طرف مائل نظر آتے ہیں یہ اقبال کی غزل کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ تھا لیکن غالب بھی اقبال کی منزل مقصود نہ بن سکے۔ غالب کا رنگ و آہنگ اقبال کی کی غزل گوئی میں ملاحظہ ہو۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست
محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

بانگ درا کے حصہ دوم اور سوم کی غزلوں میں اقبال کا رشتہ داغ اور غالب سے ٹوٹ چکا ہے۔ اقبال کی ابتدائی غزلوں میں مخصوص لب ولہجہ خطیبانہ اور اکثر اوقات بیانیہ کے انداز میں ابھرتا ہے غزل گوئی کے چوتھے مرحلے میں پہنچ کر اقبال کی غزلیں فکر وفن کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں انسانیت کی ہمہ گیری اعلیٰ تخیل کی پیش کشی کے علاوہ شعری حسیت سے وابستگی کو روا رکھا ہے۔ انہوں نے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے رجحانات کے علاوہ فکر اور تصورات سے غزل کو وابستہ کر کے اس صنف کو وسعت بخشی۔ اقبال کی غزل گوئی میں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے نئی جہت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے روایتی غزل کے علاوہ غزل مسلسل کی روایت کو فروغ دے کر غزل کی صنف کو نظم سے قریب کر دیا۔

9.3 اقبال کی غزل کی خصوصیات

غزل اردو کی سب سے مقبول اور ہر دل عزیز صنف سخن ہے مگر سب سے زیادہ ہدف ملامت بھی یہی بنتی رہی۔ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے رہے پھر بھی اس کی مقبولیت کسی دور میں کم نہیں ہوئی۔ اقبال پیامی شاعر تھے اور شاعری سے زیادہ اپنے فلسفے کو اہمیت دیتے تھے لیکن وہ اس بات سے واقف تھے کہ فلسفہ و پیغام اور پند و نصیحت سب رائیگاں ہیں اگر ان کی پیش کش دل کش و پر تاثیر نہ ہو۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ان تمام شعری وسائل کا بھرپور استعمال کیا جو کلام کو رعنائی عطا کرتے ہیں۔ غزل کی سحر انگیزی سے بھی وہ پوری طرح واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے پیغام کے لیے غزل کو بھی استعمال کیا اور جہاں وسعت درکار ہوئی وہاں نظم کی وہ شکل بھی اختیار کی جو غزل کے زیادہ قریب تھی۔ نظموں میں وہ اکثر ترکیب بند کا انتخاب کرتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا اور غزل گوئی کا یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اقبال کی تخلیقی صلاحیت کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ ان کی غزل کے روپ بتدریج بدلتے رہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں پر داغؔ اور امیرؔ کا رنگ غالب ہے۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اس اثر سے آزاد ہوتے گئے اور ان کا اپنا مخصوص انداز نمایاں ہوتا گیا۔ اقبال کی غزل میں اس صنف کا ایک طویل سفر، روایت سے واضح انحراف اور ایک نمایاں ارتقا نظر آتا ہے جس نے

غزل کو وقار عطا کیا اور اس الزام سے بری کر دیا کہ اس میں معاملات حسن و عشق کے سوا کسی اور مضمون کی گنجائش نہیں۔ اقبال نے ثابت کر دیا کہ غزل میں ہر طرح کے مضامین ادا کیے جا سکتے ہیں اور پیچیدہ سے پیچیدہ فلسفیانہ خیالات بھی غزل میں جگہ پا سکتے ہیں۔

اقبال نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو ہر طرف امیؔر و داؔغ کی غزل کے چرچے تھے۔ نو آموز شعرا انہی کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے اقبال نے بھی اس روش عام کی پیروی کی۔ امیؔر سے زیادہ وہ داؔغ کی طرف مائل تھے اس لیے انہوں نے ان کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی۔ لیکن سطحی غزلیں اور عامیانہ مضامین ان کی وسعت طبع کو وہ جولانی نہ عطا کر سکے جس کے وہ متقاضی تھے۔ اس لیے ان کی غزل میں فلسفہ و فکر کا عنصر نمایاں ہونے لگا۔ بانگ درا کی ترتیب کا وقت آیا تو روایتی انداز کی غزلیں اس مجموعے میں جگہ نہ پا سکیں۔ البتہ دو ایک غزلیں نمونے کے طور پر شامل کر لی گئیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل غزل جو داغ کے رنگ میں کہی گئی:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اس طرح کی شاعری اقبال کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے اس طرز شاعری کو خیر باد کہہ دیا اور اس شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے جس کا تقاضا ان کی افتاد طبع کرتی تھی۔ 'بانگ درا' کی ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

نظارے کی ہوس میں وہ اردو کی روایتی شاعری سے یکسر دور ہوتے گئے، لیکن چوں کہ بانگ درا میں شامل نظمیں ان کے ابتدائی زمانے کا پتہ دیتی ہیں اس لیے بانگ درا کی غزلوں میں اقبال کے دونوں رنگوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ وہ رنگ بھی جسے انہوں نے خدا حافظ کہہ دیا تھا اور وہ بھی جو اب نمودار ہو چلا تھا۔ جس کی مثال میں یہ شعر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

جرس ہوں، نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقت رحیل کارواں تک ہے

یہ اشعار اس منزل کا پتہ دیتے ہیں جس کی طرف اب اقبال کی شاعری کا رخ تھا۔ یعنی اب اقبال نے داغ کے بجائے غالب کو اپنا معنوی استاد تسلیم کر لیا تھا۔

اقبال کی غزل کی پہلی شناخت اس کا فکری عنصر ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فکر کو فن بنا دیا۔ افکار و خیالات بلکہ قوم کے اجتماعی مسائل کو اس طرح محسوس کیا جیسے وہ ان کی ذاتی واردات ہوں پھر اسے فنی مہارت کے ساتھ غزل میں سمو دیا۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ شاعری کو فلسفہ و فکر سے دور ہی رہنا چاہیے۔ غزل کا فن بڑا نازک فن ہوتا ہے۔ غزل کی تنگ دامانی کسی فلسفہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن غزل کا فن جذبہ و

خیال کو اشاروں اور کنایوں میں ادا کرنے کا فن ہے۔غزل کی اس خصوصیت سے شاعر فائدہ اٹھاتا ہے اور رمز و کنایہ سے کام لے کر دو مصرعوں میں اتنا کچھ کہہ جاتا ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے صفحات اور بعض اوقات پوری کتاب بھی کافی نہیں ہوتی۔اقبال نے یہی کیا اور فلسفہ و فکر سے غزل کو لازوال بنا دیا۔

غزل کا خمیر ہی محبت سے اٹھا ہے۔جذبہ عشق ہی غزل کا اصل محرک ہے۔اقبال کی غزل میں بھی عشق کی زبردست کارفرمائی نظر آتی ہے۔لیکن اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم بدل جاتا ہے۔اردو غزل میں عشق مجازی کا ذکر بہت رہا ہے یعنی انسان کی انسان سے محبت یا پھر عشق حقیقی کا تصور ہے کہ انسان محبوب حقیقی یعنی خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔اقبال اسے بالکل ہی مختلف معنی میں استعمال کرتے ہیں۔کسی نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جائے اور اس خلوص اور لگن کے ساتھ کی جائے جس میں جذبۂ عشق کی سی شدت اور آرزومندی موجود ہو۔یہی عشق ہے۔اقبال کی فکر میں عشق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔اس سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔فلسفہ عشق کی وضاحت تو نظموں میں ہوئی ہے لیکن غزلوں میں بھی ایسے بے شمار اشعار موجود ہیں جن میں عشق کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ اقبال کے متعدد گوشے ہیں جنہیں اقبال اپنے کلام میں موقع بہ موقع پیش کرتے ہیں۔مسلمان صوفیا نے جبر کے عقیدے کو بہت عام کر دیا تھا اقبال نے اختیار کے فلسفے سے اس کی نفی کی اور اس پر زور دیا کہ انسان اپنی تقدیر کا آپ معمار ہے۔اقبال کے نزدیک ترقی اور بلند پروازی کے لیے ضروری ہے کہ اس کا سینہ امیدوں' آرزوؤں اور ولولوں سے معمور ہو۔اقبال اپنی شاعری کے ذریعے امید کا پیغام دیتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ کوششیں یقیناً کامیاب ہوتی ہیں۔

پیکر تراشی میں اقبال کو بڑا کمال حاصل ہے۔ان کی نظموں میں مرقع کشی کے بہترین نمونے موجود ہیں لیکن غزل کے اشعار میں بھی بے شمار تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔شاعری میں فکر کا عنصر جتنا زیادہ ہو تصویر کشی کا امکان اتنا ہی کم ہو جاتا ہے۔اقبال نے اپنے افکار کو محسوس فکر بنا کر پیش کیا اس لیے تصویر کشی کے زیادہ مواقع فراہم ہو گئے۔متحرک تصویر کبھی اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ ڈرامائی انداز پیدا ہو جاتا ہے۔اقبال کی نظم میں ڈرامائی عنصر کی فراوانی ہے لیکن ان کی غزلوں میں بھی بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔مثلاً

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال کی غزلوں کا خاص وصف موسیقیت ہے۔لفظوں کے انتخاب اور ان کے دروبست میں وہ اس بات کا پورا اہتمام کرتے ہیں کہ شعر میں دلکش صوتی آہنگ پیدا ہو جائے۔اقبال کی غزل ایک خاص مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی اس مقصد کا تقاضا تھا کہ اسے بعض اہم تبدیلیوں سے روشناس کیا جائے۔غزل شاعر کی ذاتی واردات کے لیے مخصوص رہی ہے اقبال نے اسے قومی امنگوں کا ترجمان بنایا اور اجتماعی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔غزل کو معنوی تسلسل اور وحدت تاثر سے آشنا کیا۔ان کی غزلوں کو غزل مسلسل کا نام تو نہیں دیا جاسکتا لیکن ہر غزل کسی ایک مزاجی کیفیت

کی حامل ہے اور اس میں معنوی ربط نظر آتا ہے۔ اقبال نے غزل میں استعارہ، علامت اور تلمیح کا بھرپور استعمال کیا ان کی اکثر غزلیں غیر مردف ہیں۔ غزل کی زبان کے بارے میں یہ عام تاثر رہا ہے کہ اس میں ثقیل الفاظ اور کرخت آوازوں کی گنجائش نہیں۔ اس میں نرم، شیری سبک اور مترنم الفاظ ہی کھپ سکتے ہیں۔ اقبال کی غزل نے یہ تصور باطل کر دیا۔ ان کی غزل میں کھردرے ثقیل اور نامانوس الفاظ بھی ملتے ہیں۔

اقبال کی غزل اردو شاعری کی ایک نئی آواز ہے اقبال نے غزل کو قوم کی مسیحائی کے لیے استعمال کیا، پیغامبری کا ذریعہ بنایا مگر اس کی رعنائی و دل کشی میں کمی نہیں آنے دی۔ سیاسی افکار، فلسفیانہ خیالات، سماجی رجحانات، ملی و قومی مسائل نے ان کی غزل میں جگہ پائی مگر غزل کے اہم اوصاف رمزیت و اشاریت، ابہام، تخیل کی بلندی، احساس کی شدت، پیرایہ بیان کی دل آویزی برقرار رہے۔ اردو غزل جو نا امیدیوں اور مایوسیوں کی آماج گاہ تھی اقبال نے اسے امیدوں اور امنگوں کی جولان گاہ بنا دیا۔

9.4 بانگِ درا کی شامل نصاب غزلیں

9.4.1 غزل نمبر 1: نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی!

تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

کھنچے خود بہ خود جانب طور موسیٰ ؑ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی!

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

تشریح:

یہ غزل 'بانگِ درا' کے حصہ اول کی دوسری غزل ہے۔ ذیل میں اس کے اشعار کی تشریح کی جارہی ہے۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

شاعر نے اس غزل میں عشق ومحبت کی مختلف کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے معشوق! تم ہم سے ملاقات کے لیے آنا نہیں چاہتے تو نہ آتے ۔اگر تم نہ بھی آتے تو ہم تم سے کوئی بحث وتکرار نہیں کرتے اور نہ ہی ملنے کی ضد کرتے ۔تم اگر آنے کا وعدہ کر لیتے تو ہمیں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی کہ تم نے میری بات رکھ لی۔ چاہے اس کے بعد تم نہ آتے ۔آخر تمہیں وعدہ کرنے میں کیا شرم درپیش تھی جو تم نے ہمارا دل توڑ دیا۔ بین السطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب نے شاعر سے کئی مرتبہ آنے کا وعدہ کیا، لیکن اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب اسے نیا وعدہ کرتے ہوئے شرم آرہی ہے۔

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

عاشق کے عشق کا معاملہ جو کہ راز تھا سب کو معلوم ہو گیا اور محبوب کی رسوائی ہوئی، جس سے محبوب عاشق پر سخت خفا ہوا اور اسے برا بھلا کہنے لگا عاشق اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے تم مجھ پر جو برہم ہو رہے ہو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ۔ یہ تو تمہارے قاصد کی خطا تھی کہ اس نے موقع محل دیکھے بغیر راز کی باتیں کہہ ڈالیں اور سارا بھید کھول دیا۔ یعنی تمہارے قاصد کی وجہ سے تم بدنام ہوئے ۔تم نے ایک نادان کو اپنا قاصد بنایا جس کی حماقت سے ہمارے عشق کا بھید کھل گیا۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

میرے معشوق تیری ذہانت کے کیا کہنے کہ بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑ لیا' پہچان لیا اور اس تاڑے جانے کی خبر صرف تیرے عاشق کو ہوئی دوسروں کو نہیں۔ تمہاری آنکھ مست ہونے کے باوجود کیسی ہشیار تھی کہ اپنے چاہنے والے کو تاڑ لیا۔ اس شعر میں محبوب کے حسن وجمال کی تعریف کی گئی ہے کہ اگر چہ تو اپنے حسن وجمال کی شراب سے سرشار ہے تیری آنکھوں سے مستی ٹپکتی رہتی ہے لیکن اس بے خودی میں بھی تیری ہشیاری یہ ہے کہ تو اپنے عاشق کو نہیں بھولا اور بھری بزم میں اسے پہچان کر اس پر لطف وعنایت کی نظر کرتا رہا۔

تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

اے قاصد! مجھے یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ میرے محبوب کو میرے پاس آنے میں ہچکچاہٹ ہے اور وہ انکار کر دے گا۔ تاہم میں اس کے دل کا حال جاننا چاہتا ہوں۔ یہ تو بتا کہ اس کے انکار کا انداز کیا تھا؟ وہ کن لفظوں میں تامل سے کام لے رہا تھا اس کے انکار میں غصہ تھا، جھلاہٹ تھی، نفرت تھی، پیار تھا، ناز وعشوہ تھا، مصلحت تھی یا کیا تھا؟ اس کی وضاحت کرتا کہ اس کی گفتگو کے انداز سے اس کے دل کی کیفیت جان سکوں۔

کھنچے خود بہ خود جانب طور موسیٰؑ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

حالاں کہ حضرت موسیٰ کو بھی معلوم تھا کہ خدا کو آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود محبوب کا جلوہ دیکھنے کی تڑپ اس قدر تھی کہ وہ کوہ طور کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ اے شوق! کیا کشش تھی تیری کہ اس کی دید ممکن نہیں ہے، یہ جانتے ہوئے بھی حضرت موسیٰ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ آگے ہی بڑھتے گئے۔ مطلب یہ کہ اگر عاشق صادق کا شوق دیدار کمال پر پہنچ جائے تو وہ خود اسے معشوق کی جانب لے جا کر دید کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ چوں کہ اس شعر میں ایک تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے اس لیے یہ شعر صنعت 'تلمیح' کے ذیل میں آتا ہے۔

کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

اے اقبال! تیری گفتگو میں کوئی جادو تھا۔ زمانہ گزر گیا مگر تیرا ذکر، تیری گفتار کا تذکرہ کسی کی محفل میں آج بھی ہوتا رہتا ہے۔ یعنی تیری گفتگو میں ایسا اثر تھا کہ محبوب کی بزم میں ہر ایک کی زباں پر تیرا ہی تذکرہ ہے اور یہ تیرے عشق کا کرشمہ ہے۔

9.4.2 غزل نمبر 2: ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

تشریح:

یہ غزل اقبال کے پہلے مجموعے 'بانگ درا' کے حصہ اول کی دسویں غزل ہے۔اس کی تشریح ملاحظہ کیجیے۔ یہ غزل جنوری 1904 کے مخزن میں چھپی تھی۔جس کے پندرہ شعر تھے،نظر ثانی میں صرف چھ باقی رکھے۔اقبال نے اس غزل میں عشق کی متعدد کیفیات بیان کی ہیں۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

شاعر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے محبوب!! میری ناسمجھی بھی دیدنی ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ میں تیرے عشق کی انتہا کا آرزومند ہوں۔ یہ کیسا عشق ہے جس کے لیے انتہا کی آرزو کی جارہی ہے؟ عشق تو کبھی بھی اپنی نہایت کو نہیں پہنچتا' بلکہ اس میں اضافہ کی گنجائش ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔اس کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔ میں بھی کتنا سادہ لوح ہوں کہ تجھ سے مانگا بھی تو کیا مانگا۔

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

اے میرے محبوب!! تیری طرف سے کوئی ستم ہو یا تو اپنے چہرہ سے نقاب ہٹانے کا وعدہ کرلے' کچھ بھی سہی: مجھے تو تیری طرف سے ایک بات کی خواہش ہے جس سے میں اپنے صبر کی آزمائش کرسکوں۔ مجھے تو یہ جاننے کی خواہش ہے کہ تیرے عشق میں کس قدر صبر کرسکتا ہوں۔یعنی یہ کہ معشوق کا ظلم وستم ہو یا چہرے سے پردہ ہٹانے کا وعدہ۔ ہر دو صورتوں میں عاشق کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔بس میں اپنا صبر آزمانا چاہتا ہوں کیوں کہ مجھے اس میں لذت ملتی ہے۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

عاشق کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ صرف محبوب کا دیدار حاصل ہو،اس کے بدلے اسے دنیا بھر کی آرام وآسائش قبول نہیں۔اقبال کہتے ہیں کہ یہ جنت زاہدوں کو مبارک ہو۔اے محبوب! مجھے تو آپ کے روبہ رو ہونے' یعنی آپ کے دیدار کی خواہش ہے۔زاہدوں کی تمام عبادتیں فقط جنت کی نعمتوں کے لیے ہوتی ہیں۔ جب کہ ایک حقیقی عاشق جنت کے عیش وآرام سے بے نیاز' صرف اور صرف محبوب کے دیدار کا خواہش مند ہوتا ہے۔اس شعر میں محبوب سے مراد مجازی محبوب یعنی انسان بھی ہوسکتا ہے اور حقیقی محبوب یعنی خدا بھی۔

ذرا سا تو دل ہوں' مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

میں ایک چھوٹا سا دل ہوکر بھی اس قدر خوش باش اور بے باک ہوں کہ آپ سے اے محبوب حقیقی! وہی صدائے ''لن ترانی'' (تم مجھے ہر

گز نہیں دیکھ سکتے) سننا چاہتا ہوں جو تو نے طور پر حضرت موسیٰ کو سنائی تھی۔ مطلب یہ کہ مجھے تیری زبان سے انکار کے الفاظ سننے میں مزا آتا ہے۔ کیوں کہ محبوب کا دیدار نہ سہی اس کی آواز سننا بھی کچھ کم لطف نہیں رکھتا۔ محبوب انکار کے لیے ہی سہی ہم کلام ہو یہ بھی بہت بڑی خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

اے اہل محفل میں تو اب تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔ میری حالت اور میرا معاملہ صبح کے اس چراغ کی مانند ہے کہ بس اب بجھا کہ تب بجھا۔ میں بھی انسان ہوں اور انسان فانی ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس دنیا سے کوچ کر سکتا ہے۔ چراغ سحری کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ بجھنے کے قریب ہوتا ہے اور کبھی بھی بجھ سکتا ہے۔ اسی طرح میری زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کسی بھی وقت اس دنیا سے کوچ کر سکتا ہوں۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

میں نے عشق کا دعویٰ کرنے والوں کی بھری محفل میں عشق کے راز کھول دیے۔ بڑا بے ادب ہوں' جو میں نے اظہار کر دیا۔ افشائے راز کر دیا۔ میرے محبوب! میری اس گستاخی پر مجھے سزا دے۔ یعنی عشق کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق ہمیشہ خاموش رہے۔ محبوب خواہ نظر التفات کرے یا پھر ظلم وستم۔ اسے کسی بھی حالت میں زبان سے اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

9.4.3 غزل نمبر تین 3: الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے:

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری' مجھے سر پیرہن نہیں ہے

ملا محبت کا سوز مجھ کو' تو بولے صبح ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو' تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہم نفس میسر' یہ دیس نا آشنا ہے اے دل!
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا' کہاں کا جانا' فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری' کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

تشریح:

یہ بانگ درا کے حصہ دوم کی دوسری غزل ہے۔تشریح ملاحظہ ہو:

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھادے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سر پیرہن نہیں ہے

اقبال نے اس غزل میں جدید تصورِ قومیت نیز مادی ترقی کی نفی اور آفاقی نظریہ سے وابستگی اور علوے معنویت کا اثبات کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے خدا! دنیاوی اعتبار سے ''مبارک قدم''، عقل کو محبت رسولؐ کی ذرا سی دیوانگی سکھادے۔اسے بار بار بخیہ گری کرنے یعنی لباس کے سینے کا خبط ہے اور مجھے سرے سے لباس کا ہوش ہی نہیں۔یعنی عقل مجھے دنیا کی طرف مائل کر رہی ہے جب کہ مجھے دنیا مطلوب نہیں۔میرے دل کو بس عشقِ رسولؐ سے منور کر دے تا کہ میں زندگی کا خاطر خواہ مقصد حاصل کر سکوں۔

ملا محبت کا سوز مجھ کو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

جب صبحِ ازل خدا نے یہ دنیا پیدا کر کے اپنے بندوں میں نعمتیں تقسیم کیں تو مجھے سوزِ محبت عطا ہوا یہ دیکھ کر فرشتے بولے تو شمعِ مزار کی مانند ہے، جسے تنہا رہنا اور تنہا جلنا ہوتا ہے۔تیرے نصیب میں کوئی بھی انجمن یا محفل نہیں۔یعنی عاشق کی زندگی شمعِ مزار کی طرح ہوتی ہے کیوں کہ وہ اسی کی طرح عمر بھر جلتا رہتا ہے۔اسے کوئی ہمدرد اور دکھ درد بانٹنے والا نہیں ملتا۔اس شعر کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے، جس طرح مزار پر جلنے والی شمع اکیلی ہوتی ہے۔اسی طرح حق کی بات کہنے والا اور حق کی مشعل اٹھائے رکھنے والا بھی ایک ہی ہوتا ہے، اس کا ساتھ دینے والے بہت کم ہوتے ہیں۔اکثریت اس کا ساتھ نہیں دیتی کیوں کہ حق گوئی میں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل!
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

اے دل! تو بھی کس چیز کا طلب گار ہے؟ زمانۂ دراز سے آسمان کے نیچے یعنی اس دنیا میں کسی کو کوئی پکا اور سچا دوست میسر نہیں ہوا۔دنیا میں بے لوث محبت نایاب ہے۔مطلب یہ کہ اس دنیا میں بے غرض اور مخلص دوست ملنا مشکل ہے۔مادہ پرست اور مال و دولت کے پیچھے بھاگنے والی اس دنیا میں حق و صداقت کی بات کہنے والے کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔لوگ مصلحت شناس ہوتے ہیں وہ سچائی کا ساتھ نہیں دیتے۔وہ دوست جو ہر حال میں سچ بولنے والے کا ساتھ دیں، کم یاب ہیں۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

سرزمین عرب سے ظاہر ہوئے معمار انسانیت نے قومیت کا کیا خوب اور انوکھا معیار عطا کیا۔لوگ کیا کیا سمجھتے رہے۔جب کہ درحقیقت

قوم وملت کی بنیاد علاقائی سرحدیں نہیں ہوتیں بلکہ آفاقی عقائد ہوتے ہیں۔مطلب یہ کہ رسول اللہؐ نے قوم کا قلعہ ساری دنیا سے انوکھا تعمیر کیا ہے۔اس کی بنیاد توحید ورسالت کے عقیدے پر ہے۔مسلمانوں کا وطن سارا عالم ہے کیوں کہ مسلمان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ملت اسلامیہ کو دوسری قوموں کے اس اصول سے کوئی سروکار نہیں کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔اسلام میں ملت یا امت کا تصور وہ ہے جو دین وایمان کی بنیاد پر بنتی ہے۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا' فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری' کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

ہم اس دنیا میں کسی ایسے عالم سے نہیں آئے اور نہ ہی اس دنیا سے کسی ایسے عالم میں جائیں گے جو ہماری کائنات کا حصہ نہ ہو۔آنا اور جانا فقط اعتباری باتیں ہیں۔کائنات کے ہر حصے میں ہم موجود ہیں اور ہر شئے میں ہماری نمود ہے۔کوئی ایک خاص خطہ یا عالم ہمارا وطن نہیں' بلکہ پوری کائنات ہمارا وطن ہے۔

مدیر مخزن سے کوئی اقبالؔ جاکے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں' انھیں مذاق سخن نہیں ہے

اے اقبال! کوئی شخص جاکے رسالہ مخزن کے مدیر شیخ عبدالقادر سے یہ کہہ دے کہ دنیا میں آج جو قومیں سربلند ہیں ان کے افراد اپنا قیمتی وقت شعروشاعری میں صرف نہیں کرتے' بلکہ اجتماعی ترقی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔وہ ہر وقت تگ ودو اور جدوجہد میں لگے رہتے ہیں کہ عظمت و کمال کے میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

9.4.4 غزل نمبر 4: کبھی اے حقیقت منتظر' نظر آ لباس مجاز میں:

کبھی اے حقیقت منتظر' نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو' تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے' ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں' نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو، زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

تشریح:

یہ غزل 'بانگ درا' کے حصہ سوم کی چھٹی غزل ہے۔ تشریح ملاحظہ ہو:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اقبال نے اس غزل میں ذوق بندگی کے مختلف احساسات اور بندے کے اپنے مشاہدات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے وہ حقیقی ذات کہ جس کے دیدار کا بندگی کو انتظار ہے، کبھی تو مجاز کے پردے میں نظر آ۔ میری نیاز مندی سے معمور پیشانی میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں کہ مسجود ظاہر ہو تو میں ان کو اس پر نچھاور کر دوں۔ یعنی محبوب حقیقی! تیرا جلوہ اور تیری شان تو کائنات کے ذرے ذرے سے عیاں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو کسی مجازی شکل میں میرے سامنے آ جائے اور میں ان آنکھوں سے تیرا دیدار کروں، پھر تیرے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاوں۔

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوائے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

اے بندۂ مسلم! تو وہ آواز ہے جس کو زوال نہیں۔ کبھی تو بلند آہنگ ایمانی نغمہ کی صورت میں سامان طرب پیدا کر۔ کبھی تو اپنی دل نشیں قرانی ادا سے کان اور سماعت کا محرم بن۔ یعنی تو آواز ہے تو کان سے دوستی پیدا کر۔ وہ بھی کوئی سرود ہے جو پردۂ ساز کی خاموشی میں پوشیدہ رہے؟ آواز کو چاہیے کہ وہ ساز کے پردے سے باہر بھی آئے۔ یعنی عشق حقیقی نے تجھ میں حیرت انگیز کمالات بھر دیے ہیں تو اپنے جوہروں کو پوشیدہ نہ رکھ بلکہ زمانہ پر ظاہر کر کے لوگوں کو زندگی کا پیغام دے۔

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اے مسلمان! تو اپنے دل کو عشق کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کر۔ تیرا دل وہ آئینہ ہے کہ سعی عشق میں جتنا بھی ٹوٹتا جائے گا، خدا کی نظروں میں عزیز سے عزیز تر ہوتا جائے گا۔ دنیا کے ہاتھوں جس قدر پامال ہوگا، خالق کے ہاتھوں اسی قدر سرفراز ہوگا۔ یعنی عشق حقیقی کے دوران دل کو جو تکلیف اور صدمہ پہنچتا ہے اس سے دل ٹوٹ جاتا ہے تو اسے اپنے لیے فال نیک سمجھ۔ کیوں کہ جب خدا کے عشق میں دل کا آئینہ چور چور

ہوجاتا ہے تو خدا اس پر لطف وعنایتوں کی بارش کر دیتا ہے۔ دنیا میں جب آئینہ ٹوٹتا ہے تو اس کی قدر و قیمت ختم ہوجاتی ہے، لیکن دل وہ آئینہ ہے جو عشق کے صدموں سے ٹوٹتا ہے تو خدا کی نظر میں اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایت سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

پروانے نے شمع کے گرد طواف کرتے ہوئے یعنی گھومتے ہوئے کہا کہ وہ پرانا اثر نہ تیرے جلنے کی کہانی میں ہے اور نہ ہی میرے جلنے کے قصے میں۔ یعنی موجودہ زمانے میں نہ تو حسن کے اندر وہ کشش و رعنائی باقی ہے اور نہ ہی عشق میں وہ گداز اور تڑپ۔ زمانۂ قدیم کے جیسے نہ تو عاشق پائے جاتے ہیں اور نہ ہی معشوق۔ ساری کی ساری قوم عشق الٰہی کے جذبے سے عاری ہوگئی ہے۔

اس کا ایک اور مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طواف کعبہ کے وقت طواف کرنے والے کے شمع نما پتنگے یعنی دل نے کعبہ سے کہا یہ کیا ہوگیا ہے کہ وہ پہلے جیسی کیفیت اور وہ پرانا اثر نہ تیری پرسوز کہانی میں باقی رہا اور نہ میری پرگداز حکایت میں۔ طواف تو آج بھی رسماً جاری ہے مگر طواف کی روح فنا ہوچکی ہے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں

اے خدا! میں اور مجھ جیسے بہت سارے بندے ایسے ہیں جن کے گناہوں نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔ کوئی بھی جگہ ان کے لیے مامن نے بنی۔ لیکن اگر انہیں امان ملی تو بس تیرے دامان عفو میں جو ہمیشہ بندوں کو اپنی محبت سے نوازتا رہا ہے۔ یعنی انسان سراسر گناہوں سے آلودہ ہے۔ اگر خداوند کریم اس کے گناہ معاف کر کے اسے اپنے دامن کرم میں پناہ نہ دے تو اسے دنیا میں کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

افسوس کہ اب دنیاوی آلائش کے سبب جذبۂ عشق میں نہ تو وہ پہلی سی حرارت اور تڑپ رہی اور نہ حسن میں پہلے جیسا التفات اور خلوص۔ یعنی عشق میں وہ پہلا سا سوز، تڑپ اور جوش باقی نہیں رہا اور نہ ہی حسن میں وہ شوخی اور ناز و ادا باقی رہی۔ اب نہ تو غزنوی میں وہ تڑپ رہی ہے اور نہ ایاز کی زلفوں میں وہ پیچ وخم باقی ہیں جو کشش کے آئینہ دار تھے۔ عاشق اور محبوب دونوں اپنی صفات سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمان زوال پذیر ہو رہے ہیں اور ان کے رہنماؤں میں ایثار و قربانی کا جذبہ نہیں رہا ہے۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اگر میں نے کبھی جب خدا کے سجدے میں اپنا سر جھکایا تو زمین سے آواز آنے لگی، اے دنیا کی محبت میں گرفتار شخص! تیرا دل تو بتوں کا بھی شیدا ہے۔ تجھے نماز میں بھلا کیا ملے گا۔ یعنی جب تک انسان اپنے دل کو غیر اللہ کی محبت سے پاک نہ کرلے اور اس کے دل میں خدا کے سوا کسی دوسرے کی محبت نہ ہو اس وقت تک نہ تو اس کی نماز صحیح ہوسکتی ہے اور نہ ہی اسے سجدہ کرنے سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ نہ اسے نماز میں مزہ آتا

ہے نہ ہی سجدے میں لطف۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اقبال صرف اردو زبان کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر اور مفکر ہیں۔ اقبال کے کلام میں شعر وفلسفہ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

☆ اقبال کے کلام کو سمجھنے کے لیے ان کی فکر کی گہرائیوں کا مشاہدہ اور ان کے فن کی نزاکتوں کا غائر مطالعہ ضروری ہے۔

☆ علامہ اقبال ایک کامیاب نظم گو شاعر ہی نہیں بلکہ غزل گو شاعر بھی ہیں۔ اقبال کے دور میں غزل کے مختلف انداز موجود تھے جیسے روایتی غزل، رومانوی غزل اور غزل مسلسل وغیرہ۔

☆ اقبال کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو سے استفادہ کے ساتھ ساتھ غزل کے روایتی اور جدید رجحانات کو بھی قبول کیا۔

☆ اقبال کا پہلا مجموعہ بانگ درا ہے جو 3 ستمبر 1924 کو شائع ہوا۔ یہ اقبال کی 1901 سے 1924 تک لکھی گئی شاعری پر مشتمل ہے۔ بانگ درا میں اقبال کی چوبیس سال کی تخلیقات شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے اردو مجموعوں میں سب سے ضخیم ہے۔

☆ بانگ درا میں 143 نظمیں اور 28 غزلیں موجود ہیں۔

☆ اقبال کی شاعری کا پہلا دور زمانہ طالب علمی یعنی 1901 سے شروع ہوکر 1905 پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے جس کے دوران اقبال نے اردو ادب کو قومی اور وطنی شاعری کا بہترین سرمایہ دیا ہے۔

☆ اقبال کو نہ صرف ہندوستان کے کوہ وصحرا سے وابستگی اور انسیت تھی بلکہ انہوں نے ہندوستان کی کئی شخصیات کو بھی نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔

☆ فلسفہ اقبال کے متعدد گوشے ہیں جنہیں اقبال اپنے کلام میں موقع بہ موقع پیش کرتے ہیں۔ مسلمان صوفیا نے جبر کے عقیدے کو بہت عام کر دیا تھا اقبال نے اختیار کے فلسفے سے اس کا توڑ کیا اور اس پر زور دیا کہ انسان اپنی تقدیر کا آپ معمار ہے۔

☆ پیکر تراشی میں اقبال کو بڑا کمال حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں مرقع کشی کے بہترین نمونے موجود ہیں لیکن غزل کے اشعار میں بھی بے شمار تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

9.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
فسوں	:	جادو، دل ودماغ قابو میں کر لینا
خجستہ پے	:	خوش قسمت،، مبارک قدم
بخیہ	:	سلائی، مقرر طریقے سے ٹانکے لگانا
عقبیٰ	:	آخرت، عاقبت، دوسرا جہاں

مخزن	:	خزانے کی جگہ، ذخیرہ جمع کرنے کی جگہ
منتظر	:	جس کا انتظار ہو، جس کا انتظار کیا جائے
جبین	:	پیشانی، ماتھا
خروش	:	زور کی آواز، شور، غل
طوف	:	طواف کرنا، کعبے کے گرد پھرنا
عفو	:	معاف کرنا، معافی، درگزر
صنم آشنا	:	بت پرست
منعکس	:	عکس قبول کرنے والا، عکس ڈالنے والا
منکشف	:	کھلا ہوا، ظاہر، آشکار
مجتمع	:	جمع ہونے کی جگہ، مجلس، جلسہ

9.7 نمونۂ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کے پہلے اردو شعری مجموعے کا نام کیا ہے؟

2۔ ''بانگ درا'' کس سنہ میں شائع ہوا؟

3۔ تاریخی اعتبار سے بانگ درا کتنے حصوں پر مشتمل ہے؟

4۔ ''بانگ درا'' میں نظموں کی تعداد کتنی ہے؟

5۔ ''بانگ درا'' میں غزلوں کی تعداد کتنی ہے؟

6۔ 'بانگ درا'' کی پہلی نظم کون سی ہے؟

7۔ نظم ''صدائے درد'' کس رسالے میں شائع ہوئی؟

8۔ اقبال کی قومی شاعری کا دوسرا دور کب شروع ہوتا ہے؟

9۔ ''بانگ درا'' میں اقبال کے کتنے سالوں کی تخلیقات شامل ہے؟

10۔ نظم ''ہمالہ'' کب شائع ہوئی؟

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''بانگ درا'' کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

2۔ اقبال کی غزلوں میں پیکر تراشی کے بارے میں لکھیے۔

3۔ ان دو اشعار کی تشریح کیجیے۔

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

4۔ بانگ درا میں شامل غزلوں پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ بانگ درا میں شامل نظموں کا تعارف پیش کیجیے۔

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کی غزلوں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ شامل نصاب غزل ''الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے'' کی تشریح کیجیے۔

3۔ غزل ''کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں'' کی تشریح کیجیے۔

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ بانگ درا	علامہ اقبال
2۔ شرح بانگ درا	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
3۔ شرح بانگ درا	ڈاکٹر شفیق احمد
4۔ مطالب بانگ درا	غلام رسول مہر
5۔ اقبال کا فن	گوپی چند نارنگ (مرتب)

اکائی10: بال جبریل کی شامل نصاب غزلیں

اکائی کے اجزا

10.0		تمہید
10.1		مقاصد
10.2		اقبال کی شاعری کے ادوار
10.3		بال جبریل: تعارف، تعبیر اور تفہیم
10.4		شامل نصاب غزلوں کا متن اور ان کی تشریح
	10.4.1	اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
	10.4.2	گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
	10.4.3	پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
	10.4.4	عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
10.5		اکتسابی نتائج
10.6		کلیدی الفاظ
10.7		نمونہ امتحانی سوالات
	10.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	10.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	10.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
10.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

بال جبریل علامہ اقبال کی اردو شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے جو ان کے پہلے مجموعہ 'بانگ درا' کی اشاعت کے گیارہ سال بعد ان کی وفات سے تین سال قبل جنوری 1935 میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے اسے بانگ درا کی مقبولیت کے بعد لوگوں کے اصرار پر شائع کیا۔ پہلے اس کا نام ''نشان منزل'' رکھا گیا لیکن بعد میں ''بال جبریل'' کر دیا گیا۔ بال جبریل میں شاعری زیادہ ہے اور فلسفہ کم ہے۔ یوسف سلیم چشتی نے اسے گل سرسید کہا ہے۔ بال جبریل اقبال کی اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے پہلے حصے میں 16 اور دوسرے حصے میں 61 غزلیں شامل ہیں۔ اس کے بعد 39 رباعیات ہیں، بعد ازاں نظموں کا سلسلہ ہے۔ آخر میں قطعات ہیں لیکن درمیان میں بھی جہاں صفحات خالی ہیں، وہاں پر قطعات شامل کیے

ہیں۔اس مجموعے میں شامل کئی نظمیں بین الاقوامی اسفار کے دوران لکھی گئیں۔یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر اقبال نے اسپین کا سفر نہ کیا ہوتا تو وہ 'مسجد قرطبہ' جیسا اثر انگیز اور لافانی کارنامہ انجام نہ دے پاتے۔بال جبریل میں تغزل بھی ہے،تصوف بھی ہے اور فلسفیانہ نظمیں بھی شامل ہیں۔اس اکائی میں ہم بال جبریل (کی شاعری) کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی غزلوں کی تشریح کریں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- ☆ علامہ اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار میں ان کی شاعری میں آنے والی تبدیلیوں پر اظہار خیال کرسکیں۔
- ☆ بال جبریل کے موضوعات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ بال جبریل کے حوالے سے اقبال کی شاعرانہ خصوصیات کو بیان کرسکیں۔
- ☆ بال جبریل کی چار اہم غزلوں کے مطالب کی وضاحت کرسکیں۔

10.2 اقبال کی شاعری کے ادوار

اقبال نے جب شاعری کی ابتدا کی تو ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا،شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں وہ گیرائی اور گہرائی نہیں دکھائی دیتی جو بعد میں آئی۔دور اول کی نظموں میں مختلف رجحان نظر آتے ہیں۔ان نظموں میں مناظر فطرت،وطن پرستی اور فلسفیانہ جستجو ہے۔اس سے قبل آزاد اور حالی کے یہاں منظر کشی سے متعلق شاعری دیکھی جاسکتی ہے۔کلاسیکی شاعری میں فطرت سے وابستگی محبت کے عنصر کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے لیکن براہ راست فطرت اور اس کے مظاہر سے بے تعلقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان شعرا نے اپنے کلام میں داخلی کرب کچھ اس قدر پیش کیا کہ خارجی مناظر اور مظاہر ناپید ہوگئے۔مثنویوں میں کردار کے جنگل میں جانے اور شکار کرنے سے لے کر رات گزارنے،قصائد کی تشبیب اور بعض اوقات غزل میں اس طرح کے مناظر فطرت دکھائی دیتے ہیں لیکن شاعری کا مقصد 'نیچری شاعری' نہیں ہوتا۔میر انیس کے مراثی اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں مناظر کی جزئیات تک مل جاتی ہیں لیکن ان کی اہمیت پس منظر کی ہوتی ہے،منظر کی نہیں۔اقبال چونکہ انگریزی شاعری سے بھی واقفیت رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اس میدان کو کامیابی کے ساتھ سر کیا۔انہوں نے اس میدان میں بہترین مثالیں پیش کی۔لیکن منظریہ شاعری میں بھی ان کی فکر کی گہرائی کی جھلک موجود ہے۔

بانگ درا کی منظر نگاری سے اقبال کے احساس جمال اور قوت مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔دوسرے شعرا کی طرح انہوں نے محض تخیل اور تصور سے کام نہیں لیا بلکہ مناظر قدرت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور اسے اپنی شاعری میں پیش کیا۔بانگ درا کی پہلی نظم 'ہمالہ' اس کی بہترین ترجمان ہے۔اس دور کی شاعری میں فطرت پرستی کے علاوہ حب الوطنی کا جذبہ بھی ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔'ترانۂ ہندی' میں وطن سے بے پناہ محبت اور جذبہ دکھائی دیتا ہے۔اس کے بعد کی شاعری میں اقبال کے یہاں وطنیت کا محدود تصور کم نظر آتا ہے اور فلسفیانہ رجحان کی آمد شروع ہو جاتی ہے جس میں ایک غالب پہلو عشق اور عقل ہے۔یہ تینوں رجحان ان کی شاعری کے پہلے دور میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب انہوں نے تعلیم کی غرض سے 1905 میں یورپ کا سفر کیا اور 1908 تک وہیں مقیم رہے۔تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے وہ شاعری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے اس لیے اس درمیان انہوں نے بہت کم نظمیں لکھیں۔اس دور میں انہوں نے

یورپ کے سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا حالانکہ اس وقت تک ان کی شاعری زیادہ تر حسن و عشق پر ہی مبنی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے انہیں اسلامی اقدار اور مغربی تہذیب کا موازنہ کرنے کا موقع بھی ملا اور انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں میں اب وہ صلاحیتیں تلف ہو چکی ہیں جن کی بدولت انہوں نے ساری دنیا کو مسخر کر لیا تھا۔ اس لیے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو اسلاف کے حسن اخلاق اور ذوق عمل سے آشنا کرانے کا بیڑا اٹھایا۔

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور وہ ہے جس میں انہوں نے تمام مسائل کا اسلامی زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا اور نسل اور وطن کی محبت کو باطل قرار دیا۔ مسلمانوں کی اقتصادی تباہ حالی کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بے چین ہوئے تو ان کے شاندار ماضی کو جواب شکوہ میں پیش کیا۔ بانگ درا سے پہلے 1915 میں اقبال کی فارسی مثنوی 'اسرار خودی' اور 1918 میں 'رموز بے خودی' شائع ہو چکی تھیں۔ تیسری فارسی تصنیف 'پیام مشرق' 1922 میں منظر عام پر آئی۔ چوتھا مجموعہ 'زبور عجم' 1927 میں منظر عام پر آیا، 1932 میں 'جاوید نامہ' اور اس کے تین سال بعد 1935 میں 'بال جبریل' کی اشاعت ہوئی جس کا تفصیلی مطالعہ ہم اس اکائی میں کریں گے۔

10.3 بال جبریل: تعارف، تعبیر اور تفہیم

بال جبریل جنوری 1935ء میں شائع ہوئی۔ اس میں وہ اردو کلام شامل ہے جو علامہ اقبال نے بانگ درا کی تکمیل سے بالِ جبریل کی اشاعت تک کہا تھا۔ اس اعتبار سے بھی یہ کتاب بہت اہم ہے کہ علامہ کے فارسی کلام میں جو کچھ صراحت سے بیان ہوا ہے وہی سب کچھ بالِ جبریل میں اشارتاً آ گیا ہے۔

بانگ درا اور بال جبریل کی اشاعت کے درمیان تقریباً 12 سال کا وقفہ ہے۔ ان 12 برسوں میں علامہ اقبال کا کوئی اردو مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا البتہ فارسی کے دو مجموعے چھپے۔ اقبال نے بانگ درا سے قبل اور بال جبریل کے بعد کئی کتابیں فارسی میں لکھیں، اس لیے انہوں نے جب اپنے خیالات کا اظہار اردو میں کیا تو فارسی سے محروم طبقے نے اس کی بڑی پذیرائی کی۔ اس میں اقبال نے خودی کے فلسفے کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا اور دوسرے بنیادی تصورات یعنی عشق، فقر، استغنا، علم، خرد، حیات اور مومن کو بھی آسانی کے ساتھ سمجھایا ہے۔ بال جبریل کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کا انداز بیان اور اسلوب کی دلکشی ہے۔ اس مجموعے میں بہت سے اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں ان کا خود کا مقام آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم روز درون میخانہ

جس طرح میر کو اپنے کلام پر ناز تھا اور اپنی شاعری میں 'قیامت کا سا ہنگامہ برپا' ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اسی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری پر فخر کرتے ہوئے لوگوں کو اس کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

بال جبریل کا پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں نظمیں ہیں۔ دونوں حصے علامہ اقبال کی شاعری کے فن کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ جہاں تک افکار و خیالات کا تعلق ہے ان نظموں اور غزلوں میں وہی کچھ کہا گیا ہے جو ان کی فارسی کتابوں یا بانگ درا کے تیسرے دور کی بعض نظموں میں ہے، البتہ اس کتاب میں غزل گوئی اور منظر نگاری کے تجربات کیے گئے ہیں وہ فنِ شعر کے اعتبار سے معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلے حصے میں پہلی 16 غزلیں بقیہ غزلوں سے الگ درج کی گئی ہیں۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر مابعدالطبیعات موضوعات پر محیط ہیں۔ یعنی خدا، کائنات اور انسان کے تعلق کو واضح کرتی ہیں۔ ان کے بعض اشعار خاصے دقیق ہیں۔ اس کے بعد حکیم سنائی (جو فارسی کے اہم شاعر ہیں اور جن کی پیروی مولانا روم نے کی ہے) کی زمین میں قصیدہ نما غزل ہے اور پھر غزلیات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ان غزلیات میں وہ تمام موضوعات اشارے کنائے، علامت یا صراحت کے ساتھ آ گئے ہیں جو ان سے پہلے بھی اقبال کے فارسی اور اردو کلام میں موجود ہیں مگر جن موضوعات کا ذکر کثرت سے آتا ہے وہ یہ ہیں:

خودی، عشق، کشمکش حیات، فقر، وجدان اور عقل کا تقابل، اسلام کی طرف واپسی یا دوسرے لفظوں میں ان تمام عناصر کا اسلام سے اخراج جو مسلمانوں نے غیر مذاہب سے لے کر اسلام میں داخل کر لیے ہیں۔ ان کے علاوہ صوفی و ملا کی بے عملی، مغرب کے مشرق پر ہلاکت خیز اثرات، مغربی تعلیم کے نقصانات وغیرہ کو بھی بار بار بڑے زوردار انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بالِ جبریل کی غزلیات اردو غزل کی پوری تاریخ میں ایک نئی آواز ہیں۔ ان کے انداز بیان میں ایسی ایسی جدتیں ہیں جو ان سے پہلے کی غزلیہ شاعری میں نہیں ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ نیا ہے ان کی تشبیہات، استعارات اور تصویریں نئی ہیں ان کی زمینیں نئی ہیں، ان میں سینکڑوں نئی تراکیب ہیں اور ظاہر ہے کہ جو خیالات پیش کئے گئے وہ بھی اس سے پہلے غزل میں بیان نہیں ہوئے تھے گویا علامہ اقبال نے غزل کا باطن بھی تبدیل کر دیا ہے اور ظاہر بھی یہ صنفِ غزل میں بہت بڑا تجربہ ہے اس تجربے نے جدید غزل گو شعرا کو بہت متاثر کیا جدید اردو غزل میں تجربات کی جو افراط نظر آتی ہے ان کا بالواسطہ یا بلاواسطہ سلسلہ بالِ جبریل کی غزلیات تک جاتا ہے یہ غزلیات اپنی نقطہ آفرینی اور اندازِ بیان کی دل کشی کی وجہ سے بہت متاثر کرتی ہیں۔ غزل کا یہ انداز اردو غزل کی تاریخ میں یقیناً نیا لیکن جب قاری اس سے کسی قدر آشنائی حاصل کرتا ہے تو اس کی غرابت دور ہو جاتی ہے اور ایک نئی دنیا کا دروازہ اس پر وا ہو جاتا ہے۔

بانگ درا کے مقابلے میں اس کتاب میں خیالات کی گہرائی اور سنجیدگی زیادہ ہے۔ اس کی فکر میں بلند پروازی ہے۔ اسی لیے اس کا عنوان 'بال جبریل' ہے۔ جبریل کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ وہ پروں کی قوت، تیز رفتاری اور بلند پروازی کی علامت ہیں۔ اس مجموعے میں بھی فکر کی اُڑان اور زور بیان ہے جس کی مناسبت اس کا نام 'بال جبریل' نہایت مناسب ہے۔ اس مجموعے کا آغاز ہی ایک ایسے شعر سے ہوتا ہے جو اس کتاب کی اہمیت و عظمت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اگر ہم اس کتاب کے سیاق میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے پڑھنے کے لیے ہے جو عقل سلیم رکھتے ہیں اور جن کی پرواز جبریل کی طرح بلند ہو سکتی ہے۔ اس کی زبان پر فارسی کا اثر ہونے کے باوجود یہ بانگ درا کی طرح بوجھل نہیں بلکہ نہایت شستہ اور شیریں اور شاعری

فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔زبان کی لطافت نے اس مجموعے کومزید دلکش بنادیا ہے۔اس کا موضوع فلسفیانہ اوراسلوب شاعرانہ ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں غزلیں ہیں اور دوسرے حصے میں نظمیں۔درمیان میں کچھ رباعیات ہیں۔غزلوں کومزید دو حصوں میں منقسم کیا جائے تو پہلے حصے میں 16 اور دوسرے حصے میں 61 غزلیں شامل ہیں، اس طرح کل غزلوں کی تعداد 77 ہے جبکہ مجموعے میں مختصر اور طویل نظموں کی کل تعداد 60 سے تجاوز نہیں کرتی۔بعض غزلوں کے بعد خالی حصے میں رباعیاں لکھی گئی ہیں۔

بہت سے لوگ اقبال کی غزلوں کو غزل کہنے میں تامل کرتے ہیں۔ان کے نزدیک انہیں 'غزل نما' کہنا زیادہ درست ہے۔کیونکہ ان غزلوں میں موضوعات کا تسلسل ہے۔اس لیے انہیں نظمیہ غزل یا غزلیہ نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔وزن، بحر اور قافیہ کے اعتبار سے اس کے غزل ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن غزل کے ہر شعر کا ایک الگ معنی ہوتا ہے اور غزلیات اقبال غزل کی اس روایتی خصوصیت سے عاری ہیں۔الطاف حسین حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں غزل کے باب میں جتنے بھی الفاظ گنوائے ہیں تقریباً ان سب کا استعمال بال جبریل میں ہوا ہے۔لہٰذا اس لحاظ سے اس کی غزلوں کو نظم کہنا بجا نہیں ہے۔اقبال کے کلام میں بہت سے اشعار تغزل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نیازی
لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

پہلے حصے کی تمام 16 غزلوں میں خداوند تعالیٰ سے ناز و نیاز کی باتیں کی گئی ہیں اور یہ کلام خدا کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے۔دوسرے حصے کی پہلی غزل کافی طویل ہے اور قصیدے کی طرح کئی حصوں میں منقسم ہے۔اس پر نوٹ میں اقبال نے لکھا ہے کہ یہ حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر زیارت کے بعد ان کے قصیدے کی پیروی میں لکھی گئی ہے لہٰذا اس وجہ سے اس پر زیادہ قصیدہ ہونے کا گمان مزید بڑھ جاتا ہے۔اس غزل میں اقبال نے حکیم سنائی کے جس مصرعے پر گرہ لگائی ہے وہ اس طرح ہے:

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
'گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا'

حکیم سنائی کا اصل شعر اس طرح ہے:

چو علمت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

معنوی اعتبار سے بال جبریل کی غزلوں میں خیالات کی بلندی موجود ہے۔زیادہ تر غزلوں میں ایک مسلسل خیال پیش کیا گیا ہے اور حسب ضرورت قطعہ بند اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔زبان میں عالمانہ اور اعلیٰ پائے کے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔غزلوں میں ردیف کی پابندی سے گریز کیا گیا ہے اور بعض قافیے نہایت مشکل ہیں جن مین عام شعرا نے کم شعر لکھے ہیں۔کچھ قوافی بطور مثال پیش کیے جا رہے ہیں:

خیز، ریز، انگیز، آمیز، دستاویز، رستاخیز، چنگیز، خونریز، فراوانی، نگہبانی، برہانی، زندانی، پازند، مانند، نظر بند، سمرقند، دماوند، اسپند، خورسند،

سمرقند، جنوں، افلاطوں، گردوں، کن فیکوں، فسوں، درویشی، خویشی، میشی، بیشی، چمن، پیرہن، دھن، شکم، جم، یم، دمبدم، زندیق، تصدیق، توفیق، طریق، صدف، خذف، تلف، سربکف، مہجوری، رنجوری، تیموری، مستوری، حور، حضور، صبور، ظہور، صبح گاہی، روسیاہی، کج کلاہی، خانقاہی، حکیمانہ، رندانہ، بیگانہ، ویرانہ، فرزانہ، مشتاقی، خلاقی، بو، رفو، غلاف، خلاف، کشاف، صاف وغیرہ۔

کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن کے قوافی میں جبریل، اسرافیل، خلیل، اسماعیل، فرہاد، رازی، شبیر، بسطامی، خسرو جیسے تلمیحی کرداروں کو نظم کیا ہے۔ بعض غزلوں میں عربی قوافی میں **صہبا، کسریٰ، زہرا، الا، طاھا، لاتخف، لاالہ الا، اسداللھی** کا استعمال کرتے ہیں تو بعض غزلوں میں آدھا اور بعض میں عربی کا مکمل مصرع لگاتے ہیں۔ مثلاً **اشھدہ ان لا الہ ، اشھدہ ان لا الہ ، لاالہ الا ھو، لاالہ الا اللہ** وغیرہ۔

غزلوں میں مقطع نہیں ہونے کی وجہ سے تخلص کا استعمال بھی نہیں ملتا اور بعض غزلوں میں مطلع بھی نہیں ہے۔

حصہ اول کی غزلوں میں ذات، حیات اور کائنات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ذات سے مراد خالق کائنات کی ذات)، حیات سے مراد انسانی حیات اور کائنات سے مراد دنیا کی بے ثباتی مراد ہے۔

بال جبریل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے اشعار کے دونوں مصرعے ایک ہی لفظ سے شروع ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان اشعار میں ایک آہنگ پیدا ہو جاتا ہے:

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا — کیا عشق پایدار سے ناپایدار کا

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو — میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

کمال تک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

اقبال کی غزلوں میں صنعت تضاد کا استعمال بھی خوب ملتا ہے۔ یہ صنعت مصرعوں کے درمیان میں تو خوب ملتی ہے، لیکن کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن کے اشعار میں ایک مصرع دوسرے کی ضد ہوتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں:

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے — عشق بیچارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اگر شعر کے ایک مصرعے کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو اس میں برابر الفاظ آتے ہیں یعنی انہیں الگ الگ کرنے سے صنعت ترصیع حاصل ہوتی ہے:

یا عقل کی روباہی/ یا عشق یداللہی — یا حیلۂ افرنگی/ یا حملۂ ترکانہ

عشق تری انتہا/عشق مری انتہا — تو بھی ابھی ناتمام/ میں بھی ابھی ناتمام

یوں تو بال جبریل کی غزلیں فلسفۂ اسلام سے پُر ہیں اور ان میں پیغام الٰہی کو نت نئے طریقوں سے پیش کیا گیا ہے۔ کہیں تلمیحات تو کہیں علامتوں کے ذریعے فکر و فلسفے کو جگہ دی گئی ہے لیکن کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں اللہ کے پیغام کو نصف یا مکمل مصرعے میں جوں کا توں لکھ دیا گیا ہے

ہے۔ یہ اشعار دیکھیے :

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو — پلا کے مجھ کو مے لا الٰــــــــہ الا ھــــو

علم کا 'موجود' اور فقر کا 'موجود' اور — اشھــدُ ان لا الٰــــہ،اشھــدُ ان لا الٰــــہ

اگر بال جبریل کے موضوعات کی بات کی جائے تو یہ فکر و فلسفے سے لبریز ہے۔اس میں اسلامی تصوف کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔اس میں اقبال نے بے بسی کے بجائے ہمت اور سر بلندی کا پیغام دیتے ہوئے حریت کا درس دیا ہے۔اس کے موضوعات ملک اور قوم کے محدود دائرے سے پرے ہیں اور ان میں کارفرما فکر آفاقی حیثیت کی حامل ہے۔اپنے کلام کے ذریعے اقبال ہمیں مغرب کی ظاہر پرستی اور حسن و جمال پر فریفتہ ہونے سے بھی خبردار کرتے ہیں۔خدا کی سلطنت میں انسان کی مجبوری اور لاچاری اور سرمایہ داروں کے عوام پر کیے جانے والے ظلم و ستم کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔اس مجموعے کی زبان غزل کی زبان ہے۔اس کی نظمیں بھی تغزل کے رنگ میں دوبی ہوئی ہیں۔انسان دوستی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔آمریت،ملوکیت اور انسانی استحصال کے خلاف احتجاج کی صدائیں بھی ہیں۔

بال جبریل میں اکثر نظمیں مختصر ہے مگر تین طویل نظمیں بھی اس میں شامل ہیں جن میں سے ہر ایک کے بارے میں نقادوں کی رائے ہے کہ یہ علامہ اقبال کی بہترین نظمیں ہیں۔ذوق و شوق،مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ ایسے عظیم کارنامے ہیں جن پر کوئی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبان بھی فخر کر سکتی ہے نقادوں کے درمیان یہ فیصلہ تو شاید کبھی نہ ہو سکے کہ ان میں سے بہترین نظم کون سی ہے لیکن اس پر بہت سے نقاد متفق ہو جائیں گے کہ ان سے بہتر نظمیں علامہ نے نہیں لکھیں۔ذوق و شوق ایک لاجواب نعتیہ نظم ہے۔مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ میں علامہ اقبال کے تمام نظریات کا خلاصہ موجود ہے تینوں نظموں کا خلوص اندازِ بیان اور موضوع کی ہم آہنگی اور زورِ بیان ایسا ہے کہ بہت کم یکجا ہو پاتا ہے پھر نظموں کا ربط و تسلسل دیدنی ہے۔

مختصر نظموں میں طارق کی دعا،الارض للہ،لالہ صحرا،زمانہ،شاہین وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔بالِ جبریل کے آخر میں چند نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں خیالات کا اظہار براہ راست طریقے سے کیا گیا ہے مثلاً آزادی افکار،یورپ،سینما فقر،وغیرہ اس اندازِ بیان کو علامہ اقبال نے ضربِ کلیم میں اور بھی چمکایا ہے۔

بال جبریل کی مکالماتی نظموں کے ذریعے اقبال نے قوم کی زندگی کے اہم مسائل کو حل کیا ہے۔مثلاً مرشد رومی کے اشعار سے انہوں نے بہت سے مسائل کو حل کیا ہے۔

10.4 شامل نصاب غزلوں کا متن اور ان کی تشریح

10.4.1 غزل:اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لا مکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب لا مکاں تیرا ہے یا میرا
اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر

مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

تشریح: یہ غزل اقبال کے شعری مجموعہ 'بال جبریل' میں شامل دوسری غزل ہے۔ یہ غزل استفہامیہ اسلوب کی ایک بہترین مثال ہے۔ مضمون کے اعتبار سے یہ ایک مسلسل غزل ہے۔ بظاہر اس میں ہر شعر میں خدا سے ایک سوال ہے لیکن شعر میں ہی اس کا جواب بھی ہے۔ ہر بار اقبال اللہ کے سامنے سرنگوں نظر آتے ہیں۔ غزل کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اس شعر کا مضمون یہ ہے کہ کائنات کا نظام خدا کی مصلحت کے مطابق چل رہا ہے۔ انسان اس سے بالکل بے خبر ہے۔ اقبال خدا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آسمان کے ستاروں میں کجی ہے تو مجھے اس کا کیا علم کہ یہ سیدھے چل رہے ہیں یا ٹیڑھے۔ یہ کائنات تو تیری بنائی ہوئی ہے اس لیے اس کی فکر مجھے کیوں ہو۔ تو جس طرح چاہے اسے چلائے اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جہاں تیرا ہے یا میرا؟ جواب اسی سوال میں پوشیدہ ہے کہ یہ جہان تیرا ہی ہے اور تو ہی اس کا خالق ہے اور میرا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب لا مکاں تیرا ہے یا میرا

اس شعر میں علامہ اقبال آدم کے جنت سے نکالے جانے والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر دیوانگی اور شوق کے ہنگاموں سے لامکاں خالی ہے تو یہ میری خطا تو نہیں ہے۔ تو نے خود ہی کسی مصلحت کے تحت آدم کو وہاں سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا۔ تو نے مجھے جنت سے نکالا اور زمین پر بھیجا اور میں نے یہاں آ کر شوق کی محفلیں برپا کیں جن سے لامکاں خالی ہے۔ اب یہ خطا میری تو نہیں ہے یعنی یہ تیری ہی خطا ہے جس کی وجہ سے لامکاں اس ہنگامے سے خالی ہے۔

اے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

جب اللہ تعالی نے آدم کو بنایا اور اس میں روح پھونکی تو تمام فرشتوں کو کہا کہ اس کو سجدہ کریں۔ سب نے خدا کا حکم بجالاتے ہوئے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے منع کر دیا۔ قرآن کریم کی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **واذ قُلنا للملائکت اسجدو الادم فسجدو االا ابلیس ابیٰ و استکبر و کان من الا کافرین**۔ یعنی اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔ اس آیت کی روشنی میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر ابلیس نے انکار کیا تو اسے اس کی

جرأت کیوں کر ہوئی، وہ تو تیرا راز داں تھا، بلکہ تیری بارگاہ میں سب سے زیادہ سجدے کرنے والا بھی وہی تھا تو پھر اس نے تیرا حکم بجالانے سے کیسے انکار کر دیا۔ مجھے اس بات کا علم کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟ اور پھر وہی جواب کہ وہ تیرا رازادں تھا۔

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

یااللہ! یہ کائنات تیری ہے۔ اس میں بھیجے گئے انبیاء اور پیغمبر بھی تیرے ہیں۔ فرشتے بھی تیرے ہیں، رسول بھی تیرے ہیں اور ان پر نازل کیے جانے والے صحیفے بھی تیرے ہیں۔ محمدؐ بھی تیرے ہیں اور ان پر نازل کیا گیا قرآن بھی تیرا ہے۔ ان سب میں میرا کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ حرف شیریں یعنی 'جذبۂ عشق' میرے وجود کا ثبوت ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو بغیر سمجھے ہوئے آتش نمرود میں کود جاتا ہے۔ وگرنہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ جہاں اسے خطرہ محسوس ہو وہاں جانے سے اجتناب کرے۔ شعر کی ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ اقبال اپنے کلام کو حرف شیریں کہہ کر اللہ سے سوال کر رہے ہیں کہ اے اللہ سب کچھ تیرا ہی ہے، تو میرا کلام بھی تیرے پیغام کی ترجمانی کر رہا ہے یا میری۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اللہ تعالی نے انسان کو اس لیے پیدا کیا، اشرف المخلوق کا درجہ دیا اور اسے شعور عطا کیا کہ وہ خدا کو پہچانے اور اس کی اطاعت کرے۔ ساتھ ہی خیر و شر کے معاملات سے بھی اسے آگاہ کیا کہ وہ شعور سے اپنے حق میں بہتر کا انتخاب کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا مقصد صرف اپنی عبادت اور اطاعت مقصود ہوتی تو اس کے لیے فرشتے ہی کافی تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی کوکب (آدم) کی تابناکی (موجودگی) سے تیری بنائی ہوئی دنیا روشن ہے اور اس کی بربادی یا خاتمہ کرنے سے تیرا ہی نقصان ہے۔ یہ آدم ہی ہے جو تیرے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے ہوئے اپنا سر کٹانے کو بھی فخر سمجھتا ہے۔ تیرے بتائے ہوئے پیغام کو عوام تک پہنچاتا ہے اور وحدانیت کا پرچم جہاں میں لہراتا ہے۔ اگر عشق کا جذبہ ختم ہو گیا تو یہ کوکب اندھیروں میں ڈوب جائے گا جہاں کوئی تیرا نام لیوا نہ ہوگا۔ اس بات کو اپنی نظم 'شکوہ' میں اس طرح پیش کیا ہے:

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

10.4.2 غزل: گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر
نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

تشریح

یہ بال جبریل کی تیسری غزل ہے۔اس غزل کے تمام اشعار میں شاعر کی اپنے خالق کے تئیں آرزوئیں بیان کی گئی ہیں۔ ہر شعر میں ایسا لگتا ہے کہ اقبال اللہ تعالیٰ سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کر رہے ہیں لیکن تمام اشعار میں جھجھک یا تکلف کی کیفیت دکھائی نہیں دیتی بلکہ ناز و نیاز سے کام لے کر خدا سے بات کی جارہی ہے۔اس میں حمد بھی ہے، دعا بھی ہے، تقاضا بھی ہے، شوخی بھی ہے اور انتباہ بھی ہے۔لیکن آخر کے شعر میں روز محشر میں بندے کے گناہوں سے شرمسار ہونے پر خدا کے شرمسار ہونے کے مضمون نے سماں باندھ دیا ہے۔اس غزل کی تشریح ملاحظہ ہو:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اس شعر میں شاعر اپنے محبوب سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ تو اپنے تابدار (بل کھاتی ہوئی) گیسوؤں کو اور بھی تابدار کر اور میری عقل و خرد اور قلب و نظر کو اپنی زلفوں کا اسیر بنا کر ان کا شکار کر لے۔محبوب کا ذکر اس کے گیسو کے بغیر نامکمل ہوتا ہے اور عاشق ان زلفوں کا گرویدہ ہوتا ہے اس لیے اس شعر میں اقبال نے گیسوؤں کی تابداری سے تغزل کا رنگ بھر دیا ہے، لیکن اس شعر کا صرف مجازی مطلب نہیں ہے، بلکہ اس میں معشوق حقیقی کی حمد بھی بیان کی گئی ہے۔اگر حقیقت کے پیرائے میں دیکھا جائے تو اقبال خداوند تعالیٰ سے یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ تو اپنی گیسوؤں (صفات) کو اور بھی تابدار (شدت کے ساتھ) کر کے مجھے اپنی تجلیات کا جلوہ دکھا جس سے میں تیرے جلووں میں غرق ہو جاؤں۔تو میری ہر شے کو ختم کر دے اور مجھے اپنی ذات میں فنا کر لے تا کہ میں تجھ میں گم ہو جاؤں۔ مجھے اپنے ہوش خرد (شعور) اور قلب و نظر (وجدان) کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تیری رحمت اور کرم پر اعتماد ہے اس لیے میں عقل اور وجدان سے بے پروا ہو کر تیری ذات پاک میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

یہ خالص عشق حقیقی کا شعر ہے اور ناز و نیاز سے پُر ہے۔عاشق کے دل میں معشوق کو دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ اسے کوئی اور بھی دیکھے اس لیے اقبال نے خدا کے آشکار نہ ہونے کی صورت میں خود کو آشکار کرنے کی بات کہی ہے۔وہ اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہوئے

کہتے ہیں کہ عاشق کی تو یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے معشوق کے حسن کو بے حجاب دیکھے، لیکن اگر عشق (عاشق) اور حسن (معشوق) دونوں پردے میں ہوں گے تو بات کیوں کر بنے گی، اس لیے یا تو تو خود مجھ پر ظاہر ہو جا یا مجھے اس قدر توفیق عطا فرما کہ میں تجھے دیکھ سکوں۔ مجازاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیغام رسانی کے لیے Communication کا Two way ہونا لازمی ہے اس لیے کسی ایک کی بھی غیر حاضر ہونے کی صورت میں یہ امر ممکن نہیں ہے اس لیے اے اللہ تو یا تو اپنے پیغام کو دنیا کے لوگوں تک خود پہنچا یا اپنے کرم سے مجھے ایسی طاقت دے کہ میں تیری صفات اور تیرے دین کا پرچار کر سکوں۔

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

عشق میں وصال کے لیے عاشق اور معشوق کا ہم مرتبہ ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک بڑا ہوگا اور دوسرا اس سے مختلف ہوگا تو اس صورت میں وصال ممکن نہیں ہے۔ اس شعر میں اقبال نے شوخی کے انداز میں اسی فاصلے کو ختم کر کے خود کو اللہ کے نور میں گم کرنے یا پھر وسعتوں سے نواز کر بے کنار (بہت وسیع) کر دینے کی بات کہی ہے۔ چونکہ اللہ کی ذات لامحدود ہے اس لیے شعر میں محیط بیکراں کی طرح (تشبیہ) کے بجائے براہ راست محیط بیکراں (استعارہ) استعمال کیا ہے۔ یعنی اللہ کی ذات ایسے وسیع سمندر کی ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اپنی نظم 'شکوہ' میں بھی اقبال نے اللہ کی لامحدود قدرت کا ذکر 'تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب' کے الفاظ میں کیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے اللہ تیری ذات ایک وسیع سمندر کی طرح ہے اور میں ذرا سی نہر کی مانند ہوں۔ اس لیے یا تو تو مجھے اپنی ذات میں ضم کر لے یا مجھے خود سے علاحدہ کر دے۔ چونکہ یہاں مقصد اللہ کی ذات میں خود کے وجود کو فنا کر دینا ہے اس لیے علاحدہ ہونے کی بات محض شوخی کے طور پر کہہ دی ہے ورنہ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اسے وجود کا ایک حصہ بنا لے۔ شعر میں 'محیط بیکراں' اور 'آبجو' کا استعارہ دانستہ طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ دونوں میں ایک مماثل شے 'پانی' ہے لہٰذا بندے کو اپنی ذات کو فنا فی اللہ کرنے کے لیے کسی مشقت کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اللہ چاہے تو اس چھوٹی سی نہر کو اپنے وسیع و عریض سمندر کے پانی میں ملا کر اپنی ذات کا حصہ بنا لے یا اس کو اس قدر وسیع کر دے کہ سمندر بنا دے۔

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

صدف سے میرا دایک ایسی سیپ ہے جس میں موتی بنتا ہے۔ اور خذف سے مراد ٹھیکری یا سفال ریزہ۔ روایت یہ ہے کہ جب موسم بہار میں ابر نیساں کی بارش ہوتی ہے تو اس سے سیپ میں موتی، بانس میں بنس لوچن اور دہان اژدہا میں زہر پیدا ہوتا ہے۔ اقبال کہتے کہ اے اللہ اگر میں صدف (سیپ) ہوں تو میرے اندر کے موتی کی آبرو تیرے ہاتھ میں ہے اور اگر میں ٹھیکرا (خذف) ہوں تو تو مجھے اس لائق بنا کہ میں بادشاہوں کے سر کے تاج کے لائق بن جاؤں۔ میں جیسا بھی ہوں تیرا ہی بندہ ہوں۔ اس شعر میں اقبال نے قرآن کی آیت "**وتعز من تشاء وتذل من تشاء**" کی تعبیر پیش کی ہے۔ کہ اے اللہ تو جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، سب کچھ تیرے اختیار میں ہی ہے۔ تو چاہے تو ابر نیساں کے گرنے کے بعد بھی سیپ کا موتی خراب ہو جائے اور تو چاہے تو ٹھیکرے کو بھی موتی سے زیادہ نایاب بنا دے۔ مجازی معنی یہ بھی ہیں کہ اے اللہ اگر تو نے مجھے قابل بنایا ہے تو میری اس خوبی کو برقرار رکھتے ہوئے مجھ سے وہ کام لے جس میں تیری رضا ہو، اور اگر میری ذات خوبیوں سے عاری

ہے تو اپنی رحمت سے مجھے خوبی کی نعمت عطا کر۔

محاسن کلام کے اعتبار سے بھی یہ شعر بہت بلیغ ہے۔'صدف' اور 'خذف' میں استعارہ ہے اور شعر میں لفظ 'تو' کو 'اگر' کے استعمال سے تشبیہ کا رنگ بھی گیا ہے۔'صدف' اور 'گہر' میں رعایت لفظی ہے۔'آبرو' کو مفرد کرنے پر اس میں 'آب' اور 'رو' آتا ہے صدف، آب اور روان سب کا 'گہر' اور تعلق سمندر سے ہے۔'میرے گہر کی آبرو تیرے ہاتھ میں ہے' میں مجاز مرسل ہے۔اس لیے یہ شعر بلاغت کی ایک عمدہ مثال بھی ہے۔

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

'نغمۂ نوبہار' سے مراد نئی بہار کا نغمہ ہے۔شارحین اقبال نے اس سے مراد 'ملت اسلامیہ کا عروج یا اسلام کی سربلندی' لیا ہے۔لیکن نئی بہار سے مراد غالباً نئے ملک کے بننے کی امید بھی ہے۔چونکہ اقبال دوراندیش شخص تھے اور ملت اسلامیہ کے لیے ایک علاحدہ ملک کا امکان ان کی نگاہ میں تھا اس لیے اس شعر میں انہوں نے یہ آرزو کی ہے کہ اے اللہ میری آرزو ہے کہ میں ملت اسلامیہ کے عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں لیکن اگر میری قسمت میں وہ بہار دیکھنا نہیں لکھا ہے تو کم سے کم مجھے اس بہار کی آمد کی خوش خبری دینے والا پرندہ ہی بنا دے۔'دم نیم سوز' سے مراد 'ادھ جلی سانس' ہے، جس سے مراد عمر کا بیشتر حصہ ختم ہو جانا ہے۔یعنی عمر کے آخری حصے میں مجھے سے وہ کام لے کہ میں ملت کو خوش خبری دینے والا پرندہ بن جاؤں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اس شعر کے بیان میں شوخی اور محبت آمیز گلہ ہے جس کی وجہ سے معنی میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ اے اللہ تو نے مجھے اشرف المخلوق اور اشرف القیام بنایا۔فرشتوں کو میرے سامنے سجدہ کرنے کو کہا، مجھے جنت کی بادشاہی عطا کی۔پھر نہ جانے کیوں میری ایک چھوٹی سی خطا کی وجہ سے مجھے وہاں سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا۔اے اللہ! تو مصلحتوں کا جاننے والا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ تو نے ایسا کیوں کیا، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تو رحیم ہے، رحم کرتا ہے، کریم ہے کرم کرتا ہے، تیرا دامان عفو بہت وسیع ہے پھر بھی تو نے میری خطا کو معاف نہیں کیا۔مجھے مراعات سے محروم کر کے دنیا میں بھیج دیا۔اب جب میں یہاں آباد ہو گیا ہوں، اپنی زندگی کے شب و روز میں خوشی اور غم کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے تو چاہتا ہے کہ میں پھر سے تیرے پاس واپس آ جاؤں۔

جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجا تو لامکاں میں خاموشی چھا گئی۔اقبال نے اپنی نظم 'جبریل و ابلیس' میں ابلیس کی زبان سے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے 'کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو' یعنی کہ اللہ تعالی نے جب آدم کو جنت سے نکال کر زمین بھیجا تو وہاں سناٹا چھا گیا۔انسان نے اپنی کوشش سے اس بنجر زمین کو زرخیز بنا لیا اور کاروبارِ زندگی چل پڑا ہے اور وہ یہاں کی زندگی میں اس قدر مصروف ہو گیا ہے کہ اس کے پاس اللہ سے ملنے کی فرصت نہیں ہے۔شہریارؔ کے الفاظ میں:

ان دنوں میں بھی ہوں کچھ کار جہاں میں مصروف
بات تجھ میں بھی نہیں رہ گئی پہلے والی

غزل کی روایات میں عاشق ہمیشہ اپنے معشوق سے ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے، انتظار کی مدت جتنی زیادہ طویل ہوتی ہے، محبت کی شدت

میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔لیکن جنت سے نکالے جانے کے بعد آدم کو خدا سے ملنے کا اشتیاق نہیں بلکہ خدا آدم سے ملنے کا مشتاق ہے،لیکن دنیوی مصروفیت کی وجہ سے آدم کے پاس اللہ سے ملاقات کا وقت نہیں رہا۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

یہ شعر پچھلے شعر کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔اس میں اقبال اس صورت حال کو بیان کر رہے ہیں جب قیامت برپا ہوگی اور سبھی لوگوں کی نیکی اور بدی کا حساب ہوگا۔اقبال چاہتے ہیں کہ قیامت کے روز جب ان کا حساب ہو تو ان کا اعمال نامہ سامنے نہ پیش کیا جائے۔چونکہ بندے کے گناہوں کی تعداد بہت زیادہ ہے،اس لیے اگر اس کے گناہوں کو سب کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ شرمسار ہوگا یعنی اس کی رسوائی ہوگی۔جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا اور جس کے 'عروج سے انجم سہمے جاتے تھے' اگر یہی بندہ ان فرشتوں کے سامنے شرمسار ہوگا تو بندے کے ساتھ ساتھ اس کے رب کی شرمساری کا بھی باعث ہوگا۔اللہ تعالیٰ کے شرمسار ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا دریائے رحمت جوش میں آئے گا اور وہ بندے کے گناہوں کو معاف فرمائے گا۔

اللہ قادر مطلق ہے اور اس کے پاس تمام اختیارات ہیں۔اگر وہ چاہے تو بغیر حساب کتاب کے بندے کو معاف کر سکتا ہے لیکن چونکہ وہ رحیم اور کریم بھی ہے اس لیے اپنے رحم و کرم سے اس کی بخشش فرمائے گا۔شارحین اقبال نے لکھا ہے کہ علامہ نے یہ شعر سعدی کی گلستاں کے اس شعر سے متاثر ہو کر لکھا تھا:

کرم بین و لطف خداوندگار　　گنہ بند کرداست و اوشرمسار

شعر میں مکر شاعرانہ بھی ہے۔شاعر کا مقصد تو اپنی بخشش کروانا ہے لیکن وہ اپنے اعمال کے صلے میں ملنے والی رسوائی کو اپنے خالق سے وابستہ کر کے اسے خالق کی رسوائی کا باعث بتاتا ہے۔حالانکہ اس سے بندے کا اپنا مفاد مقصود ہے۔

10.4.3　غزل: پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

یہ'بال جبریل' میں شامل دوسرے حصے کی غزلوں کی ساتویں غزل ہے۔اشعار کی ترتیب اور ہیئت کے اعتبار سے یہ غزل ہے لیکن اس کے آخری پانچ اشعار میں 'من' اور 'تن' کی بات کی گئی ہے جو موضوع کے اعتبار سے اسے نظم کا پیراہن عطا کرتی ہے۔اگر پہلے تین اشعار کو تشبیب کے طور پر دیکھیں تو اس پر قصیدے کا گمان ہوتا ہے جہاں تین اشعار میں مناظر فطرت کا ذکر کرنے کے بعد گریز کے طور پر ایک شعر ہے جس کے بعد پانچ اشعار میں ایک فلسفہ پیش کیا ہے۔لیکن بال جبریل میں ان اشعار کو غزل کے دوسرے میں 'غزل 7' کے تحت رکھا گیا ہے اس لیے ہم اس کے اشعار کی علاحدہ علاحدہ تشریح کریں گے۔

تشریح:

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

چراغ کا کام روشنی کرنا ہے لیکن اس شعر میں 'چراغ لالہ' کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔لالہ ایک پھول ہے جو سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ بہار کے موسم میں لالہ (سرخ پھول) سے پہاڑ اور وادیاں اسی طرح روشن ہوگئی ہیں جس طرح چراغ جلنے کے بعد اس کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔بہار کے موسم میں پھولوں کے کھلنے کے ساتھ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں شاعر کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر نغموں پہ اکسانے لگی ہیں۔شعر کے دونوں مصرعوں میں لفظ 'پھر' پر زور دیا گیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کام ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔یہ ایک Continous process ہے یعنی جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اور جب تک روز محشر نہ برپا ہوگا، یہ کام مسلسل چلتا رہے گا۔اس سے اللہ کے نظام قدرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

بہار کے موسم میں جنگل (صحرا) میں پھول اس طرح کھلے ہیں کہ ان کو دیکھ کر مختلف رنگوں میں ملبوس پریوں کا گمان ہوتا ہے۔اقبال کہتے

ہیں کہ صحرا میں یہ پھول ہیں یا پریاں قطار میں کھڑی ہوئی ہیں جن میں کسی نے اودے، کسی نے نیلے اور کسی نے پیلے رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔ اس شعر میں پھولوں کی کثرت اور مختلف رنگوں کو استعارے میں بیان کیا گیا ہے۔ پھولوں کو دیکھ کر پریوں کا گمان ہونا نہایت خوب صورت خیال اور نہایت دلکش تشبیہ ہے۔

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

نسیم صبح پھول کی پتی پر شبنم کا موتی (قطرہ) رکھ گئی ہے۔ جب سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو اس میں اور زیادہ چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر چہ یہ چمک بہت دیر تک نہیں رہتی کیونکہ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد شبنم کا یہ قطرہ بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ اس شعر میں لفظ 'اور' میں دو معنی ہیں۔ پہلی بار شعر پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ پھول کی پتی پر صبح چلنے والی ہوا شبنم کا قطرہ رکھ گئی ہے اور اس موتی کو سورج کی کرن چمکاتی ہے۔ دوسری طرف اگر لفظ 'اور' پر زور دے کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کے قطرے میں تو پہلے سے ہی چمک تھی لیکن سورج کی کرنوں نے اس کو مزید تاب عطا کر دی ہے اور یہ پہلے سے زیادہ چمک رہا ہے جس کی وجہ سے یہ منظر اور زیادہ خوش نما معلوم ہو رہا ہے۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

دنیا کی ہر مخلوق میں اللہ کی صنعت اور قدرت کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا اور انسان نے شہر آباد کر لیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حسن کو بے نقاب کرنے کے لیے شہروں کے بجائے جنگلوں کا انتخاب کیا۔ صحرا اس کے حسن کی نمائش کا بہترین نمونہ ہے۔ جنگل کے پھول، پھل اور چرند پرند اس کی عبادت میں مشغول ہیں۔ اس لیے اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی قدرت کا جلوہ دیکھنا چاہتے ہو تو جنگلوں کا رُخ کرو کیونکہ صحرا میں جو حسن قدرت ہے وہ شہر میں نہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک منطقی ذہن عطا کیا ہے۔ اس لیے جب وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اس کے من میں اس کے تئیں سوال پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ مناظر فطرت کا نظارہ کرتا ہے تو ان کی خصوصیات جاننا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنی ہی ذات کے بارے میں اس کے من میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے انسان! تو زندگی کا سراغ چاہتا ہے اور اللہ کو پانا چاہتا ہے، زندگی کے راز سے آگاہی کی خواہش رکھتا ہے تو تجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ تو جس چیز کی تلاش کر رہا ہے وہ دراصل تیرے ہی اندر موجود ہے۔ تو اگر زندگی کی حقیقت کا پتہ چاہتا ہے تو اپنے اندر ڈوب کر دیکھ۔ اگر تو میرا نہیں بنتا ہے تو نہ سہی، کم سے کم اپنا تو بن۔ یعنی تو اگر میری بتائی ہوئی باتوں کو ٹھیک نہیں سمجھتا تو کم سے کم اپنے اندر کی حقیقت کو جان اور وہ ایسی حقیقت ہے جو صرف من میں ڈوبنے پر ہی حاصل ہوتی ہے۔

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

اس شعر کے دونوں مصرعے صنعت سوال و جواب کی مثالیں ہیں۔ پہلے شعر میں ایک سوال ہے اور پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں سوال کر کے خود اقبال نے اس کا جواب دیا ہے۔ پھر اس کے بعد کے تینوں اشعار کے پہلے مصرعے 'من کی دنیا' اور دوسرے مصرعے میں 'تن کی دنیا' کی شرح پیش کر دی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ 'من کی دنیا کیا ہے؟' اور پھر خود کہتے ہیں کہ یہ سوز، مستی، جذب و شوق کا نام ہے۔ یعنی عشق حقیقی میں مستغرق ہو جانا اور ہر مادی شے سے بے نیاز ہو جانا۔ من کی دنیا وہ ہے جس میں غرق ہو کر انسان اللہ کے قریب ہو جاتا ہے جب کہ تن کی دنیا صرف انسان کو مفاد پرست خود غرض بناتی ہے اور وہ اس کے لیے دھوکہ، مکاری، فریب اور چالاکی سے کام لیتا ہے اور دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے۔

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دولت وہ عظیم الشان شے ہے جو صرف خوش قسمت لوگوں کے ہاتھ آتی ہے اور جب یہ ایک بار کسی کے ہاتھ آ جائے تو پھر واپس نہیں جاتی۔ یہ وہ نعمت ہے جو کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس تن کی دولت چھاؤں کی طرح ہے جس کو پائیداری حاصل نہیں ہے۔ جس طرح چھاؤں ایک مقام پر مستقل نہیں رہتی بلکہ اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے اسی طرح تن کی دولت بھی ایک طرف سے آتی ہے اور دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ یہ اس دولت کی طرح ہے جس کو پائیداری حاصل نہیں ہے۔ من کی دولت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جب کہ تن (جسم) کو ایک دن فنا ہو جانا ہے۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

اقبال کے نزدیک من کی دنیا ایک ایسی ریاست ہے جس میں مغربی حکمرانوں (انگریزوں) کا تسلط کسی طرح قائم نہ ہو سکا۔ بلکہ اس میں تو ہندو (برہمن) مسلم (شیخ) کے درمیان تضادات کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی من کی دنیا وہ پاکیزہ دنیا ہے جس میں مفادات، منافقت اور ریاکاری کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہاں انگریزوں کی فریبی سیاست تو دور، اس میں تو شیخ اور برہمن کے جھگڑوں کے لیے بھی جگہ نہیں پاتے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

یہ شعر اس غزل کا آخری شعر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے درویش کی اس بات نے شرم سے پانی پانی کر دیا کہ تو اپنی خودی کو چھوڑ کر اگر کسی غیر کے سامنے جھک گیا تو یہ سمجھ لے کہ نہ تو تیرے پاس من کی دولت رہے گی اور نہ ہی تن کی دولت باقی رہے گی۔ یعنی جس من کی دنیا کو تو لازوال اور دائمی سمجھتا ہے وہ بھی تجھ سے چھین لی جائے گی اور تیری مادی دولت و شہرت، جس کے لیے (تو) دن رات کوشاں رہتا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس شعر میں اقبال نے توحید کے فلسفے کو پیش کیا ہے۔ یعنی کوئی بھی شے اللہ کے سوا عبادت کے قابل نہیں ہے۔ انسان کو اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکنا چاہیے۔ غیر اللہ کے آگے جھکنا شرک ہے اس لیے جب انسان کسی کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اپنی دنیا (تن) بھی کھو دیتا ہے اور آخرت (من) بھی اس کے ہاتھ سے چلی جاتی ہے۔

10.4.4 غزل: عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم
اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

تشریح:

یہ 'بال جبریل' میں شامل دوسرے حصے کی غزلوں کی نویں غزل ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

'زیر و بم' موسیقی کی اصطلاح ہے، اس سے مراد آوازوں کا اتار چڑھاؤ ہے۔ اس شعر میں عشق کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔ جس طرح موسیقی اپنے سر کے لیے زیر و بم پر منحصر ہوتی یہ اسی طرح زندگی کی آواز کے لیے عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو زندگی کے نغمے میں اونچے نیچے سُر پیدا کرتا ہے۔ اگر زندگی سے عشق کو ختم کر دیا جائے تو یہ نغمہ بے ساز ہو جائے گا۔ دوسرے مصرعے میں مٹی کی تصویر سے مراد انسانی جسم ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جس سے مٹی کی تصویروں میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر عشق کا یہ جذبہ ختم ہو جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ انسان کے اندر جو سوز و گداز ہے وہ عشق کی وجہ سے ہی قائم ہے۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم

جب انسان عشق کرتا ہے تو اس کی پوری زندگی عشق کے جذبے میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے ریشے ریشے میں عشق سما جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہوتا جس میں عشق کا اثر نہ ملتا ہو۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح پھول کی شاخ میں صبح کی ہوا نمی پیدا کر دیتی ہے۔ شبنم کی نمی جڑوں کے ذریعے درخت کی ٹہنیوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں تک پہنچتی ہے۔ پھول اور پتیاں اس کی شاخوں سے اپنے لیے غذا اخذ کرتے ہیں لہٰذا جب نسیم صبح پھول کی شاخ کو نم کر جاتی ہے تو وہ نمی اس کے ریشے ریشے تک پہنچتی ہے اور اس کو تازگی عطا کرتی ہے۔ اسی طرح انسان کے ریشے

ریشے میں عشق تازگی پیدا کر دیتا ہے۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

اگر انسان اپنے خالق کو نہیں پہچانتا ہے تو وہ بادشاہوں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ رزق دینے والی ذات تو اللہ کی ہے۔ اگر انسان اس کو نہیں پہچانے گا تو بادشاہوں کا غلام ہو جائے گا۔ اس کے بجائے اگر وہ اس حقیقت (معرفت الٰہی) کو پالے تو اس میں ایسا جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ دارا اور جمشید جیسے بادشاہ بھی اس کے در کے بھکاری بن جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے رازق کو پہچان لے، اور اسے پہچاننے کے لیے عشق کی دولت کا ہونا ضروری ہے۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

دل کی آزادی سے مراد خواہشات سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اگر انسان حرص و ہوس کو چھوڑ دے تو وہ ساری دنیا پر حکمرانی کر سکتا ہے، لیکن مادی فوائد اور شکم پروری سے وہ ذلت کا شکار ہو کر مٹ جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے تجھے دونوں راستے بتا دیے ہیں، اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے کہ تو دل کی خواہشات سے آزاد ہو کر شہنشاہ بننا چاہتا ہے یا حرص و ہوس اور مادی فوائد کے لیے اپنی موت کا سامان کرنا چاہتا ہے۔

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو ملا سے مت پوچھ کہ اللہ کا حرم (مسجد) بندوں سے کیوں خالی ہو گیا بلکہ تو خود اپنے باطن سے پوچھ کہ اللہ کے (چاہنے والے) بندوں سے حرم کیوں خالی ہو گیا۔ پوری غزل میں اقبال نے 'عشق' پر زور دیا ہے اور اس سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں عشق کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ انسان مادیت کی طرف اس قدر راغب ہو گیا کہ اس نے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ حرم کی فضا تو عشق الٰہی سے ہی منور تھی، جب لوگوں کے دلوں میں عشق کا جوش و ولولہ نہیں رہا تو حرم کیوں کر آباد ہو سکتا ہے۔ اس بات کا افسوس اقبال نے اپنی نظم 'جواب شکوہ' میں اس طرح کیا ہے:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

10.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ بال جبریل علامہ اقبال کی اردو شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے جو ان کے پہلے مجموعہ 'بانگ درا' کی اشاعت کے گیارہ سال بعد علامہ اقبال کی وفات سے تین سال قبل جنوری 1935 میں شائع ہوا۔ اس میں وہ اردو کلام شامل ہے جو علامہ اقبال نے بانگ درا کی تکمیل سے بالِ جبریل کی اشاعت تک کہا تھا۔

☆ پہلے اس کا نام ''نشان منزل'' رکھا گیا لیکن بعد میں ''بال جبریل'' کر دیا گیا۔

☆ اس کے پہلے حصے میں 16 اور دوسرے حصے میں 61 غزلیں شامل ہیں۔

☆ اس مجموعے میں شامل کئی نظمیں بین الاقوامی اسفار کے دوران لکھی گئیں۔

☆ بال جبریل میں تغزل بھی ہے، تصوف بھی ہے اور فلسفیانہ نظمیں بھی شامل ہیں۔

☆ اقبال سے قبل آزاد اور حالی کے یہاں منظر کشی سے متعلق شاعری دیکھی جاسکتی ہے۔ کلاسیکی شاعری میں فطرت سے وابستگی محبت کے عنصر کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے لیکن براہ راست فطرت اور اس کے مظاہر سے بے تعلقی دیکھنے کو ملتی ہے۔

☆ بانگ درا اور بال جبریل کی اشاعت کے درمیان تقریباً 12 سال کا وقفہ ہے۔ ان 12 برسوں میں علامہ اقبال کا کوئی اردو مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا البتہ فارسی کے دو مجموعے چھپے۔

☆ بالِ جبریل کی غزلیات اردو غزل کی پوری تاریخ میں ایک نئی آواز ہیں۔ ان کے انداز بیان میں ایسی ایسی جدتیں ہیں جو ان سے پہلے کی غزلیات میں نہیں ہے۔

☆ بانگ درا کے مقابلے میں اس کتاب میں خیالات کی گہرائی اور سنجیدگی زیادہ ہے۔ اس کی فکر میں ایک بلند پرواز ہے۔ اسی لیے اس کا عنوان 'بال جبریل' ہے۔

☆ معنوی اعتبار سے بال جبریل کی غزلوں میں خیالات کی بلندی موجود ہے۔ زیادہ تر غزلوں میں ایک مسلسل خیال پیش کیا گیا ہے اور حسب ضرورت قطعہ بند اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔

☆ بال جبریل کی غزلوں میں ردیف کی پابندی سے گریز کیا گیا ہے اور قافیہ نہایت مشکل ہیں جن میں عام شعرا نے کم شعر لکھے ہیں۔

☆ کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن کے قوافی میں جبریل، اسرافیل، خلیل، اسماعیل، فرہاد، رازی، شبیر، بسطامی، خسرو جیسے تلمیحی کرداروں کو نظم کیا ہے۔

☆ بال جبریل کی بعض غزلوں میں عربی قوافی میں **صہبا، کسریٰ، زہرا، الا، طاہا، لاتخف، لااله الا، اسداللهی** کا استعمال کرتے ہیں تو بعض غزلوں میں آدھا اور بعض میں عربی کا مکمل مصرع لگاتے ہیں۔ مثلاً **اشهد ان لا اله، اشهد ان لا اله، لااله الا هو، لااله الا الله** وغیرہ۔

☆ بال جبریل میں حصہ اول کی غزلوں میں ذات، حیات اور کائنات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ذات (خالق کائنات کی ذات)، حیات سے مراد انسانی حیات اور کائنات سے مراد دنیا کی بے ثباتی مراد ہے۔

☆ غزلوں کے علاوہ بال جبریل کی نظمیں بھی تغزل کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ انسان دوستی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ آمریت، ملوکیت اور انسانی استحصال کے خلاف احتجاج کی صدائیں بھی ہیں۔

10.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
کج	:	ٹیڑھا	انجم	:	ستارے، تارے، کواکب
لامکاں	:	جہاں کوئی نہ رہتا ہو	صبح ازل	:	آغاز آفرینش، پہلا دن

کوکب	:	ستارہ		خاکی	:	جوخاک سے بنا ہو	
تابدار	:	چمک دار		خرد	:	عقل	
آشکار	:	ظاہر ہونا		بیکراں	:	جس کی انتہا نہ ہو	
آبجو	:	چھوٹی نہر		ہمکنار ہونا	:	بغل گیر ہونا، ملنا	
صدف	:	سیپ		خزف	:	ٹھیکرا، سفال ریزہ	
گوہر شاہوار	:	قیمتی موتی		دمِ نیم سوز	:	آدھی جلی ہوئی جان	
رزاق	:	رزق دینے والا		بہشت	:	جنت	
دراز	:	لمبا، طویل		کوہ ودمن	:	پہاڑ اور میدان	
مرغ چمن	:	چمن کا پرندہ		برگ گل	:	پھول کی پتی	
سراغ	:	پتہ، نشان، کھوج		جذب وشوق	:	دیوانگی کا جذبہ	
مکروفن	:	کمینہ، سفلہ، دھوکہ		افرنگی	:	انگریز	
قلندر	:	فقیر		زیروبم	:	موسیقی کا اتار چڑھاؤ	
سحرگاہی	:	صبح صادق کا وقت، علی الصباح		محتاج ملوک	:	بادشاہوں کا محتاج	
دارا	:	ایران کا ایک نامی بادشاہ		جم	:	جمشید، مراد بڑا بادشاہ	
شکم	:	پیٹ، بطن		گدا	:	فقیر	
شاہوار	:	بادشاہوں کے لائق		کار جہاں	:	دنیا کا کام	
دفترِ عمل	:	کارناموں کا حساب		لالہ	:	سرخ پھول	
طائرِ بہار	:	وہ چھوٹی سی چڑیا جو بہار کی آمد کی خوش خبری سناتی ہے					

10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ بال جبریل سے قبل اقبال کا کون سا اردو شعری مجموعہ شائع ہوا؟

2۔ بال جبریل کا نام پہلے کیا رکھا گیا؟

3۔ بال جبریل کا سنہ اشاعت کیا ہے؟

4۔ بال جبریل کی کسی مشہور نظم کا نام لکھیے۔

5۔ بال جبریل کے سرورق پر کس سنسکرت شاعر کا شعر درج ہے؟

6۔ بال جبریل کو 'گل سرسبد' کس نے کہا ہے؟

7۔ بال جبریل کے پہلے حصے میں کتنی غزلیں ہیں؟

8۔ حکیم سنائی کے قصیدے کی پیروی میں اقبال نے جو غزل لکھی، وہ کتنے حصوں پر منحصر ہے؟

9۔ بال جبریل میں شامل 'مسجد قرطبہ' کو اقبال نے کس ملک میں لکھا؟

10۔ 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' جیسی شاہ کار نظمیں اقبال کے کس مجموعے میں شامل ہیں؟

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ بال جبریل کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

2۔ بال جبریل میں شامل غزلوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ بال جبریل میں محاسن کلام کے استعمال پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ بال جبریل میں شامل پہلے حصے کی غزلوں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5۔ بال جبریل میں شامل طویل نظموں کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ بال جبریل کی روشنی میں اقبال کی غزلوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2۔ ''بال جبریل' کی غزلیں 'بانگ درا' کی غزلوں سے زیادہ پختہ ہیں۔'' اس خیال کی وضاحت کیجیے۔

3۔ بال جبریل کا تعارف پیش کرتے ہوئے اقبال کے مختلف ادوار کا جائزہ لیجیے۔

10.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ بال جبریل	علا اقبال
2۔ بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صدیق جاوید
3۔ اقبال کا فن	گوپی چند نارنگ (مرتب)
4۔ فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
5۔ فکر اقبال کے بعض اہم پہلو	جگن ناتھ آزاد
6۔ ارتباط حرف و معنی	خرم علی شفیق

اکائی 11: ضربِ کلیم کی شامل نصاب غزلیں

اکائی کے اجزا

11.0		تمہید
11.1		مقاصد
11.2		ضربِ کلیم: مختصر تعارف
11.3		ضربِ کلیم کی شامل نصاب غزلیں
	11.3.1	غزل نمبر 1: دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
	11.3.2	غزل نمبر 2: نہ میں اعجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
	11.3.3	غزل نمبر 3: ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سراغ
	11.3.4	غزل نمبر 4: دریا میں موتی! اے موجِ بیباک!
11.4		اکتسابی نتائج
11.5		کلیدی الفاظ
11.6		نمونۂ امتحانی سوالات
	11.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	11.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	11.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
11.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے علامہ اقبال کے شعری مجموعوں ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' کی چار چار غزلوں کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں آپ علامہ اقبال کے شعری مجموعہ ''ضربِ کلیم'' کی چار غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔ ''ضربِ کلیم'' علامہ اقبال کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، جو 1936ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں شامل نظمیں اور غزلیں علامہ اقبال کی پہلے کی شاعری سے بالکل مختلف ہیں۔ انہوں نے ضربِ کلیم کے ذریعے دورِ حاضر کی سامراجی قوتوں پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود ہی اس مجموعے کو ''اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف'' کا نام دیا ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر وہ نظمیں شامل ہیں، جو اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں، ناظرین سے اور تمہید کے علاوہ چھ موضوعات یعنی ''اسلام اور مسلمان''، ''تعلیم و تربیت''، ''عورت''، ''ادبیات فنون لطیفہ''، ''سیاست مشرق و مغرب'' اور ''محراب گل

افغان کے افکار'' پر مشتمل ہے۔اس مجموعے میں معدودے چند غزلیں ہی شامل ہیں،جن میں سے اس اکائی میں آپ چار اہم غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ ضرب کلیم کا تعارف کرا سکیں۔
- ☆ ضرب کلیم کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- ☆ ضرب کلیم میں شامل موضوعات پر تبصرہ کر سکیں۔
- ☆ ضرب کلیم کی چار اہم غزلوں کی تشریح کر سکیں۔

11.2 ضرب کلیم: مختصر تعارف

ضرب کلیم علامہ اقبال کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، جو ان کی وفات کے دو سال قبل یعنی 1936ء میں منظر عام پر آیا۔ بال جبریل اور ضرب کلیم کی اشاعت میں محض ایک سال کا فرق ہے اور ان دونوں کے درمیان میں اقبال کے فارسی کلام کا کوئی مجموعہ حائل نہیں ہے۔ بال جبریل اور ضرب کلیم دونوں میں ایک خاص نوعیت کا فرق ہے۔ وہ یہ کہ بال جبریل میں زیادہ تر غزلیں اور کچھ طویل نظمیں ہیں اور ضرب کلیم میں زیادہ تر نظمیں ہیں، اس میں شامل غزلوں کی تعداد صرف پانچ ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں شامل کلام ایک ہی عہد کی تخلیق معلوم پڑتے ہیں۔

ضرب کلیم کو علامہ اقبال نے دور حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے۔ اقبال کے یہاں ''دور حاضر'' ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ مغرب نے دنیا بھر میں جو گمراہیاں پھیلائی ہیں ان کو لوگوں نے راہ راست سمجھ لیا ہے، جس کی وجہ سے پوری دنیا روز بہ روز اخلاقی اور روحانی لحاظ سے زوال کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ انہی گمراہیوں میں مبتلا افراد کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

تہذیب حاضر کی اسی انسانیت دشمن آزادی کو علامہ اقبال نے بڑی تفصیل سے ضرب کلیم میں موضوع بنایا ہے اور متعدد نظمیں لکھ کر مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ذیل میں ان نظموں کو درج ذیل زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(i) امت مسلمہ سے متعلق:

صبح، لَا اِلٰہ اِلا اللّٰہ، تن بہ تقدیر، معراج، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، زمین اور آسمان، مسلمان کا زوال، اجتہاد، شکر و شکایت، ذکر و فکر، ملائے حرم، تقدیر، توحید، علم اور دین، ہندی مسلمان، آزادیٔ کشمیر کے اعلان پر، جہاد، قوت اور دین، فقر و ملوکیت، اسلام، حیات ابدی، سلطانی، صوفی سے افرنگ زدہ، تصوف، ہندی اسلام، دنیا، نماز، وحی، شکست، عقل و دل، مستی کردار، قبر، قلندر کی پہچان، فلسفہ، مردانِ خدا، کافر و مومن، مہدیِ برحق، مومن، محمد علی باب، تقدیر، اے روحِ محمدؐ، مدنیتِ اسلام، امامت، فقر و راہبی، تسلیم و رضا، نکتہ توحید، الہام اور آزادی، جان و تن، لاہور و کراچی، نبوت، آدم، مکہ اور جنیوا، اے پیرِ حرم، مہدی، مردِ مسلمان، پنجابی مسلمان، آزادی، اشاعت، اسلام فرنگستان میں، لَا دِالّا، امرائے عرب سے، احکام

الٰہی، موت اور قُم باذن اللہ۔

(ii) تعلیم وتربیت سے متعلق:

مقصود، زمانۂ حاضر کا انسان، اقوامِ مشرق، آگاہی، مصلحین مشرق، مغربی تہذیب، اسرار پیدا، سلطان ٹیپو کی وصیت، بیداری، خودی کی تربیت، آزادئ فکر، خودی کی زندگی، حکومت، ہندی مکتب، تربیت، خوب وزشت، مرگِ خودی، مہمانِ عزیز، عصر حاضر، طالب علم، امتحان، مدرسہ، حکیم نطشہ، اساتذہ، دین وتعلیم اور جاوید سے۔

(iii) طبقہ نسواں سے متعلق:

مردِ فرنگ، ایک سوال، پردہ، خلوت، عورت، آزادئ نسواں، عورت کی حفاظت، عورت اور تعلیم وعورت۔

(iv) ادبیات اور فنون لطیفہ سے متعلق:

دین وہنر، تخلیق، جنون، اپنے شعر سے، پیرس کی مسجد، ادبیات، نگاہ، مسجد، قوت الاسلام، تیاتر، شعاع امید، امید، نگاہِ شوق، اہل ہنر سے، وجود، سرود، نسیم وشبنم، اہرامِ مصر، مخلوقات ہنر، اقبال، فنون لطیفہ، صبح چمن، خاقانی، رومی، جدّت، مرزا بیدل، جلال وجمال، مصور، سرودِ حلال، سرودِ حرام، فوارہ، شاعر، شعر عجم، ہنروارانِ ہند، مردِ بزرگ، عالمِ نو، ایجاد ومعانی، موسیقی، ذوقِ نظر، شعر، رقص وموسیقی، ضبط اور رقص۔

(v) سیاست مشرق ومغرب سے متعلق:

اشتراکیت، کارل مارکس کی آواز، انقلاب، خوشامد، مناصب، یورپ اور یہود، نفسیاتِ غلامی، بلشویک روس، آج اور کل، مشرق، سیاسیاتِ افرنگ، خواجگی، غلاموں کے لیے، اہلِ مصر سے، ابی سینا، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، جمعیتِ اقوام اور مشرق، سلطانی جاوید، جمہوریت، یورپ اور سوریا، مسولینی، گلہ، انتداب، لادین سیاست، دامِ تہذیب، نصیحت، ایک بحری قزاق اور سکندر، جمعیتِ اقوام، شام و فلسطین، سیاسی پیشوا، نفسیاتِ غلامی، غلاموں کی نماز، فلسطینی عرب، مشرق ومغرب اور نفسیات حاکمی۔

(vi) محراب گل افغان کے افکار سے متعلق:

اس حصے میں صرف ایک ہی نظم ہے، جس کا عنوان بھی ''محراب گل افغان کے افکار'' ہے، جس کا شمار ضرب کلیم کی طویل نظموں میں ہوتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اس مجموعے میں پانچ (5) غزلیں بھی شامل ہیں۔

ضرب کلیم کی اکثر نظمیں بے حد مختصر ہیں۔ زیادہ تر نظمیں دو، تین یا چار بند سے تجاوز نہیں کرتی ہیں۔ اس میں شامل تمام نظمیں ہر قسم کے حشو و زوائد سے بالکل پاک ہیں۔ اگرچہ انداز بیان میں عمداً شعریت نہیں رکھی گئی ہے اس کے باوجود نظموں کے مطالعے سے یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ غیر شاعرانہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک الگ طرح سے جذبات کو پیش کیا گیا ہے، جو پڑھنے والوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

علامہ اقبال اپنا نظام فکر اس سے پہلے پیش کر چکے تھے، لیکن اس مجموعے میں شامل بعض نظمیں اتنی واضح ہیں کہ اقبال کے افکار کے متعلق غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس مجموعے کے اکثر اشعار علامہ اقبال کے خیالات کی وضاحت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اقبال نے فن سے متعلق اپنے نظریات کو جس طرح اس مجموعے میں پیش کیا ہے وہ کسی اور میں نہیں ملتا۔ اسی طرح اس میں پیش کیے گئے موضوعات بھی مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضرب کلیم میں موجود کلام، اقبال کے زمانۂ پختگی کا حاصل ہے۔ خیالات کی پختگی اور فنی لوازمات کے اعتبار سے ضرب کلیم کی

اہمیت یقیناً بہت زیادہ ہے۔اس مجموعے کے بارے میں اقبال کے سب سے معتبر شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''ضرب کلیم 1936ء میں شائع ہوئی۔اس میں شعریت یا تغزل کم ہے اور فلسفہ زیادہ ہے۔بعض نظمیں اس مجموعے میں اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان کی سرحد الہام سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔مختصر طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ضرب کلیم چوں کہ بہت پختہ عمر کا کلام ہے،اس لیے قدرتی طور پر اس میں خیالات کی گہرائی اور پختگی نظر آتی ہے۔اور اس اعتبار سے کہ اس کتاب میں علامہ نے دنیا کے تمام مسائل پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے تنقید کی ہے۔کم از کم اردو یا فارسی میں تو کوئی کتاب اس کے پایہ کی نہیں ہے۔ ضرب کلیم، بقول علامہ مرحوم دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب پر اتنے مختصر لفظوں میں اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں ہے۔''

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی،مقدمہ شرح ضرب کلیم،عشرت پبلشنگ ہاؤس،لاہور،ص8,9)

ضرب کلیم کے تعارفی باب میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال نے اس مجموعے کا نام ''ضرب کلیم'' کیوں رکھا۔ دراصل علامہ اقبال نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمان راہِ رست سے بھٹک گئے ہیں اور مغرب کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں میں کھوئے ہیں۔اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انہیں صحیح راستے پر لانے کے لیے اس طرح کی شاعری کی۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس مجموعے کا عنوان ''ضرب کلیم'' رکھا۔جس طرح موسیٰؑ نے فرعونی قوتوں پر کاری ضرب لگائی تھی اسی طرح اقبال نے بھی اس تصنیف کے ذریعے دور حاضر کی فرعونی قوتوں پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس مجموعے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا ضرب کلیم، نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ علامہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو اشعار ہیں یا با الفاظ صحیح تر ان اشعار میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں،وہ عصر حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں ضرب کلیم کا اثر رکھتے ہیں۔اور علامہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان خیالات پر عامل ہو کر اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس کی بدولت وہ دورِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر سکیں۔'' (ایضاً)

اس تعارف کے بعد آیئے اب ہم اقبال کے شامل نصاب غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

11.3 ضرب کلیم کی شامل نصاب غزلیں

11.3.1 غزل نمبر1:

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرض کہن کا چارہ

ترا بحر پر سکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابی کنارہ!

تو ضمیر آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزہ ستارہ

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہان دوش و فردا
جسے آگئی میسر مری شوخی نظارہ

تشریح:

علامہ اقبال کی یہ غزل ضرب کلیم کے پہلے باب میں شامل ہے، جس کا عنوان ''اسلام اور مسلمان'' ہے۔ اس پورے باب میں جو نظمیں اور غزلیں ہیں ان سبھی میں اقبال نے اسلام اور مسلمان کو ہی موضوع بنایا ہے۔

اس غزل کے پہلے شعر میں علامہ اقبال مسلمانوں سے مخاطب ہیں۔ وہ کہتے ہیں اے مسلمان! تیرا دل جذبۂ محبت سے خالی ہے۔ ایسا دل جو عشق کے جذبے سے سرشار نہ ہو، وہ صرف ایک مردہ دل ہے اور کچھ نہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اے مسلمانوں تم اپنے دلوں کو دوبارہ زندہ کرو، کیوں کہ قوموں کے مرض کہن یعنی اس پرانی بیماری کا علاج اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ گویا مسلمان حقیقی زندگی کے جذبوں سے محروم ہونے کے باعث آج ذلت و پستی اور مصائب و آلام کا شکار ہیں۔ اس مرض کا علاج یہی ہے کہ وہ قوت و ہمت اور جہد و عمل سے کام لے کر اپنی بقا کا سامان اکٹھا کریں۔ کیوں کہ جب دل میں کسی شئے کے حصول کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے تو گویا وہ زندہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال مسلمانوں ہی سے مخاطب ہیں۔ وہ کہتے ہیں مجھے بے حد افسوس ہے کہ تیرے اندر کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا، تیرے اندر کوئی امنگ نظر نہیں آتی، تیری سمندر جیسی زندگی پر سکون و خاموشی طاری ہے۔ یہ واقعی سکون ہے یا پھر کسی جادو کا اثر ہے۔ تیرے اس سمندر میں نہ تو کوئی نہنگ یعنی مگر مچھ ہے، نہ کوئی طوفان ہے اور نہ ساحل سے ٹکرانے اور اسے کاٹنے کا جوش ہے۔ اس استعارے میں اقبال کا مقصود یہ کہنا ہے کہ اے مسلمان تیرے دل میں نہ تو کوئی ولولے اور جذبے ہیں اور نہ ہی آزادی کی کوئی لہر ہے، جو تیری بیداری کا ثبوت دے سکے، تو جیسے سر سے پیر تک جمود مایوسی اور افسردگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ تجھے اس موت نما خاموشی کو توڑ کر اس سے باہر نکلنا چاہیے۔

تیسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو ابھی آسمان کے ضمیر یعنی آسمان کے چھپے ہوئے راز سے نا آشنا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ستاروں کی گردش اور ان کے اشارے تجھے بے قرار نہیں کرتے۔ تو نے کائنات کے نظام پر توجہ نہیں کی اور اس کے قوانین کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کہ، جب کہ فطرت برملا یہ دعوت دے رہی ہے کہ مجھ پر غور و فکر کرو۔ میرے اندر پوشیدہ اسرار کو سمجھو اور مجھے تسخیر کرو، لیکن اس کے لیے آزادی فکر و عمل، عزم و حوصلہ چاہیے جس سے مسلمان محروم ہیں۔

چوتھے شعر میں علامہ اقبال مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے اپنی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے سحر کے نغمے نے میری بجھی ہوئی راکھ میں، جو ایک چھپی ہوئی چنگاری تھی اسے تیرے بانس کے جنگل میں ڈال دیا ہے۔ امید ہے کہ اس چنگاری سے آگ بھڑکے گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اقبال کی حیات افروز شاعری نے مسلمان کے مردہ دل میں نئی آواز اور تازہ روح پھونک دی، تاکہ مسلمانوں میں عشق حقیقی کا جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ سراپا سوز بن جائیں۔

اس غزل کے پانچویں اور آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ ماضی و مستقبل کی دنیا اسی کو نظر آئے گی، جس میں میری طرح نظارہ کرنے کا جوہر پیدا ہوگا۔ گویا جو کوئی میری اس شاعری کے حوالے سے، میرے نقطۂ نظر سے اس دنیا کی حقیقت پر غور و خوض کرے گا، اسی پر اس کائنات کے ماضی و مستقبل کا راز آشکار ہو سکے گا اور وہ جہد و عمل سے اپنی بقا کا سامان کر سکے گا۔

11.3.2 غزل نمبر 2:

نہ میں اعجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے مَیں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر
ترا دِیں نفَس شماری، مرا دِیں نفَس گذاری

تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تدَرواں نہیں دینِ شاہبازی

ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جُنوں نظر نہ آیا
کہ سِکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی

نہ جُدا رہے نَوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیِ اُمَم ہے یہ طریقِ نَے نوازی

تشریح:

علامہ اقبال کی یہ غزل ضرب کلیم کے دوسرے باب میں شامل ہے، جس کا عنوان ''تعلیم و تربیت'' ہے۔ تعلیم و تربیت سے متعلق علامہ اقبال کا ایک واضح نقطۂ نظر تھا اور وہ یہ تھا کہ کتابی علم محض معلومات فراہم کرتا ہے جب کہ حیات و کائنات کا مشاہدہ حقیقی علم سے روشناس کراتا ہے۔ اقبال نے اسی نظریے کو اس غزل میں پیش کیا ہے۔

اس غزل کے پہلے شعر میں علامہ اقبال نے اس بات کی تربیت کی ہے کہ امت مسلمہ رنگ ونسل اور زبان و ملک کی تفریق کے بغیر ایک ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نہ تو ایرانی ہوں اور نہ ہندوستانی اور نہ عراقی وحجازی ہوں۔ اس لیے کہ میں نے خودی سے سیکھا ہے کہ دو جہاں کے حدود و قیود اور رسوم سے بے نیاز ہو جاؤں۔ جب تک انسان اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو جاتا تب تک اس کا زاویۂ نگاہ محدود رہتا ہے اس لیے وہ اپنے کو مختلف ملکوں اور مختلف فرقوں سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے اور سب آدم کی اولاد ہیں، تو اس کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ملکوں اور فرقوں کے امتیازات سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر میں عجمی بھی اللہ کی مخلوق ہے اور ہندوستانی، عراقی اور حجازی بھی۔ وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کی بنیاد پر کسی سے کوئی امتیاز نہیں کرتا اور سب سے محبت کرتا ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تو زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہے کہ انسان جتنے زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکے، اتنا ہی اچھا ہے، لیکن میں زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہوں کہ انسان، جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہے اور حیات کی تمنا نہ کرے۔ تو دنیاوی زندگی کو عزیز رکھتا ہے۔ تجھے اپنی جان بہت پیاری ہے۔ میں آخرت کی زندگی پر نظر رکھتا ہوں اور اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا چاہتا ہوں۔

تیسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اسلام تو انسان کو شہباز بنانا چاہتا ہے، لیکن اس دورِ غلامی میں دین اسلام کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ اب شریعتِ اسلامی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کمزور بلکہ عاجز و درماندہ بن جائے۔ اچھا یہ ہوا کہ تو بھی بدل گیا ہے۔ کیوں کہ باز کی زندگی تیتر کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ تیتر بھلا باز کی زندگی کیسے اختیار کر سکتا ہے؟

اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے مسلمان! تو اگر اپنے آپ کو بدل لے تو یہ تیرے حق میں بہتر ہے اس لیے کہ اب شریعت بدل گئی ہے۔ یہ شریعتِ موسیٰ یا شریعتِ عیسیٰ نہیں بلکہ شریعتِ محمدی ہے، جو انسان کو ظلم کا خاموش تماشائی بننا یا باطل کے غلبے کو برداشت کرنا نہیں سکھاتی بلکہ ظلم اور باطل کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا سکھاتی ہے۔ اس لیے اے مسلمان! تجھے آرام طلبی چھوڑ کر سخت کوشی اختیار کرنا ضروری ہے۔

اس غزل کے چوتھے شعر میں اقبال نے مسلمانوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تو اپنے راستے سے بھٹک گیا ہے، تو جب تک اپنے اصل راستے کی طرف یعنی صراط مستقیم کی طرف واپس نہیں آئے گا تب تک تو بھٹکتا ہی رہے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تیری زندگی میں مجھے عشق کا وہ جذبہ نظر نہیں آتا، جو تیری عقل کی اصلاح کر سکے اور جب تک عقل انسانی عشق کے تابع نہ ہو، وہ انسان کے حق میں مفید نہیں ہو سکتی۔

اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اے مسلمان! تیری زندگی میں مجھے وہ جنوں کہیں نظر نہیں آتا، جو عقل کو بگڑے کام سنوارنے کا عمل سکھا سکتا ہے یعنی تجھ میں وہ جذبۂ عشق نہیں رہا، جس کی بدولت تو اپنے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرنے اور بگڑے کاموں کو سنوارنے کے لائق بنا سکے۔

اقبال نے اس غزل کے پانچویں اور آخری شعر میں شاعری کے فلسفے کو بیان کیا ہے۔ اگر شاعر اپنے کلام میں زندگی کے حقائق پیش نہیں کرتا تو اس کی شاعری قوم کے حق میں ہلاکت کا پیغام بن جاتی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی اردو شاعری پر نگاہ ڈالنے سے اس شعر کی معنویت واضح ہوتی ہے۔ ''نواگر'' استعارہ ہے شاعر کا اور ''نے نوازی'' شاعری کا استعارہ ہے۔ مطلب یہ کہ محض تفریح طبع کے لیے کی جانے والی شاعری قوم کے حق میں شدید نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نظر زندگی کے حقائق پر رہے تاکہ وہ قوم کی بیداری وعظمت کا سامان اپنی شاعری سے جمع کر سکے۔

11.3.3 غزل نمبر3:

ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندہ حر کے لیے جہاں میں فراغ

فروغ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحب 'مازاغ '

وہ بزم عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثال ستارہ جس کے ایاغ

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

تشریح:

علامہ اقبال کی یہ غزل بھی ضرب کلیم کے دوسرے باب ''تعلیم وتربیت'' سے ماخود ہے۔اس غزل میں بھی مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر براہ راست زور دیا گیا ہے اور اللہ کی وحدانیت کو عام کرنے کی بات کی گئی ہے۔

اس غزل کے پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں۔وہی انسان اپنی منزل مقصود کا سراغ پا سکتا ہے، جو تاریک رات میں چیتے کی آنکھ کو اپنے راستے کا چراغ بنائے گا۔ چیتے کی آنکھ اندھیری رات میں روشن ہوتی ہے، جو دور سے چراغ معلوم پڑتی ہے۔مطلب یہ کہ انسان مشکلوں، مصیبتوں اور رکاوٹوں سے بے پرواہو کر اپنی منزلِ مقصود (عظمت وبقا کی منزل) تک مسلسل چلتا رہے۔راہ کی مشکلات اور مصیبتیں اس کے حوصلے اور جذبے کو مضبوط کرتی چلی جائیں گی۔

دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ فرصت کے اوقات صرف غلاموں کو میسر آتے ہیں کیوں کہ ان کا کوئی عظیم مقصد نہیں ہوتا اور وہ بے عمل زندگی گزارنے ہی میں خوش رہتے ہیں جب کہ ایک مردِ آزاد، مردِ حق کو اس دنیا میں ذرا بھی فراغت نہیں ملتی، اس لیے کہ وہ راہِ حق میں مسلسل گامزن رہتا ہے۔اس کی منزلِ مقصود محبوبِ حقیقی تک رسائی ہے اور اس کی رضا پوری کرنا ہے۔

تیسرے شعر میں علامہ اقبال مسلمانوں سے براہِ راست مخاطب ہیں اور کہتے ہیں اے مسلمان! تو اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے مغربی قوموں کے

مادّی عروج کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ سرورِ دو عالمﷺ، تیری نگاہ کی نگہبانی فرمائیں اور تجھے گمراہ ہونے سے محفوظ رکھیں۔

''صاحب مازاغ'' میں اس آیتِ مبارکہ کی طرف اشارہ ہے، جس میں اللہ نے آپؐ کی نگاہ کی ان الفاظ میں توصیف فرمائی ہے۔ ''مَـــاْ زَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطُغٰی۔ نہ تو آپؐ کی نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔

اس غزل کے چوتھے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو کفار کی عیش وطرب کی محفلوں سے مرعوب نہ ہو جانا، اس قسم کی محفلوں کو کبھی ثبات و دوام نصیب نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ یہ بلوریں جام جن کی خوبصورتی ستاروں کو شرماتی ہے، سب فریب نظر ہیں، کوئی دن جاتا ہے کہ یہ محفلیں درہم برہم ہو جائیں گی۔ مطلب یہ کہ عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی اور جذبۂ عشق حقیقی سے محروم قوم بہت جلد اپنا اقتدار اور عروج کھو کر اپنے وجود کو فنا کر لیتی ہیں۔

اس غزل کے پانچویں اور آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ کتابوں کے شائق کو مطالعے نے اس قدر کور ذوق کر دیا ہے کہ وہ حقائق اولیٰ سے غافل ہی رہا اگر چہ اس کائنات میں موجود مظاہر اپنی ساخت و بافت میں جوہرِ حق رکھے ہوئے ہیں مگر کتابوں نے حق بینی اور طلبِ حق کی صلاحیت ہی سلب کر لی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ مظاہر اس کے آس پاس ہی موجود تھے اور وہ ان سے غافل تھے۔ مصرعۂ ثانی میں صبا سے مراد مظاہر فطرت ہیں اور بوئے گل سے مراد حقیقتِ مطلق۔ مطلب یہ کہ کتاب خوانی نے قدرت کے حسین مناظر کو دیکھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے نیز انہی مناظر سے خدا کے وجود کے قائل ہونے کا ذوق ہی چھین لیا ہے۔

11.3.4 غزل نمبر 4:

دریا میں موتی، اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نَیستاں تیرا ہے نم ناک

تیرا زمانہ، تاثیر تیری
ناداں! نہیں یہ تاثیرِ افلاک

ایسا جُنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سِیے ہیں تقدیر کے چاک

کامِل وہی ہے رِندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منّتِ تاک

رکھتا ہے اب تک مَیخانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید
ان اُمّتوں کے باطن نہیں پاک

تشریح:

علامہ اقبال کی یہ غزل ضرب کلیم کے چوتھے باب میں شامل ہے، جس کا عنوان ''ادبیات فنون لطیفہ'' ہے۔ یہ غزل جملہ سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل کے تمام اشعار میں بعض حقائق و معارف کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

اس غزل کے پہلے شعر میں علامہ اقبال مسلمانوں سے مخاطب ہیں۔ وہ کہتے ہیں اے مردِ مسلماں! اگر موتیوں کی آرزو ہے تو ساحل کی زندگی سے قطع تعلق کر کے تجھے مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا اور اگر تو عافیت کی زندگی بسر کرنے کا آرزومند ہے تو پھر موتیوں کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ ساحل کے باشندوں کو تو جن میں سمندر کی گہرائی ڈوبنے کی ہمت اور محنت کا جذبہ نہیں صرف خس و خاشاک (گھاس پھوس) ہی حاصل ہوسکتا ہے، جو بہہ کر کنارے سے آ لگتا ہے۔ موتی حاصل کرنے کے لیے موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سمندر میں غوطہ زنی کرنی پڑتی ہے۔

اس غزل کے دوسرے شعر میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میری چنگاری (شاعری) میں بجلی کے سے جوہر ہیں، جو سب برائیوں کو تباہ کر سکتی، جلا سکتی ہے، لیکن تکلیف اس بات کی ہے کہ تیرا بانس کا جنگل نمی میں ڈوبا ہوا ہے اور ظاہر ہے وہ نہیں جل سکتا۔ یعنی اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تجھ میں وہ جذبے نہیں ہیں جو میری شاعری سے متاثر ہو کر تجھ میں سوز و گداز پیدا کر دے۔ اس شعر میں نمی سے مراد قوم کی غفلت، بے حسی اور مایوسی بھی ہوسکتی ہے۔

تیسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو اپنے زمانے کو جس طرح بنانے کی خواہش رکھے ویسا بنا سکتا ہے، اس میں ردو بدل تیرے ہی اثر سے ہوگا۔ اے نادان! یہ آسمانوں کی تاثیر نہیں ہے۔ ایسا مت سمجھ کہ یہ آسمان کا کھیل ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے انسان پر مصائب اور بلائیں آسمان سے آتی ہیں۔ آسمان بڑا ستم گر ہے۔ وہ انسان کو خوش نہیں دیکھ سکتا وغیرہ۔ شعر میں کہا گیا ہے کہ فی الحقیقت ایسا کچھ نہیں۔ انسان کے جو بھی حالات ہوتے ہیں وہ اس کے عمل کی تاثیر اور افعال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

چوتھے شعر میں کہا گیا ہے کہ عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنوں (عورت کا عشق) انسان کو گریبان چاک کرنے پر راغب کرتا ہے، لیکن اقبال کہتے ہیں کہ ایک جنوں (عشق رسول ﷺ) ایسا بھی ہے جو گریباں کو چاک کیا کرتا۔ چاک چاک تقدیر کو رفو کرتا ہے۔ یعنی بگڑی ہوئی تقدیر کو بنا سکتا ہے۔ اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے عشق کے سوز و جذبہ کا یہ اثر بھی دیکھا ہے کہ جس سے تقدیر کے چاک رفو ہو گئے۔

پانچویں شعر یہ میں بتایا گیا ہے کہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ لوگ شراب پی کر مست ہوتے ہیں، لیکن یہ رندی کا کمال نہیں ہے۔ اقبال کی نظر میں کمال یہ ہے کہ آدمی بے پیئے مست ہو جائے بلکہ مست رہے اور یہ کمال عشق الٰہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ شراب کا نشہ تھوڑی دیر بعد اتر جاتا ہے، لیکن محبت الٰہی کا نشہ انگوری شراب کا محتاج نہیں ہے اور جب ایک دفعہ آدمی اس عشق الٰہی کے نشے سے مست ہو جاتا ہے تو پھر جیتے جی یہ نشہ نہیں اترتا۔

چھٹے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مشرق کے میخانوں میں اب تک وہ شراب موجود ہے، جس سے عقل روشن ہوسکتی ہے یعنی مذہب، اخلاق اور روحانیت کی تعلیمات جو اگر کسی رہبر کامل سے حاصل کی جائیں تو انسان حقیقی معنوں میں عالم بن سکتا ہے۔ مغربی علوم سے عقل انسانی تاریک

ہوجاتی ہے یعنی انسان اللہ اور اس کے رسولؐ سے بیگانہ ہوجاتا ہے، لیکن قرآن مجید انسانی عقل کو نور ایمان سے منور کرتا ہے۔

اس غزل کے ساتویں اور آخری شعر میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اہل نظر یعنی صاحب شعور، صاحب بصیرت یورپ کے مستقبل سے ناامید ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی رائے میں اس خطے کی بربادی یقینی ہے، کیوں کہ یہ خطہ اب ان اقوام سے معمور ہے جن کے قلوب اللہ کی محبت سے بالکل خالی ہو گئے ہیں بلکہ یہ قومیں مادّہ پرستی میں مبتلا ہو کر اللہ سے اپنا تعلق یکسر منقطع کر چکی ہیں۔ مادیت کے غلبے کی وجہ سے ان کے دل تاریک ہو گئے ہیں۔ انسانیت، اخلاق اور روحانیت کا کوئی گزر نہیں۔

11.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ☆ ضرب کلیم علامہ اقبال کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، جو 1936ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں شامل نظمیں اور غزلیں علامہ اقبال کے پہلے کی شاعری سے بالکل مختلف ہیں۔
- ☆ علامہ اقبال نے ضرب کلیم کے ذریعے دور حاضر کی سامراجی قوتوں پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ کہ انہوں نے اس مجموعے کو ''اعلانِ جنگ، دور حاضر کے خلاف'' کا نام دیا ہے۔
- ☆ ضرب کلیم میں زیادہ تر نظمیں ہیں، جو تمہید کے علاوہ چھ موضوعات یعنی ''اسلام اور مسلمان''، ''تعلیم و تربیت''، ''عورت''، ''ادبیات فنون لطیفہ''، ''سیاست مشرق و مغرب'' اور ''محراب گل افغان کے افکار'' پر مشتمل ہے۔
- ☆ بال جبریل اور ضرب کلیم کی اشاعت میں محض ایک سال کا فرق ہے۔ ان دونوں کے درمیان اقبال کے کسی فارسی کلام کا مجموعہ حائل نہیں ہے۔
- ☆ ضرب کلیم کو علامہ اقبال نے دور حاضر کے خلاف جنگ قرار دیا ہے۔ اقبال کے یہاں ''دور حاضر'' ایک مخصوص اصطلاح ہے۔
- ☆ تہذیب حاضر کی اسی اخلاق سوز آزادی کو علامہ اقبال نے بڑی تفصیل سے ضرب کلیم میں موضوع بنایا ہے اور متعدد نظمیں لکھ کر مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔
- ☆ ضرب کلیم کی اکثر نظمیں بے حد مختصر ہیں۔ زیادہ تر نظمیں دو، تین یا چار بند سے تجاوز نہیں کرتی ہیں۔ اس میں شامل تمام نظمیں ہر قسم کی حشو و زوائد سے بالکل پاک ہیں۔
- ☆ علامہ اقبال اپنا نظام فکر اس سے پہلے پیش کر چکے تھے، لیکن اس مجموعے میں شامل بعض نظمیں اتنی واضح ہیں کہ اقبال کے افکار کے متعلق غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔
- ☆ ضرب کلیم میں موجود کلام اقبال کے زمانہ پختگی کے ہیں۔ خیالات کی پختگی اور فنی لوازمات کے اعتبار سے ضرب کلیم کی اہمیت یقیناً بہت زیادہ ہے۔

11.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مرض کہن	:	پرانی بیماری

فسوں	:	جادو، سحر
نہنگ	:	مگر مچھ
آشنا	:	پہچانا ہوا، جانا پہچانا
نیستاں	:	بانس کا جنگل
اعجمی	:	عجمی، ایرانی، جس کا تعلق عرب سے نہ ہو
عراقی	:	عراق کا رہنے والا
حجازی	:	حجاز کا رہنے والا
بے نیازی	:	بے پروائی، جو ہر چیز سے بے پرواہ ہو
نفس شماری	:	سانسیں گننا، دم شماری، حالت نزع
نفس گدازی	:	سخت مجاہدہ، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا
شریعت	:	قانون الٰہی، وہ قانون جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے مقرر فرمایا
تدرواں	:	چکور، ایک خوش آواز خوش رفتار پرندہ
کارسازی	:	کام بنانا یا سنوارنا
میسر	:	آسان کیا گیا، وہ چیز جو آسانی سے مل جائے
فراغ	:	فرصت، نجات، کسی کام سے فراغت پانا
ایاغ	:	شراب کا پیالہ
افلاک	:	فلک کی جمع، آسمان
رِندی	:	شراب پینے کی عادت
نومید	:	ناامید کا مخفف، ناامیدی، مایوسی

11.6 نمونۂ امتحانی سوالات

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ضرب کلیم علامہ اقبال کے اردو کا کون سا شعری مجموعہ ہے؟

2۔ ضرب کلیم کب شائع ہوا؟

3۔ ضرب کلیم کو اقبال نے کس نام سے یاد کیا ہے؟

4۔ ضرب کلیم کے کسی ایک شارح کا نام بتائیے۔

5۔ ''نفس شماری'' کا کیا مطلب ہے؟

6۔ ضربِ کلیم کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

7۔ ضربِ کلیم کے تیسرے حصے کا عنوان کیا ہے؟

8۔ ضربِ کلیم میں کل کتنی غزلیں شامل ہیں؟

9۔ لفظ ''ایاغ'' کے معنی کیا ہیں؟

10۔ ''اقبال اور غزل'' کا مصنف کون ہے؟

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ شعری مجموعہ ''ضربِ کلیم'' کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ ضربِ کلیم میں شامل نظموں پر تبصرہ کیجیے۔

3۔ ضربِ کلیم میں پیش کیے گئے موضوعات پر نوٹ لکھیے۔

4۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

دریا میں موتی، اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک

5۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

نہ میں اعجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے مَیں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ضربِ کلیم کے حوالے سے علامہ اقبال کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ شاملِ نصاب غزل ''نہ میں اعجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی'' کی تشریح کیجیے۔

3۔ شاملِ نصاب غزل ''دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ'' کی تشریح کیجیے۔

11.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	ضربِ کلیم	علامہ اقبال
2۔	شرح ضربِ کلیم	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
3۔	شرح ضربِ کلیم	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی
4۔	اقبال اور غزل	محمد امین اندرابی
5۔	دانشورِ اقبال	آل احمد سرور

اکائی 12: ارمغانِ حجاز کی شامل نصاب رباعیاں

اکائی کے اجزا

12.0		تمہید
12.1		مقاصد
12.2		اقبال کی رباعی گوئی
12.3		ارمغانِ حجاز کا تعارف
12.4		ارمغانِ حجاز کی شامل نصاب رباعیاں
	12.4.1	فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
	12.4.2	دگرگوں عالمِ شام وسحر کر
	12.4.3	خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
	12.4.4	کہا اقبال نے شیخ حرم سے
	12.4.5	نہ کر ذکر فراق وآشنائی
	12.4.6	ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
12.5		اکتسابی نتائج
12.6		کلیدی الفاظ
12.7		نمونۂ امتحانی سوالات
	12.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	12.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	12.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
12.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ انہوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی بڑی کمال کی لکھیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات بھی لکھیں جو نہایت ہی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں ۔ان رباعیات کو انہوں نے بال جبریل اور ارمغانِ حجاز (اردو) میں شامل کیا ہے۔چناں چہ یہاں اس اکائی میں رباعی کی تعریف کے متعلق جانکاری ملے گی اور ارمغان حجاز (حصہ اردو) سے چند رباعیوں کی تشریح اور تجزیہ پڑھیں گے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ رباعی کے متعلق جانکاری حاصل کر سکیں۔
- ☆ ارمغانِ حجاز کا تعارف کرا سکیں۔
- ☆ اقبال کی چند رباعیات سے ان کے مدعا اور مقاصد کو بیان کر سکیں۔
- ☆ ارمغانِ حجاز کی منتخب رباعیوں کی تشریح و تجزیہ کر سکیں۔

12.2 اقبال کی رباعی گوئی

علامہ اقبال اردو شاعری کے ایک ایسے گوہر آبدار ہیں جن کی چمک سے کئی نسلیں متاثر ہوئیں۔اقبال کی فکر کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات اور ان کے فن میں بھی وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی سخنوری سے اردو شاعری کا مزاج ہی بدل دیا۔اقبال کا کلام انسانی آزادی کا علم بردار اور حریت کا آئینہ دار تصور کیا جاتا ہے۔اقبال نے فن کے حوالے سے نظموں،غزلوں،قطعات،دوبیتاں یا رباعیاں لکھ کر اردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

رباعی عربی زبان کا لفظ ربع سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔اس میں کل چار مصرعے ہوتے ہیں۔رباعی کی جمع رباعیات ہے۔ رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔رباعی کے اوزان مخصوص ہیں،اس میں پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔رباعی کو دوبیتی بھی کہتے ہیں،جس کے معنی دو شعروں والی نظم ہے۔

اقبال کی شہرت نہ صرف برصغیر میں بلکہ بیرونِ ممالک میں بھی ہوئی۔دنیائے ادب میں اقبال کو جو اعزاز حاصل ہوا ہے،وہ شاید ہی کسی اور شاعر یا ادیب کو ملا ہو۔اقبال کی دوبیتیاں اور قطعات جنہیں عرفِ عام میں رباعی کہا جاتا ہے،کافی شہرت پا چکی ہیں۔ڈاکٹر عندلیب کے کہنے کے مطابق اقبال کی دوبیتوں کو قطعہ نہیں بلکہ رباعی ہی کہنا چاہیے۔چوں کہ یہ بحر ہزج مسدس کے وزن میں ہیں۔انہوں نے انکشاف کیا کہ بابا طاہر عریاں کے جتنے مجموعہ ہائے کلام ایران، یورپ اور ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں،ان سرورق پر رباعیات بابا طاہر ہی تحریر کیا ہوا ہے۔اقبال کی دوبیتیاں بھی بحر ہزج مسدس کے وزن میں ہیں اس لیے یہ بھی رباعی کے زمرے میں شامل ہیں۔

فارسی شعرا کی اتباع اور تقلید میں اردو شعرا نے بھی رباعی گوئی میں طبع آزمائی کر کے جولانی دکھائی۔دیکھا جائے تو مشہور اردو رباعی گو شعرا میں میر تقی میر،سودا،میر درد،میر انیس،غالب،ذوق،مومن،حالی،اکبرالہٰ آبادی وغیرہ شامل ہیں۔البتہ جس شاعر نے صحیح معنوں میں اردو رباعی سے کام لیا ہے،وہ علامہ سر محمد اقبال ہی ہیں۔انہوں نے غالب کی طرح اردو اور فارسی میں واقعی کمال کی رباعیاں کہی ہیں۔اگر چہ اقبال کی رباعیات،رباعی کے مروجہ اوزان کی قید میں نہیں ہیں،تاہم انہوں نے انہیں رباعی ہی سے تعبیر کیا ہے۔اقبال کی دوبیتیاں یا رباعی جنہیں خود اقبال

نے رباعی ہی کہا ہے، وہ رباعی کے اوزان میں نہیں آتیں۔اس بات سے لگ بھگ سبھی واقف ہوں گے کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا وزن رباعی کے اوزان میں سے ایک وزن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اقبال کے جس قسم کے اشعار کو عندلیب شادانی نے رباعی کہا ہے وہ رباعی کے مخصوص وزن پر نہیں ہیں۔انہوں نے اپنی دو بیتیاں مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن کے وزن میں تخلیق کی ہیں۔اس لیے رباعی کے اصل وزن اور اقبال کے دو بیتوں میں واضح فرق ہے۔رباعی کا ہر مصرعہ چہار رکنی ہوتا ہے یعنی بحر ہزج مثمن کے وزن میں، جب کہ اقبال کے مصرعے سہ رکنی ہیں۔اس لیے فنی اعتبار سے اقبال کی دو بیتوں کو رباعی نہیں کہا جاسکتا ہے۔اقبال نے اپنے دو بیتوں یا قطعات کو رباعی کے نام سے پیش کیا ہے۔انہیں ان کی اجازت سے رباعی کہا گیا ہے۔لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو رباعی کا مطلب چار مصرعے والی ہے۔اس لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اقبال نے اس وجہ سے ان قطعات کو رباعی کہا ہوگا۔

اقبال نے بال جبریل اور ارمغانِ حجاز میں رباعیوں کو شامل کیا ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر رباعیاں لکھنے کا فن بھی موجود تھا۔اقبال کے کلام کا اگر ابتدا تا انتہا جائزہ لیا جائے تو ان کے فلسفے اور اخلاقی معیار کا سراغ بھی ملتا ہے۔انہوں نے فطرت نگاری کے حوالے سے بھی اپنے کلام کے ذریعے دنیائے ادب کو مالا مال کیا۔ان کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

مری شاخ امل کا ہے ثمر کیا
تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا
کلی گل کی ہے محتاج کشود آج
نسیم صبح فردا پر نظر کیا!

اس کے بعد علامہ اقبال کی ایک اور رباعی کو دیکھیے کہ کس انداز سے انہوں نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

علامہ اقبال نے رباعی کی اس صنف کے ذریعے پوری امت کو اپنے اندر سدھار لانے اور محبت و شفقت کو عام کرنے کی نصیحت ایک الگ اسلوب اور انداز سے کی ہے۔وہ مسلمانوں میں اخوت کو قائم کرنے کے بڑے متمنی تھے۔مثال کے لیے دیکھیے یہ رباعی جس میں انہوں نے مسلمانوں سے فرمایا کہ محبت کا جنون باقی نہیں ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

علامہ اقبال کے بعد اردو رباعی کا چلن بہت کم رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے فروغ کے سلسلے میں جب نئے اردو شعراء نے شاعری میں تجربات کر کے آزاد نظم کا چلن عام کیا تو اس کی بدولت کلاسیکی اصناف سخن کے استعمال میں کمی آ گئی۔ ایک تو ان کا رواج کم ہوا اور دوسرے انہیں فرسودہ از کار رفتہ سمجھا جانے لگا۔

12.3 ارمغانِ حجاز کا تعارف

ارمغان حجاز اقبال کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور دعوت و پیغام کے متنوع اور کثیر الجہات نقوش کی رنگا رنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ارمغان کا مطلب تحفہ ہے اور ارمغان حجاز کے معنی حجاز کا تحفہ ہے۔ یہ مجموعہ 1938 میں اقبال کی وفات کے چند مہینے بعد شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اقبال نے دونوں زبانوں (اردو اور فارسی) میں شاعری کی۔ اس میں اقبال نے ایک جگہ مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے:

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

یہ اقبال کا نامکمل شعری مجموعہ ہے، کیوں کہ علامہ اقبال اس کو حج کا فرض ادا کرنے اور دربارِ رسول اکرمؐ کی حاضری کے بعد ہی مکمل کرنے کی آرزو رکھتے تھے۔ یہ کتاب فراق حجاز کی پُر سوز نغموں سے معمور ہے۔ اقبال زندگی کے آخری ایک دو سالوں میں حج اور زیارت کے لیے حجاز کا سفر کرنے کے لیے بے حد آرزو مند تھے، لیکن صحت کی ناسازی نے انہیں اس سفر سے باز رکھا۔ البتہ خیالی طور پر وہ گویا حجاز میں ہی رہے۔ ارمغانِ حجاز اس خیالی سفر کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس میں زیادہ تر دو بیتی ہی شامل ہیں۔ اس مجموعے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1۔ اللہ کے حضور، 2۔ نبی کریمؐ کی خدمت میں، 3۔ مسلمان قوم سے، 4۔ عالم انسانی سے اور 5۔ اپنے دوستوں سے۔ ارمغان حجاز میں ''حضور رسالت مآبؐ'' والا حصہ اس کی جان سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام چودھری محمد حسین کی زیر نگرانی شائع ہوا اور انہوں نے اس کی ترتیب و تدوین بھی انجام دی۔ اقبال کا ارادہ تھا کہ وہ ارمغان حجاز لکھ کر اسے اپنے ساتھ حجاز مقدس لے جائیں، لیکن رب کی مشیت تھی کہ اقبال کی بیماری نے انہیں مہلت نہ دی اور وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

ارمغانِ حجاز میں دو تہائی سے زائد حصہ فارسی قطعات ہیں جب کہ بقیہ حصہ اردو نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو والے حصے میں ایک مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔ مذکورہ نظم اقبال کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے اور یہ نظم 1936 میں کہی گئی ہے۔ ارمغانِ حجاز اقبال کی شاہکار تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں جوش کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں اقبال نے کشمیر کے اُس وقت کے حالات کا ذکر اشاروں و کنایوں میں بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے۔ اس حصے کی نظمیں بلند، پر جوش، ولولہ خیز اور شاعرانہ ہیں۔ اس کے فارسی حصے میں صرف قطعات اور مختصر نظمیں ہیں۔ فارسی قطعات حضور حق، حضور رسالتؐ، حضور ملت، حضور عالم انسانی اور بیاران طریق کے عنوان سے پانچ حصوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں جو جذبات سامنے آتے ہیں اور جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان سے لگتا ہے کہ جیسے شاعر عالم تصور میں سفرِ حجاز کر رہا ہے اور بارگاہِ الٰہی و دربار رسالت مآبؐ میں اپنی ملت کے لیے دعا گو ہے۔ اقبال حجاز مقدس اور دربارِ رسول رحمتؐ کے دیدار کے بڑے خواہش مند تھے۔ حجاز مقدس کا یہ تصوراتی سفر ارمغانِ حجاز سے ظاہر ہے۔ علامہ اقبال کو شاید معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی روح اب قبض کی جائے گی تو اس وقت ان کی زبان سے

یہ آخری قطعہ نکلا جوان کی زندگی کا ترجمان اور ارمغان حجاز کی زینت ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ترجمہ: اب گزشتہ سرود واپس آئے یا نہ آئے۔حجاز کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلے یا نہ چلے۔اس فقیر (اقبال) کی زندگی تو ختم ہوئی، اب کوئی اور راز آشنا آئے یا نہ آئے۔

12.4 ارمغانِ حجاز کی شامل نصاب رباعیاں

12.4.1 رباعی ''فراغت دے اسے کارِ جہاں سے'' کا متن مع تشریح:

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفَس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ اقبال فلسفی ہونے کے علاوہ شاعر اور مفکر بھی ہیں۔چوں کہ شاعر کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کی عکاسی کرے اور ان کے دل میں جو کیفیت اور جو جذبات ہوتے ہیں، ان کو بیان کرے۔شاعر اور فلسفی جو محسوس کرتا ہے، اسے سامنے لانے میں وہ کوئی خوف محسوس نہیں کرتا بلکہ حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔اس لیے علامہ اقبال بھی ایک ایسے فلسفی شاعر ہیں جنھوں نے وارداتِ قلبی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔

جہاں تک اقبال کی مذکورہ بالا رباعی کا تعلق ہے۔اس میں وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات میں شیطان (ابلیس) کو فراغت دے دی جائے۔ یعنی اسے دنیاوی کاموں سے آزاد کر دیا جائے۔کیوں کہ اس پوری دنیا میں ابلیس کے لیے ہر گھڑی اور ہر لمحہ ایک نئے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔اس لیے اسے مہلت دی جائے، تاکہ وہ اطمینان سے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔اس کا کام ہے ہر لمحہ بنی آدم کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہنا۔اس رباعی میں کہا گیا ہے کہ اے خدا یہ ایک حقیقت ہے کہ ابلیس اب اپنی تمام تر صلاحیتوں سے محروم ہو رہا ہے۔یعنی یہ اب بوڑھا ہو چکا ہے۔اس لیے اب وہ نئی سوچ اور نئے تصورات و تخیلات کے قابل نہیں رہا ہے، یہاں تک کہ اب وہ ہم سے نئے گناہوں کا ارتکاب بھی نہیں کرا سکتا۔ اس لیے شاعر خدا سے ابلیس کی سفارش کر کے کہتا ہے کہ مناسب ہے کہ اسے اس کے کام سے فارغ کر دے۔مطلب یہ کہ اب خیر و شر کے تنازع کا خاتمہ کر دے۔

علامہ اقبال کبھی کبھی شاعرانہ شوخیوں پر بھی اتر آتے ہیں اور اس وقت ان کے اشعار کا مطلب وہی ہوتا ہے جو لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً اس رباعی میں اقبال نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ خدا سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ پرانے گناہوں سے دل میں اکتاہٹ پیدا ہو گئی ہے، کیوں

کہ ان کے ارتکاب میں اب کوئی لذت ہی نہیں رہی۔اس لیے اب اس قصے کا خاتمہ ہی ٹھیک رہے گا۔شیطان مخلوق ہی ہے،اس کے پاس محدود قوتیں ہیں۔اس کا دماغ جتنے گناہوں کے بارے میں سوچ سکتا تھا وہ سارے گناہ اس نے انسانوں سے کروالیے،اس میں اب تازہ یا نئے گناہوں کو ایجاد کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔اسی کے پیش نظر شاعر کہتا ہے کہ اب اسے کار شیطانی سے چھٹی دے دی جائے۔اس میں بیان کی شوخی کے ساتھ یہ طنز بھی ہے کہ انسانوں نے ایسے ایسے جرائم ایجاد کیے کہ ان کے آگے شیطان کا دماغ بھی بے کار ہے۔

12.4.2 رباعی'' دگرگوں عالمِ شام وسحر کر'' کا متن تشریح:

دگرگوں عالم شام وسحر کر
جہانِ خشک وتر زیر وزبر کر
رہے تری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

اس رباعی میں کہا گیا ہے کہ اے خدا تو اس جہاں کی رنگینی اور بوقلمونی اور اس کے رنگ ڈھنگ تہس نہس کر دے۔خشکی،تری،زمین، بیابان،سمندر غرض ہر شئے جہاں اور جس جگہ تیرا ذکر نہیں ہوتا اسے برباد کر۔رہی بات میری اور میرے سجدوں کی تو خشوع وخضوع اور اخلاق سے عاری ان سجدوں کی پرواہ نہ کر۔ان کی بھی پرواہ کیے بغیر اس عالم کو ختم کر۔اس لیے کہ اس دنیا کو جہاں تیری عبادت نہ ہو اور جس عبادت میں اخلاص نہ ہو۔اسے برباد ہی ہو جانا چاہیے۔

اے خدا! جس دنیا میں کافرانہ،غیر اسلامی اور غیر اخلاقی ماحول پروان چڑھ رہا ہو۔وہ ماحول اور وہ دنیا اس لائق ہے کہ اسے تباہ وبرباد کیا جانا چاہیے۔شاعر خدا سے کہتا ہے کہ اس دنیا کو اب ختم کر کے ایک نئی دنیا آباد کر،جو شیطانی اور غیر اسلامی اثرات سے پاک اور منزہ ہو،کیوں کہ موجودہ دنیا میں خشکی اور تری غرض ہر جگہ تجھ سے بیزاری کی وجہ سے فساد رونما ہو چکا ہے۔بنی نوع انسان اب اس مقصد سے کافی دور ہو کر اسے بھول چکا ہے۔اس لیے اس دنیا کو زیروزبر کر کے ایک نئی دنیا کو پھر سے پیدا کر،جس میں صرف تیری حکمرانی اور بادشاہی کا غلبہ اور چرچا ہو اور آدمی اپنی تخلیق کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی بسر کرے۔اے خدا،اس دور میں مسلمان،جس کے پاس تیری امانت یعنی آخری پیغام ہے اور جن کی ذمہ داری لوگوں کو ظلمت سے نکال کر روشنی کی طرف لے آنا تھا،لیکن وہ خود اس تاریکی اور ظلمت میں بھٹک رہے ہیں۔آج کا مسلمان تیری عبادت کرتا،نماز پڑھتا،روزہ رکھتا ضرور نظر آتا ہے،لیکن اس کے سجدے بے ذوق ہیں اور عبادتیں بے روح ہیں،جس کی وجہ سے وہ غیر اللہ اور باطل کے سامنے جھکنے پر مجبور ہے۔

12.4.3 رباعی'' خرد کی تنگ دامانی سے فریاد'' کا متن مع تشریح:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

اس پوری دنیا اور کائنات کے مظاہر کو سمجھنے کے لیے عقل کا استعمال کیا جاتا ہے، لیکن وہ اس کائنات کے حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مطلب وہ حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتی۔ چناں چہ اس دنیا میں ہر طرف اللہ کے جلوے اور اسی کی تجلیات کا نزول ہر وقت اور ہر لمحہ ہو رہا ہے، لیکن ہم ان سے بے خبر رہتے ہیں۔ خرد (عقل) کی نظر اتنی کمزور ہے کہ وہ اللہ کی قدرت اور اس کی تجلیات کا ادراک نہیں کرتی ہے، لیکن غیر اللہ کے جلوے دیکھ کر اس کے وجود کو ایک دم قبول کر لیتی ہے۔ مطلب وہ غیر اللہ پر یقین رکھتی ہے، لیکن اللہ پر اسے یقین نہیں، وہ غیر اللہ پر بھروسہ کرتی ہے، لیکن کار ساز حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہیں۔ آنکھ بصارت تو رکھتی ہے مگر حقائق کا نظارہ کرنے والی بصیرت سے محروم ہے۔ اسی کو اقبال نے ''نگہ کی نامسلمانی'' سے تعبیر کیا ہے اور اس کی شکایت کی ہے۔

اس رباعی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایسی عقل جو ابھی پختہ نہیں ہے بلکہ خام ہے اور جذبۂ عشق کے تابع نہیں ہے۔ ایسی عقل اور خرد سے پناہ مانگنا چاہیے۔ ایسی عقل کو اس وقت تک حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہے جب تک کہ وہ جذبۂ عشق کے تابع نہ ہو، کیوں کہ عشق کی ہی بدولت خدائے لم یزل کی تجلیات اور ذات کا ادراک ممکن ہوسکتا ہے۔

12.4.4 رباعی ''کہا اقبال نے شیخ حرم سے'' کا متن مع تشریح:

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہِ محراب مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدہ میں کھو گیا کون؟

اس رباعی میں شاعر مسجد کے ملا کو طنزیہ انداز میں بیدار کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے شیخ حرم (یعنی مسجد کے ملا) سے سوال کیا کہ اس مسجد کی محراب کے نیچے یہ کون سویا ہوا ہے؟ اور کون محو خواب ہے؟ جب کہ امت تباہ و برباد ہوگئی ہے۔ باغِ اسلام کو آندھیوں اور طوفانوں نے ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ ہر طرف ظلمتیں، آندھیاں زور دکھا رہی ہیں اور طوفانوں نے مسلمانوں کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہے اور مسلمان بے یار و مددگار غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اس لیے اے مولوی (ملا) خواب غفلت سے بیدار ہو جا اور دیکھ کہ ایک وقت تھا جب اس چمن میں بہار ہی بہار نظر آتی تھی، لیکن آج اسی چمن کے پھول سوکھ رہے ہیں، مرجھا رہے ہیں یہاں تک کہ ان کی کوئی دیکھ بھال بھی نہیں کر رہا ہے۔ اس لیے اے ملا اپنی نظر دوڑا اس زمانے کے مسلمانوں پر جن کی ہیبت سے زمین بھی تھرتھراتی نظر آتی تھی۔ آج رسول اللہ ﷺ کی امت کو کوئی سنبھالنے والا ہی نہیں۔ اب نہ وہ رہنما رہے اور نہ ہی وہ چراغ رہے جو اندھیری وادیوں اور ظلمتوں میں روشنی دکھاتے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ فرنگیوں کے لباس میں ملبوس ہو کر انہیں کے گیت گا رہے ہیں۔ اس لیے اب اے ملا (اے شیخ حرم) اس نیند سے بیدار ہو جا، تو کیوں اب تک خواب میں مست ہے۔ اٹھ، بیدار ہو اور اس دین کا محافظ بن کے دکھا۔ کیوں کہ تو ہی اس کا محافظ، رہبر اور امام ہے۔ اب تجھے ہی دوسروں کی روحوں کو تازگی بخشنی ہے اور ایک انقلاب رونما کرنا ہے، لیکن افسوس تو نیند سے بیدار نہیں ہوتا۔ ایک جگہ اقبال دوسرے انداز میں یوں فرماتے ہیں:

میں نے اے میرِ سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھواللہ، کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

رباعی میں آگے کہا گیا جب میں نے ملائے مسجد سے یہ باتیں کہیں تو اس مسجد کی زمین بھی کانپ اٹھی، اس کی دیواروں سے یہ صدائیں بلند ہونے لگیں کہ مسلمان کو اب رہبر اور روشنی کی ضرورت نہیں رہی، کیوں کہ وہ فرنگیوں سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو جدیدیت کے نام پر بیچ ڈالا اور حالت یہ ہے کہ وہ اسلام کی اصل سے کافی دور نکل چکے ہیں۔ مطلب، مسجد کے ملا مذہب کی روح سے بیگانہ اور بے خبر ہو گئے اور مسلمانوں کی قیادت کا جو ہر ان کے اندر باقی نہ رہا جس کے نتیجے میں اب مسلمانوں کی اکثریت مغربی تہذیب وتمدن کی دلدادہ ہوگئی ہے اس لیے مسلمان اب بری طرح سے اس آندھی، طوفان اور اندھا دھند کالی گھٹاؤں میں پھنس چکے ہیں۔ مسلمان خود اپنی صفت رہبری سے ہاتھ دھو بیٹھے اور خود اپنے ہاتھوں سے چراغوں کو بجھا دیا۔

مسجد زبان حال سے کہتی ہے اب مسلمانوں کو محراب ومنبر کا نہیں بلکہ اسکولوں اور کالجوں کا اسلام چاہیے۔ اب ان کی یہی خواہش ہے کہ وہ مغرب کی اندھی تقلید کریں۔ وہ اب اپنے دین کی تلاش میں نہیں ہیں بلکہ دنیا کی طمع اور لالچ میں بھٹک رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب خلافت کے بجائے ملوکیت کی تمنا رکھتے ہیں۔ اب ان جیسے مسلمانوں کو اسلامی نظام معاش نہیں بلکہ مغربی نظام معیشت کی چاہ ہے۔ اب یہ مسلمان محلات میں رہ کر دین کو فرنگیوں کے ایوانوں، عدالتوں اور بازاروں میں بیچ دینے پر راضی ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال یہ درد بھری صدا لگاتے نظر آتے ہیں کہ فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟ یہاں فرنگی بتکدے سے مراد مغربی فکر وفلسفہ اور مغربی طرز حیات اور زندگی کے بارے میں مغرب کے نظریات ہے۔، جنہیں اپنا کر مسلمان دین کے تقاضوں سے بے گانہ ہی نہیں بلکہ برگشتہ بھی ہو رہے ہیں۔

12.4.5 رباعی ''نہ کر ذکر فراق وآشنائی'' کا متن مع تشریح:

نہ کر ذکر فراق وآشنائی
کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نے گُہر کا
دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

فرقت (جدائی) اور وصل کا ذکر کرنے سے گریز کر، کیوں کہ اصل زندگی اپنے آپ کو ظاہر کرنے میں ہے۔ چوں کہ جدائی اور قربت کی مصاف زیست میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اصل میں اقبال روح اور جسم کے تعلق کی بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں آنے سے پہلے ہر آدمی روح کی شکل میں عالم ارواح میں ہوتا ہے۔ جنم لینے کے ساتھ ہی عالم ارواح سے اس روح کو لا کر اسے بچے کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس طرح روح کو اپنی تمام تر صلاحیتیں اور اپنی انا کے اظہار کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور یہ آدمی پھر اپنی خفیہ صلاحیتوں کا اظہار کر پاتا ہے۔ اسی بات کو اقبال نے اس رباعی کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ موتی سمندر سے نکال لیا جائے تو اس سے نہ سمندر کا نقصان ہوگا اور نہ ہی موتی کا۔ سمندر کا نقصان اس لیے نہیں ہوگا کہ موتی کے نکلنے سے سمندر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اسی طرح موتی چاہے سمندر کی تہ میں ہو یا اس سے الگ اس سے موتی (گہر) کا کوئی نقصان نہیں، کیوں کہ موتی ہر حال میں موتی ہی رہتا ہے، لیکن جب وہ سمندر سے جدا ہوتا ہے تو دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ لوگ اسے دیکھتے ہیں اسی طرح انتقال وفراق سے نہ عالمِ ارواح میں کوئی کمی ہوتی ہے اور نہ ہی روح کو کوئی نقصان ہوتا ہے۔ بلکہ اسے فائدہ ہی پہنچتا ہے کہ وہ جب آدمی کے جسم میں آتی ہے تو اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ورنہ یہ عالم ارواح میں ہی رہتی۔ عالم ارواح میں اس کے کمالات پوشیدہ

رہتے۔عالم خاکی میں وہ اپنے جوہر اور کمالات کی نمائش کر سکتی ہے۔

12.4.6 رباعی ''ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟'' کا متن مع تشریح:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

اے مردِ مسلمان! تو کیوں اس سمندر کی مانند ہے جو ساکت اور حرکت وعمل سے عاری ہے۔یعنی جس میں حرکت وعمل کا کوئی اثر ہی نہیں ہے۔مسلمان یا بہ حیثیت مجموعی امت مسلمہ ایسے سمندر کی طرح ہوگئی ہے،جس میں لہروں کا بھی ابھرنا اور موجوں کا طلاطم نہیں ہے نہ اس کی لہروں میں اچھال ہے اور نہ اس میں طوفان ہی نظر آتا ہے۔سمندر اور دریا میں اکثر لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور اس میں طوفان بھی آتے رہتے ہیں۔اقبال مسلمان سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تو اس سمندر کی مانند ہے جس میں نہ موج اٹھتی ہے اور نہ ہی طوفان نظر آتا ہے۔

کیوں کہ اے مسلم! تو غیر اللہ کے خوف سے اپنی خودی کو کفر کی سطح تک لے آیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تیری خودی ابھی تک مسلمان نہیں ہوئی ہے یعنی تیرا اندرون خودی سے خالی ہے۔جب تیری خودی مسلمان ہوگی تو اس میں مضبوطی پیدا ہوگی جس کی وجہ سے تیرے دبدبے کا اثر پوری دنیا پر چھا جائے اور ہر طرف سے تیری مثال قائم ہو جائے گی۔مگر افسوس کہ تیری خودی ابھی تک مسلمان ہی نہیں ہوئی ہے۔اب اسی بنیاد پر تو خدا کی تقدیر یعنی اپنی بدقسمتی کی شکایت کر رہا ہے،لیکن یہ شکایت عبث (فضول) ہے۔اگر تو اپنی خودی کو مسلمان کرے گا تو خدا تیری مرضی کے مطابق تیری تقدیر سنوارے گا اور تیری زندگی میں حرکت وعمل پیدا ہو جائے گا۔

اس لیے اقبال مسلمان سے مخاطب ہوکر اس بات کی یقین دہانی کرواتا ہے کہ تجھے تو خود عمل اور جدوجہد سے خدا کی تقدیر بن کر مقدر ساز بن جانا چاہیے۔اس لیے آدمی جب تک اپنی انا (خودی) کی صلاحیتوں کو پہچان کر ان کو اجاگر نہیں کرتا،تب تک اس کی خودی کافر ہی رہتی ہے۔اس لیے اس کو مسلمان بنانے کے لیے صرف یہ راستہ ہے کہ اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسولؐ کو اختیار کیا جائے تاکہ کفر کے راستے کو ترک کیا جائے۔جب یہ عمل پورا ہو جائے گا،تو اے مسلمان تیرے دریا (زندگی) میں جہد وعمل کی موجیں بھی پیدا ہو جائیں گی۔تب جا کر تو تقدیر کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنی تقدیر سازی خود کر سکے گا۔اس خیال کو اقبالؒ نے ایک اور جگہ اس طرح پیش کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

12.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ علامہ اقبال اردو شاعری کے ایک ایسے گوہر آبدار ہیں جن کی چمک سے کئی نسلیں متاثر ہوئیں۔اقبال کی فکر کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات اور ان کے فن میں بھی وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔

☆ رباعی عربی زبان کا لفظ ربع سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔اس میں کل چار مصرعے ہوتے ہیں۔رباعی کی جمع رباعیات ہے۔ رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔رباعی کے اوزان مخصوص ہیں،اس میں پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔رباعی کو دوبیتی بھی کہتے ہیں،جس کے معنی دو شعروں والی نظم ہے۔

☆ اقبال نے بال جبریل اور ارمغانِ حجاز میں رباعیوں کو شامل کیا ہے۔جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر رباعیاں لکھنے کا فن بھی موجود تھا۔

☆ ارمغان حجاز اقبال کا آخری شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور دعوت و پیغام کے متنوع اور کثیر الجہات نقوش کی رنگارنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ارمغان کا مطلب تحفہ ہے اور ارمغان حجاز کا معنی حجاز کا تحفہ ہے۔یہ مجموعہ 1938 میں اقبال کی وفات کے چند مہینے بعد شائع ہوا۔

☆ ارمغانِ حجاز چودھری محمد حسین کی زیرنگرانی شائع ہوا اور انہوں نے اس کی ترتیب و تدوین بھی انجام دی۔

☆ ارمغانِ حجاز میں دو تہائی سے زائد حصہ فارسی قطعات ہیں جب کہ بقیہ حصہ اردو نظموں پر مشتمل ہے۔اس کے اردو والے حصے میں ایک مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔مذکورہ نظم اقبال کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے اور یہ نظم 1936 میں کہی گئی ہے۔ارمغانِ حجاز اقبال کی شاہکار تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

12.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
فراغت	:	فرصت
کارِ جہاں	:	دنیا کا کام
نفَس	:	لمحہ
پیری	:	بڑھاپا
کہنہ	:	پرانا
دگرگوں	:	اور ہی طرح کا
زیروزبر	:	الٹ پلٹ
خدائی	:	خدا ہونا
حذر	:	بچنا، پرہیز
خرد	:	عقل
تجلی	:	روشن اور آشکار کرنا
نظارۂ غیر	:	غیر اللہ کے نظارے

شیخ حرم	:	مسجد کا امام
تہِ محراب مسجد	:	مسجد کی محراب کے نیچے
ندا	:	پکارا
گُہر	:	موتی
فرنگی	:	انگریز، اہل مغرب
بتکدہ	:	بتوں کا گھر
فراق	:	جدائی
آشنائی	:	واقفیت
خودنمائی	:	اپنے آپ کو ظاہر کرنا
زیاں	:	نقصان
خودی	:	اپنی پہچان
عبث	:	فضول
شکوہ	:	شکایت
تقدیرِ یزداں	:	خدا کی تقدیر

12.7 نمونۂ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کے کس کس مجموعہ کلام میں رباعیات ملتی ہیں؟

2۔ رباعی کے معنی کیا ہیں؟

3۔ رباعی کس زبان کا لفظ ہے؟

4۔ ارمغانِ حجاز کتنے حصوں پر مشتمل ہے؟

5۔ رباعی کے کس مصرعے کو رباعی کی جان کہا جاتا ہے؟

6۔ ''ارمغان حجاز'' کب شائع ہوا؟

7۔ اقبال نے ارمغان حجاز کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

8۔ ''ارمغان حجاز'' کس کی نگرانی میں شائع ہوا؟

9۔ نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کب لکھی گئی؟

10۔ ''اقبال سب کے لیے'' کس کی تصنیف ہے؟

12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال کی رباعی گوئی پر مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ اقبال کے مجموعے کلام ''ارمغان حجاز'' کا تعارف پیش کیجیے۔

3۔ ارمغان حجاز میں شامل رباعیوں کے موضوعات پر نوٹ لکھیے۔

4۔ درج ذیل رباعی کی تشریح کیجیے۔

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہِ محراب مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدہ میں کھو گیا کون؟

5۔ درج ذیل رباعی کی تشریح کیجیے۔

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے

12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ارمغان حجاز کے حوالے سے علامہ اقبال کی رباعی گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ ارمغان حجاز کے حوالے سے اقبال کی رباعی گوئی کی فنی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ اس اکائی میں شامل رباعیوں کی تشریح کیجیے۔

12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ کلیات اقبال (اردو و فارسی) — علامہ محمد اقبال

2۔ نقوشِ اقبال — مولانا ابوالحسن ندوی

3۔ اقبال سب کے لیے — ڈاکٹر فرمان فتح پوری

4۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو — جگن ناتھ آزاد

5۔ فکرِ اقبال — ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

6۔ تاریخ ادب اردو — پروفیسر نورالحسن نقوی

بلاک IV: اقبال کی نثری خدمات

اکائی 13: خطوطِ اقبال کا موضوعاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

13.0		تمہید
13.1		مقاصد
13.2		خطوط اقبال کا تنقیدی مطالعہ
13.3		خطوط اقبال کا موضوعاتی مطالعہ
	13.3.1	تصور خودی خطوط اقبال کے حوالے سے
	13.3.2	اسلامی و عجمی تصوف خطوط کے حوالے سے
	13.3.3	نظریہ انسان کامل خطوط کے حوالے سے
13.4		نمونہ خطوط اقبال برائے مطالعہ
13.5		اکتسابی نتائج
13.6		کلیدی الفاظ
13.7		نمونہ امتحانی سوالات
	13.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	13.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	13..7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
13.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

علامہ اقبال ہماری تاریخ کی وہ عظیم علمی اور فکری شخصیت ہیں جن کے آثار علمی نے ہر لحاظ سے ہماری اجتماعی رہنمائی کی ہے۔ علامہ کی شاعری اور نثر پر مبنی فلسفیانہ افکار کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے تاہم علامہ کے خطوط ہماری تحقیق میں وہ توجہ حاصل نہیں کر سکے جو انہیں دی جانی

چاہیے تھی۔ علامہ کے خطوط جوانہوں نے اپنے زمانے کے مشاہیر کو لکھے جن میں اکبرالہ آبادی اور سید سلیمان ندوی جیسی قد آور شخصیات شامل ہیں نہ صرف ہمیں علامہ اقبال کے فکری اور علمی رجحانات سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس دور کے مسائل اور ان مسائل کے حل کے لیے علامہ اقبال کی مساعی کو بھی ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ جب بھی کسی شخصیت کے خطوط کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان خطوط کے مطالعے سے اس شخصیت کے فکر و احساس اور رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ خطوط ایک لحاظ سے نجی معاملہ ہے لہٰذا ان میں انسان کی طبیعت کے وہ پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جو عام طور پر دوسری تحریروں میں نظر نہیں آتے۔ خطوط باہمی روابط کی نوعیت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ لب ولہجہ اور مضمون کے تنوع کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ علامہ اقبال جب جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح کو خط لکھتے ہیں تو ان میں عصری سیاسی امور اور مسائل کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے معاملات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں، لیکن جب سید سلیمان ندوی کو خط لکھتے ہیں تو دینی افکار اور فقہی مسائل موضوع بحث بنتے ہیں۔ اسی طرح علامہ اقبال نے جو خطوط مولانا غلام قادر گرامی کو لکھے ان میں دوستی کی بے تکلفانہ فضا اور شعر وسخن کے مسائل ملتے ہیں۔ سید نذیر نیازی کو لکھے گئے خطوط میں علامہ اقبال کی بیماری اور حکیم نابینا کے ساتھ علاج معالجہ کے معاملات کی تفصیلات نظر آتی ہیں۔ خاں نیاز الدین خاں کو لکھے گئے خطوط میں دوستانہ مراسم کے علاوہ کبوتروں کا تذکرہ اور اس طرح کے دیگر شخصی، دینی اور روحانی معاملات کی تفصیلات ملتی ہیں۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ اقبال کے فکری اور علمی رجحانات کو بیان کر سکیں۔
- ☆ عہدِ اقبال کے مسائل پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ بیسویں صدی کے مختلف نظریات جیسے اشتراکیت، جمہوریت، وطنیت سے متعلق اقبال کے ردعمل کو سمجھ سکیں۔
- ☆ اقبال کے پیش کردہ مختلف تصورات جیسے خودی، بے خودی، تصور مرد مومن، نظریہ اجتہاد اور دیگر نظریات کو سمجھ سکیں۔
- ☆ اقبال کے معاصرین شعرا اور ادبا سے اقبال کے تعلقات کی نوعیت اور مختلف امور پر بحث کر سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے منتخب خطوط کا مطالعہ کر سکیں۔

13.2 خطوط اقبال کا تنقیدی مطالعہ

شعری کلام سے قطع نظر اقبال نے نثر میں باقاعدہ کتابیں بھی لکھی ہیں، مضامین و مقالات بھی تحریر کیے ہیں اور ان کے علاوہ مکاتیب کا بھی ایک خاصا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ یہ تمام نثری تحریریں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے سلسلے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری سے اُن کے افکار و خیالات اور نظریات و تصورات کے علاوہ ان کی شخصیت کا جو خاکہ ہمارے ذہنوں پر مرتب ہوتا ہے اس میں اُن کی نثری تحریروں کے مطالعے سے رنگ بھرے جا سکتے ہیں کیوں کہ ایک طرف تو اُن کے افکار و نظریات کی تفصیل اور جزئیات ہمیں ان کی نثر ہی میں ملتی ہیں اور دوسری طرف اُن کے کردار اور شخصیت کے بہت سے پہلو بھی اُن کی نثری تحریروں سے روشن ہو جاتے ہیں۔ نثر میں تحلیل و تجزیہ کی چوں کہ زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لیے اقبال کا مفکرانہ انداز اور تجزیاتی مزاج ان کی نثر ہی میں اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ نثری تحریروں میں موضوعات کا جو تنوع، فکر کی جو گہرائی اور اظہار کی جو جمال آفرینی ہے اس کے پیش نظر اقبال کی نثری تحریروں میں مکاتیب اپنی کیفیت کے اعتبار سے نہ سہی لیکن کمیت کے

اعتبار سے یقیناً جزو غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس لیے جولوگ اقبال کوصرف شاعری کے آئینے میں دیکھتے ہیں خود اقبال اور مطالعہ اقبال کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔اُن کے مکاتیب کی تعداد جواب تک شائع ہوگئے ہیں تیرہ سو سے تجاوز کرتی ہے۔اقبال کثیر الاحباب تھے اور اس کے علاوہ بہت سے لوگ جنہیں اقبال سے شرف ملاقات حاصل نہیں تھا وہ بھی اکثر انہیں خطوط لکھتے تھے اور اقبال کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر خط کا جواب دیتے تھے اور اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ ہر خط کا جواب مختصر ہی کیوں نہ ہو فوراً دیا جائے۔اس طرح کا اہتمام غالب بھی کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ مشرقی اقدار کے حامل جولوگ ہیں وہ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ خط کے جواب میں تاخیر نہ ہو۔

افکار ونظریات سے قطع نظر یہ خطوط اقبال کی شخصیت اور ان کے حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور اس وجہ سے یہ ان کے سوانح نگار کے لیے بھی بے حد اہم ہیں، ان کی شخصی زندگی کے علاوہ یہ مکاتیب اُن کے مختلف رجحانات اور نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں کے آئینہ دار بھی ہیں لیکن اس بات کی یہاں وضاحت کر دینی ضروری ہے کہ حیاتِ اقبال سے متعلق وہ مسائل جو تحقیق طلب ہیں اُن کے بارے میں یہ خطوط ہماری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔اقبال کا خاندان، مکتب میں ان کی تعلیم کی مدت، اُن کے آباواجداد کی کشمیر سے ہجرت، پہلے بیٹے آفتاب اقبال سے قطع تعلق کی وجہ، اکبر حیدری سے تعلقات میں کشیدگی کا سبب، عطیہ فیضی سے تعلقات کی نوعیت، جواہر لال نہرو سے ملاقات کے متعلق تضادات، حیدر آباد اور پنجاب میں ہائی کورٹ کی ججی نہ ملنے کے اسباب یہ اور اس طرح کے اور مسائل ہیں جو اقبال کے سوانح نگار کو پریشان کر دیتے ہیں اور جن کے بارے میں خطوط اقبال کو سامنے رکھ کر قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں لیکن قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اقبال کی زندگی کے اہم واقعات اور حالات کسی نہ کسی صورت میں خطوط سے مستنبط کیے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ اُن کی شخصیت کے وہ خط وخال بھی ان خطوط سے نمایاں کیے جاسکتے ہیں، جو ان کی شاعری اور اُن کی دیگر تحریروں کے مطالعہ کے باوجود بھی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ان کی شاعری کے ذریعہ ہم مردِ مومن کی قد وقامت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔صیرفی کائنات کا تصور کر سکتے ہیں، بت کدہ صفات کے اصنام کو دیکھ سکتے ہیں، نوائے شوق اور حریم ذات کے شور وشر کو سن سکتے ہیں لیکن تخلیقی عمل کے خاردار راستوں سے گذرتے ہوئے فن کار اور جدت طرز اقبال کو کن بلندیوں اور پستیوں سے گزرنا پڑا، اس کے سمجھنے کے لیے ان کے خطوط ہی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔خطوط میں اکثر اوقات ایسے معاملات کا بے تکلف اظہار مل جاتا ہے جو نہ نثری مضامین میں آسکتے ہیں اور نہ شعری پیکر میں جگہ پاسکتے ہیں۔اس لیے کہ مکتوب نگار کا روئے سخن فرد واحد کی طرف ہوتا ہے، جہاں اظہارِ خیال پر عملاً کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی اور اس طرح سے مکتوب نگار اپنی شخصیت کے بیشتر پردے خود ہی اتار پھینکتا ہے اور شعوری اور غیر شعوری طور پر ان شکوک وشبہات اور عقاید اور رویوں کا برملا اظہار کرتا ہے جو شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔مکاتیب اقبال کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں ہے۔انگریزی میں خط وکتابت کرنے والے احباب کی تعداد بہت قلیل تھی۔جواب لکھتے ہوئے اگر انتخاب زبان کا مسئلہ محض اقبال پر منحصر ہوتا تو شاید وہ خطوں کے جواب ہمیشہ انگریزی میں لکھتے کیوں کہ وہ اپنے بقول اردو میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے تھے۔شاید اسی سبب انہوں نے ایسے خطوط جن میں واردات قلبی یا کسی جذبے کا اظہار مقصود تھا انگریزی میں لکھے ہیں۔مکاتیب بنام عطیہ فیضی اور نذیر نیازی کے نام ایک خط اس کی عمدہ مثال ہیں مگر اقبال کے مکتوب الیہم کی اکثریت نے انہیں اردو میں خطوط لکھے۔اگر اقبال کے عقیدت مندوں اور محبوں کے خطوط اردو میں نہ ہوتے تو شاید مکاتیب اقبال کا اتنا بڑا ذخیرہ اردو زبان میں وجود میں نہ آتا۔تاہم اقبال نے اردو میں اپنے عجز بیان کا جو ذکر کیا ہے وہ ان کی کسر نفسی کا ایک رخ ہے۔ان کے سینکڑوں اردو خطوط اس بات کا ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ نہ صرف اظہار مطالب پر پوری طرح قادر

تھے بلکہ اُن کی قدرتِ زبان نے خطوط کو اسلوبِ بیان کی بوقلمونی صفات کا حامل بنا دیا ہے۔ مکاتیب اقبال میں نثر کا رنگ و آہنگ مکتوب الیہ کی شخصی حیثیت کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایسے خطوط جن میں نظری مسائل اور علمی وفکری موضوعات پر بحث ہے سنجیدہ استدلال سے مزین ہیں۔ ان خطوں میں نثر کا اسلوب نسبتاً ٹھوس اور جاندار ہے۔ لکھنے والا بڑے یقین سے اپنی بات کہتا نظر آتا ہے ایسے خطوط کے حصے حقائق و معارفِ عالیہ کے آئینہ دار ہونے کے باوجود خشکی اور بے کیفی سے خالی ہیں۔ ان میں ایک طرح کے جذب وانجذاب کی کیفیت پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے ایسی تحریروں میں متاثر کرنے کی صفت نمایاں ہے۔

بلا شبہ اقبال نے کہیں کہیں قواعد کے اصولوں کا سختی سے خیال نہیں رکھا۔ کبھی اُن سے بعض الفاظ یا حروف چھوٹ جاتے ہیں مگر یہ غلطیاں ایسی معمولی اور اتنی کم ہیں کہ انہیں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ایسی غلطیاں اقبال کے عجز بیان کا نتیجہ نہیں بلکہ تحریر کی برجستگی، عجلت اور خط پر نظر ثانی نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔

جناب محمد عبداللہ قریشی مکاتیب کے اسلوب نگارش پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال کی دیگر تحریروں کی طرح اُن کی عبارت میں رعب اور دبدبہ ہے اور وزن بھی، فکر کی جولانی بھی ہے اور خیال کی برجستگی بھی۔ بعض جگہ تو شاعری نثر سے ہم آغوش نظر آتی ہے۔ قریشی صاحب کی رائے کے ثبوت میں ذیل میں بیانیہ نثر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ اقبال نے اپنے طور پر مافی الضمیر ادا نہ کر سکنے کا جو مفروضہ قائم کیا ہے یہ عبارت اس کی مکمل طور پر تردید ہی نہیں کرتی بلکہ اقبال کے شاندار بیانیہ اسلوب کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔

> یہ کنال (نہر سویز) جسے ایک فلسطینی انجینیر نے تعمیر کیا تھا دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی اختراع نے زمانہ حال کی تجارت پر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی۔
>
> (اقبال نامہ حصہ دوم 262)

مکاتیب میں سادگی اور سلاست اقبال کے اسلوبِ تحریر کا خاص وصف ہے۔ اسی وجہ سے وہ فقروں کی بناوٹ میں طوالت سے پرہیز کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ان کی اختصار پسند طبعیت سے فطری مناسبت رکھتے ہیں۔ اس سے بیان کی سادگی قائم رہتی ہے اور اثر آفرینی بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ''اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں، صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے، ہاں یہ آرزو ہے کہ کوئی قابل نوجوان ذوق خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے جس کے دل میں اضطراب منتقل کر دوں۔''

(اقبال نامہ حصہ دوم ص 49)

عرض مکتوب کی نوعیت خواہ کچھ ہو، سادہ بیانی نثر اقبال کا بنیادی وصف ہیں۔ اُن کے خطوط ہر طرح کے اغلاق، پیچیدگی اور الجھاؤ سے پاک ہیں۔ یوں اسلوب کے سلسلے میں مکاتیب اقبال کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ بوقلموں تحریروں کے باوجود اقبال کی سادہ بیانی باہتمام قائم ہے۔

13.3 خطوط اقبال کا موضوعاتی مطالعہ

مکاتیب اقبال تصانیف اقبال کے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ اقبال کے مدّاح اور ان کی شاعری کے دلدادگان بار بار مجموعہ ہائے کلام

کے بارے میں استفسار کرتے یا کسی نظم یا شعر کی وضاحت چاہتے تو ایسے استفسارات کے جواب میں اقبال نے مختلف اوقات میں اپنے بعض اشعار و منظومات کی شانِ نزول اُن کے سیاق وسباق کے ساتھ کی ہے۔شعری مجموعوں کے تکمیلی مراحل، ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت حتیٰ کہ جلد بندی تک کے بارے میں تفصیلی معلومات خطوط میں جابجا بکھری ہوئی ہیں جن کی بنیاد پر تصانیف اقبال کی مفصل تاریخ مع اس کے پس منظر کے مرتب کی جاسکتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے خطوط حیات اقبال کے بارے میں ایسی جامع اور مفصل رپورٹ مہیا کرتے ہیں جو مکاتیب کے سوا کہیں بھی ریکارڑ میں موجود نہیں۔اُن کے خطوط میں اُن کے شب وروز کے معاملات، مصروفیات ومشاغل، پسند وناپسند، ماضی کے تذکرے، حال کی کیفیات اور مستقبل کے منصوبوں کی مکمل و جامع تفصیلات ملتی ہیں ۔ ہم اُن کے ذریعے نہ صرف اقبال بلکہ اُن کے بزرگوں اعزہ و اقربا، دوستوں، عزیزوں اور اولاد سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔اقبال کے خطوط اُن کے یورپ، فلسطین، جنوبی ہند، افغانستان، دہلی، شملہ اور بلوچستان کے سفروں اور دوروں کی روداد بھی پیش کرتے ہیں۔حتیٰ کہ خطوط سے اقبال کے سفروں کی تاریخیں اور اوقات تک متعین کیے جاسکتے ہیں۔ مختلف اوقات میں اقبال کے جسمانی عوارض خصوصاً آخری علالت کی ابتدا اس میں اضافے، اس کی بدلتی ہوئی کیفیتوں، علاج اور دواؤں اور اُن کے اثرات کی تفصیل خطوں میں بیان ہوئی ہے۔صحت، بیماری اور علاج اور معالجے کی تفصیلات زیادہ تر سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر پروفیسر مظفرالدین کے نام خطوط میں بیان ہوئی ہیں۔

مکاتیب اقبال میں مختلف علمی، تاریخی معاشی اور فلسفیانہ مسائل زیر بحث آئے ہیں۔اقبال نے اپنے مکتوب الیہم کے ساتھ قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دین وشریعت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا ہے اور مختلف تحریکوں ان کے اصولوں اور نظریات پر نقد وتبصرہ اور اپنے ردِعمل کا اظہار کیا ہے۔ان ساری بحثوں میں اقبال کا اندازِ استدلال خالص علمی، منطقی اور ٹھوس ہے۔کئی خطوں میں انہوں نے اپنے بعض نظریات و تصورات کی وضاحت کی ہے مثلاً نظریہ خودی، تصور شاہین، تصوف واجتہاد وغیرہ۔اس طرح اس قول کی روشنی میں کہ شاعر کے لٹریری اور پرائیوٹ خطوط اس کے کلام پر روشنی ڈالتے ہیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خطوط شعر اقبال کی تشریح وتفسیر بن گئے ہیں۔اپنے بیشتر خطوط میں اقبال نے ان مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔جن سے انہیں ساری عمر شغف رہا ہے جن پر اُن کی شاعری اور نثر دونوں کی اساس قائم ہے اور جنہیں فکر اقبال میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔فلسفہ خودی، نظریہ زمان ومکان تصوف، فقہ اسلامی، یہ وہ موضوع ہیں جن کی اہمیت مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں مسلم ہے۔آگے ذیلی عنوانات کے تحت انہی موضوعات اور مسائل کے بارے اقبال کے نقطۂ نظر کو اُن کے مکاتیب کی روشنی میں ابھارنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

13.3.1 تصور خودی خطوط اقبال کے حوالے سے:

اقبال کا پیغام یا فلسفہ حیات کیا ہے؟ اگر ہم چاہیں تو اس کے جواب میں صرف ایک لفظ خودی کہہ سکتے ہیں اس لیے کی یہی ان کی فکر ونظر کے جملہ مباحث کا محور ہے اور انہوں نے اپنے پیغام یا فلسفہ حیات کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔اس محور تک اقبال کی رسائی ذات وکائنات کے بارے میں بعض سوالوں کے جوابات کی تلاش میں ہوئی ہے۔انسان کیا ہے؟ کائنات اور اس کی اصل کیا ہے؟ آیا یہ فی الواقع کوئی وجود رکھتی ہے یا محض فریب نظر ہے؟ اگر فریب نظر ہے تو اس کے پس پردہ کیا ہے؟ اس طرح اور جانے کتنے سوالات ہیں جن کے جوابات کی جستجو میں انسان شروع سے سرگرداں رہا ہے۔اور دیکھا جائے تو یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف نظام ہائے فکر کو جنم دیا، اُن کی آبیاری کی اور انہیں

ترویج دی۔ چناچہ ان سوالات پر غور کرتے ہوئے یونانی مفکرین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کائنات اور انسانی وجود محض ایک دھوکا ہے اور یہ کہ بہترین زندگی عمل اور مقاصد آفرینی کی زندگی نہیں بلکہ عقل کا تماشائی ہونا ہے۔ خُدا جو تمام موجودات کا ماخذ اور نصب العین ہے وہ بھی غیر متحرک اور غیر فاعل ہے۔ دنیا کی زندگی سایہ ہے۔ (بحوالہ فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ص283)

مغرب میں سب سے پہلے جس شخص نے اس افلاطونی نظریے کو رد کیا وہ ڈیکارٹ تھا جس کا یہ قول بڑا ہی معنی خیز ہے ''دنیا کے متعلق تو خیر سوچا جا سکتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے لیکن مجھے اپنے وجود پہ شبہ نہیں ہوسکتا'' اقبال نے بھی اس نقطہ نظر کو اپنایا اور نہ صرف اس نقطہ نظر پر اپنے جملہ افکار کی عمارت کھڑی کی بلکہ اس کے انتھک مفسر بھی بن گئے۔ مدت دراز تک مشرق و مغرب کے حکما اور فلاسفہ کی تحریروں میں انہی خیالات کی بازگشت سنائی دی۔ نفی ذات کا یہ فلسفہ کمزور قوموں کو مایوسی اور شکست خوردگی کے کرب سے نجات دلاتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس فلسفے کو حرز جان بنا لیا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے سیاسی اور معاشی اِدبار کے زمانے میں ہی اس فلسفہ کو اپنا لیا اور نتیجے میں عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر اور سعی و عمل سے منہ موڑ کر ایسی خانقاہی زندگی کو اپنا شعار بنا لیا جو غلامی و محکومی کو نہ صرف گوارا بنا لیتی تھی بلکہ اسے اپنا وسیلۂ نجات تصور کرتی تھی۔

13.3.2 اسلامی و عجمی تصوف خطوط کے حوالے سے:

اقبال کا تصوف کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ یہ ناقدین اقبال کے یہاں ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے اس سلسلے میں افراط و تفریط سے کام لیتے ہوئے ناقدین نے عجیب و غریب رائے دی ہے۔ اس بحث کی ابتدا اقبال کی زندگی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ اسرار خودی میں اقبال نے حافظ پر جو تنقید کی اس سے ایوان تصوف میں زلزلہ برپا ہو گیا۔ اسرار خودی کے حوالے سے اقبال کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اقبال اور تصوف کے رشتے کو سمجھنے کے لیے اقبال کے خطوط اہم ماخذ ہیں۔ تصوف کے بارے میں ایک خط میں اقبال صریح الفاظ میں لکھتے ہیں:

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف وجودی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ (اقبال نامہ ص38)

ایک اور جگہ اقبال ایک خط میں فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک یہ تعلیم قضا غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تصوف کی عمارت اسی ایرانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی۔''

(مطالعات و مکاتیب اقبال ص229)

اقبال کہتے ہیں:

تمدن، تصوف، شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

یہاں تصوف کا ذکر شریعت اور کلام کے ساتھ لیا گیا ہے۔ ان میں کم از کم شریعت تو عجم سے برآمد شدہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کو تصوف کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ جس طرح شریعت میں عجمی اثرات کی وجہ سے فقہی موشگافیوں نے اصل روح شریعت کو فنا کر دیا اسی طرح تصوف عجمی اثرات کی وجہ سے اپنے اصل مقصد سے دور چلی گئی ہے۔ اور یہی تصوف ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:

ہے وہی شعر وتصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپادے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اقبال کی مذکورہ بالا آرا کا جائزہ لینے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ اقبال کو تصوف پر جو اعتراض ہے وہ یہ کہ اس کی اصل عجم سے ہے۔ یہ اسلام میں باہر سے درآمد کی گئی ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اس حقیقت کو تسلیم بھی کرلیں تو کیا صرف اس وجہ سے اقبال تصوف کے پورے سرمائے کو قلم زد کرنا چاہتے تھے کہ تصوف کی اصل عجمی ہے؟ نہیں بلکہ اقبال کو تصوف سے اور بھی شکایتیں ہیں۔

اقبال حرکت وعمل کے پیغامبر ہیں۔ اُن کا فلسفہ انسان کو جہد مسلسل کی تعلیم دیتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر اس فلسفہ اور تحریک کو قابل مذمت سمجھتے ہیں جو اُن کی نظر میں اس راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اقبال ایک طرف صوفی کی قنوطیت پسندی اور بے عملی کی پرزور مذمت کرتے ہیں تو دوسری طرف ملا کی تقدیر پرستی کو بھی لائق ملامت سمجھتے ہیں۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی کا دور اقبال کے یہاں وجودی تصوف کی شدید مخالفت کا دور ہے۔ اسرار خودی 1915ء میں اور رموز بے خودی 1917ء میں شائع ہوئی۔ ان دونوں تصانیف میں اقبال نے چند صوفیانہ نظریات سے اختلاف کیا ہے۔ مثنوی کے دیباچے میں مسلۂ وحدت الوجود کی نفی کرتے ہوئے شیخ محی الدین عربی اور مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازی پر سخت تنقید کی ہے۔ مثنوی کا شائع ہونا تھا کہ ملک میں اقبال کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ خواجہ حافظ شیرازی کو ایران میں بلکہ سارے ہندوستان میں نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے اہمیت حاصل تھی بلکہ لوگ انہیں عارف بھی سمجھتے تھے۔ چناں چہ بہت سے لوگوں نے اور خاص طور پر ان لوگوں نے جنہیں تصوف سے شغف تھا اقبال کی مخالفت کا سلسلہ شروع کیا جن میں خواجہ حسن نظامی اور مظفر احمد (مصنف مثنوی راز بے خودی) پیش پیش تھے۔ اکبر الہ آبادی بھی متاثر ہوئے چناچہ اس زمانے میں عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے خطوط میں اکبر الہ آبادی نے اقبال کے خیالات پر شدید الفاظ میں تنقید کی:

حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوف کے پیچھے پڑے ہیں' (ستمبر 1981)

دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں:

'اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیرازی کو علانیہ برا کہا' میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ اُن کی مثنوی 'اسرار خودی' آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب رموز بے خودی شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی، دل نہیں چاہا۔'' (11 جون 1981)

یہ بات قابل غور ہے کہ جب اقبال اسلامی معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ غیر اسلامی تصوف ہے۔ اقبال نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لڑکپن میں تصوف کی مشہور تصانیف فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کے مضامین اُن کے کانوں میں پڑنے شروع ہوئے تھے اور یہ کہ ان کے والد کو اس سے کمال توقل رہا تھا لیکن اقبال تصوف کے اسی وقت مخالف بن جاتے ہیں جب تصوف میں فلسفیانہ موشگافیاں کی جاتی ہیں۔ تصوف کو وہ عمل کے اخلاص کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور بس، مولانا اسلم جیراجپوری کو لکھتے ہیں:

''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس امر پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔۔ اور نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے

خلاف بغاوت کرتی ہے۔'' (اقبال نامہ جلداول ص52)

اس ردعمل سے ایک بات واضح ہے کہ اقبال تصوف کی اخلاقی قدروں کے قائل تھے۔جیسا کہ مذکورہ بالا خط کی عبارت سے اس کا برملا اظہار ہوتا ہے اس قسم کے تصوف کی وہ آخری عمر تک قدر کرتے رہے۔وحدت الوجودی نظریے کے برخلاف اقبال نظریہ وحدت الشہود سے وابستہ تھے اور آخر دم تک وہ اسی مسلک پر قائم رہے۔اقبال اپنے آپ کو رومی کا مرید ہندی کہا کرتے تھے اس وجہ سے بھی اقبال سے یہ بعید ہے کہ وہ تصوف کی ہر اچھی بری قدر کو ایک ہی نظر سے دیکھیں۔

13.3.3 نظریہ انسان کامل خطوط کے حوالے سے:

علامہ اقبال نے جس زمانے میں آنکھ کھولی اس وقت مشرق ومغرب میں زندگی کے مختلف شعبوں میں عجیب وغریب انقلاب ظہور پذیر ہورہا تھا۔مشرق کی جہانگیری و جہانبانی ختم ہوچکی تھی اور ہر طرف زوال اور پستی کا دور دورہ تھا۔ہندوستان کی فضا سوراج کے نغموں سے معمور تھی۔ان حالات میں اقبال نے وطنیت کے جذبے کو اجاگر کرنے کے لیے خوبصورت نظمیں لکھیں جن میں اہل مشرق کو مغرب کی تقلید سے باز رکھنے اور ان میں وطن اور قوم سے محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی بات کی گئی۔مزید برآں اقبال نے مرد مومن کا آفاقی تصور پیش کیا۔کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انقلاب ہمیشہ مرد مومن کا مرہون منت ہوتا ہے۔

مرد مومن کا تصور جہاں اقبال کے شعری کلام میں جابجا بکھرا پڑا ہے وہیں اقبال کے خطوط میں بھی اس تصور کی کئی تشریحات ملتی ہیں۔یوں تو نطشے، برگساں اور ارسطو نے بھی اس سے ملتے جلتے نظریات پیش کیے ہیں خصوصاً نطشے نے جو مرد کامل کا نظریہ پیش کیا وہ اقبال کے نظریہ سے کافی حد تک مماثلت بھی رکھتا ہے۔لیکن اقبال کا مرد مومن نطشے کے فوق البشر کی مانند نہیں جو محض قوت قہر و جبر کا پیکر اور اخلاق وقانون سے ماورا ہے۔اقبال کا مرد مومن تو جلال و جمال کا مجموعہ ہے،اس پر قرآن کی گہری چھاپ نظر آتی ہے،اقبال کا مرد مومن پیکر صبر ورضا ہے،حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہے۔اس ضمن میں سقراط کا قول ملاحظہ ہو۔گویا عرفان ذات ارتقا کا ذریعہ ہے۔چناں چہ ایک انسان کو جب تک اپنی خودی کا ادراک نہ ہو وہ مرد مومن کے اعلی درجے پر فائز نہیں ہوسکتا۔خودی اور فوق البشر کے آپسی ربط کے متعلق اقبال کے اپنے الفاظ دیکھیے:

> ''خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہوجائے تو مسلمان ہوجاتی ہے۔مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا جب کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون الٰہی کی پابند نہیں جب کہ دوسری صورت میں قانون الٰہی کی پابند ہے''۔

اقبال کا خیال تھا کہ انسان کامل کا پیدا ہونا ہر دور میں لازمی ہے۔پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

> 'انسان کامل کے بغیر دنیا میں امن وامان قائم نہیں ہوسکتا۔لیگیں، پنچایتیں اس مقصد کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔آئے دن اس قسم کی لیگیں اور پنچایتیں برابر ناکام ثابت ہورہی ہیں۔''

(اقبال نامہ جلداول ص487)

جیسا کہ پہلے بھی اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا ہے کہ اقبال کا انسان کامل نطشے کے فوق البشر کا چربہ ہے،اس اعتراض

کا جواب اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں دیا ہے۔اس خط کی متعلقہ عبارت کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

''وہ (مسٹر ڈکنسن جنہوں نے یہ اعتراض کیا تھا) انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے ''فوق البشر'' کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔میں نے آج سے تقریباً بیس برس قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقاید کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔''

(مکتوب بنام پروفیسر نکلسن، مشمولہ مضامین اقبال، ص46)

اس ضمن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رائے پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔خلیفہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک افکار کا تعلق ہے۔اس نے (اقبال نے) نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ نیٹشے کا، نہ برگساں کا اور نہ کارل مارکس یا لینن کا۔اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے اس نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لیے ہیں لیکن اس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشہ کی ہو بہو نقل نہیں ہے۔اپنی تعمیر کے لیے اس نے ان افکار کو سنگ وخشت کی طرح استعمال کیا ہے۔''

(اردو اقبال نمبر 1938، ص831)

13.4 نمونہ خطوط اقبال برائے مطالعہ

سید سلیمان ندوی کے نام:

لاہور

10/نومبر، 1919ء

مخدومی...السلام علیکم! کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں۔یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں۔کیا یہ مسلمان کے لیے حلال ہے؟

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔بہت دلچسپ کتاب ہے، مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ ''اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال کی آوازِ بازگشت ہیں۔'' شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر 1907ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم ونثر انگریزی واردو میں موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ان کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے، ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔

میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ

اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا تھا اور سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچائیے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام!

آپ کا خادم

محمد اقبال، لاہور

مولانا گرامی کے نام:

لاہور

25/دسمبر، 1921

ڈیر مولانا گرامی السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

ولا نامہ ابھی ملا۔ غزل مرسل خدمت ہے۔ میں وہ غزل بشیر کو اسی خیال سے نہ دی تھی، لیکن میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ گرامی صاحب نے تمہارے لیے غزل ارسال کی ہے۔ مہربانی کر کے بعد از نظر ثانی جلد بھیج دیجیے۔ منیر کی قولی غزل اس زمین میں مشہور ہے، جسے قوال عام طور پر گاتے ہیں۔ میں نے نہ چاہا کہ شائع ہونے کے بعد اس پر کوئی اعتراض کر دے، اس واسطے بعض باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اگر آپ کو مجھ سے اتفاق نہ ہو تو اسی طرح رہنے دیجیے کیوں کہ آپ کا مذاق زیادہ معتبر ہے۔

مقطع کی نسبت تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ بارگاہ نبوی میں مقبول ہوا مفصل کیفیت اس بات کی کل آپ کی خدمت میں لکھنے کو تھا کہ کسی قوت نے روک دیا۔ دل کہنے لگا کہ خط میں اس امر کا انکشاف نامناسب ہے۔ یہ حقیقت نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب ہے، انشا اللہ بالمشافہ عرض کروں گا۔ بھلا یہ شعر کیسا ہے۔ (نظیری اور حافظ کی غزلیں اس زمین میں مشہور ہیں۔ شاید آپ کی غزل بھی ہے۔)

نہال ترک زبرق فرنگ بار آورد
ظہور مصطفوی را بہانہ بو لہبی است

مخلص

محمد اقبال

مہاراجہ کشن پرشاد کے نام:

لاہور

26/اکتوبر، 1922

سرکار والا تبار تسلیمات!

نوازش نامہ مل گیا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اخبارات میں تو (خالصہ، ایڈوکیٹ و پیسہ اخبار وغیرہ) وہی دیکھا گیا جو میں نے

عرض کیا تھا۔مگر پرسوں محمد شفیع صاحب سے معلوم ہوا کہ ابھی آخری فیصلہ نہیں ہوا۔

سر محمد شفیع علی گڑھ گئے تھے وہاں مسٹر حیدری بھی موجود تھے۔ یہ روایت کی کہ ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ مسٹر موصوف کی زبان سے ہی نقل کرتے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے امید ہے کہ حسب مراد ہو۔ دکن میں سوائے شآد کے اور ہے کون؟ رات پھر ایک اور پیغام حضرت تاج کی خدمت بابرکت میں بھیجا گیا ہے۔ گزشتہ ہفتہ میں دو نیاز نامے سرکار والا کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں۔ آج یہ تیسرا نیاز نامہ ہے۔ اقبآل ممکن نہیں کہ شآد کو فراموش کر سکے اور حضرت شآد کو یوں بھی کوئی شخص آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔

پادشاہ ہیں رموز مملکت کو خوب سمجھے ہیں۔ ہم فقیروں کے نزدیک تو مصلحت یہی ہے کہ اور یہی تقاضہ حالات حاضرہ کا بھی ہے کہ شآد دکن کے مدار المہام ہوں۔ کیا عجب ہے کہ یہی تقاضائے وقت و حالات تقدیر الٰہی کے بھی ہوں۔

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا

مخلص

محمد اقبال

عبدالماجد دریابادی کے نام:

لاہور

17/اپریل،1923

مخدومی، السلام علیکم!

والا نامہ مل گیا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

مجھے آپ سے قلبی تعلق ہے اس واسطے ہمیشہ آپ کے خط سے مسرت ہوتی ہے۔ ''پیامِ مشرق'' اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں، لیکن افسوس ہے انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکر روزی قاتل روح ہے۔ یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔ آپ کے نوجوان دوست کے تبصرہ پیام مشرق کو میں شوق سے پڑھوں گا۔ میرے ایک سکھ دوست اسرار خودی کا بھگوت گیتا سے مقابلہ کر رہے ہیں، ان کی تحریر انگریزی میں ہوگی۔

میرے کلام کی مقبولیت محض فضلِ ایزدی ہے۔، ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا اور اعمالِ صالحہ کی شرط بھی مفقود ہے۔

مولانا کی کتاب فیہ ما فیہ کو آپ خود ایڈٹ کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں، لیکن آخر ہندی مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے۔ میری رائے میں آپ یہ ضروری کام خود کریں بعد میں یورپین ایڈیشن بھی نکل آئے گی۔ جوہر کے نعتیہ کلام کو میں نے بھی خاص طور پر نوٹ کیا ہے، بلکہ میں تو ان کے روحانی انقلاب کو ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

میر سید غلام بھیک نیرنگ کے نام:

لاہور

5/دسمبر، 1928ء

ڈیر میر صاحب، السلام علیکم!

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے ''قوم پرستوں'' کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روش سے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شُدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شُدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہر حال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اجر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشا اللہ جہاں جہاں موقع ہوگا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں مگر آپ اور مولوی عبدالماجد بدایونی جنوبی ہندوستان کے دورے کے لیے تیار رہیں۔

باقی رہا لکچروں کے ترجمے کا کام، سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور ازبس مشکل ضرور ہے۔ ان لکچروں کے مخاطب زیادہ تر مسلمان ہیں، جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں، میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے کیوں کہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے والے (یا سننے والے) کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ تین لکچر امسال لکھے گئے ہیں، تین آئندہ سال لکھوں گا اور مدراس ہی میں دسمبر 1929ء یا جنوری 1930ء میں دوں گا۔ حیدرآباد دکن بھی ٹھہروں گا۔ کیوں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا تار آیا ہے کہ لکچر وہاں بھی دیے جائیں۔ آئندہ دسمبر تک یہ تمام لکچر تیار ہو کر چھپ جائیں گے۔ اس وقت میں آپ کی خدمت میں ایک کاپی بھیج سکوں گا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

رشید احمد صدیقی کے نام:

لاہور

دسمبر، 1929

جناب صدیقی صاحب السلام علیکم!

آپ کا خط مل گیا ہے۔

میری رائے ناقص میں خواجہ حافظؔ کے شعر میں لفظ ''بادیہ پیمائی'' ہے۔ پہلے مصرے میں 'اینجا' سے مراد 'دریں بادیہ' ہے۔ مفہوم شعر کا یہ ہے کہ اس دشت میں سینکڑوں ہوائیں بے سلسلہ (یعنی بے زنجیر، آزادانہ) رقص کر رہی ہیں اور یہی ہوائیں اے دل تیری رفیق (حریف بمعنی رفیق) ہیں جب تک تو بادیہ پیما ہے۔ یا ان کا رقص اس غرض سے ہے کہ تو آسانی اور اطمینان سے اس صحرا کو طے کر لے۔ شاعر کا مقصود اپنے آپ کو تسکین دینا ہے کہ تو اس بادیہ گردی میں تنہا نہیں ہے بلکہ عالم کا ہر ذرہ تیری ہی خاطر حالتِ رقص میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلا مصرع بہت بلند ہے اور کسی اور مضمون کا متقاضی ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام!

مخلص

محمد اقبال

13.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ☆ اقبال حرکت و عمل کے پیغامبر ہیں۔ اُن کا فلسفہ انسان کو جہد مسلسل کی تعلیم دیتا ہے۔
- ☆ اقبال کا مفکرانہ انداز اور تجزیاتی مزاج ان کی نثر میں ہی اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔
- ☆ اقبال کے خطوط اقبال کی سوانحی کوائف کا بہترین مآخذ ہیں۔
- ☆ اقبال کے خطوط اس دور کے مسائل اور ان مسائل کے حل کی تلاش ہیں۔
- ☆ اقبال کے خطوط میں ان کی شخصیت کے وہ پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جو عام طور پر دوسری تحریروں میں نمایاں نہیں ہوتے۔
- ☆ اقبال کی قدرت زبان نے خطوط کو اسلوب بیان کی بوقلموں صفات کا حامل بنا دیا۔
- ☆ مکاتیب اقبال میں ان کے مختلف افکار و نظریات اور فلسفیانہ مسائل کی تشریحات و توضیحات ملتی ہے۔

13.6 کلیدی الفاظ

لفظ	:	معنی
مشاہیر	:	بزرگ اور نامور لوگ
مساعی	:	کوشش، دوڑ دھوپ
قطع نظر	:	چھوڑ کر، علاوہ
جزئیات	:	جزو کی جمع، چھوٹے چھوٹے امور
تحلیل	:	حل کرنے، گھلنے گھلانے کا عمل
تجزیاتی	:	مرکب کے اجزا کو الگ الگ کرنا
تنوع	:	قسم قسم کا ہونا، رنگ برنگ کا ہونا

قطعیت	:	حتمی ہونا، یقینی وقطعی ہونا
مستنبط	:	اخذ کیا گیا، باہر لایا گیا
نوائے شوق	:	شوق کی آواز
حریم ذات	:	محبوب کے گھر کا احاطہ
مافی الضمیر	:	جو کچھ دل میں ہو
مکتوب الیہم	:	جس کو خط لکھا جائے
برجستگی	:	مقتضائے حال کے مطابق، فوراً کہنا
عجلت	:	جلدی
مضطرب	:	بے چینی
بوقلمونی	:	رنگا رنگی
عوارض	:	بیماریاں
نزاعی	:	جس میں اختلاف ہو
موشگافیوں	:	نکتہ چینی، باریک بینی
توغل	:	بہت زیادہ دلچسپی
حلیم الطبع	:	طبیعت کا نرم، نرم دل
منکسر المزاج	:	جس کے مزاج میں انکسار ہو

13.7 نمونہ امتحانی سوالات

13.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خطوط اقبال کا پہلا مجموعہ کس سنہ میں شائع ہوا؟

2۔ خطوط اقبال کے مجموعے ''شاد اقبال'' کا مکتوب الیہ کون ہے؟

3۔ ''کلیات مکاتیب اقبال'' کا مرتب کون ہے؟

4۔ تصور مرد مومن کے حوالے سے اقبال نے کس یورپی مستشرق کے ساتھ خط و کتابت کی تھی؟

5۔ اقبال کا پہلا دستیاب شدہ خط کس سنہ کا ہے؟

6۔ خطوط اقبال کے حوالے سے کس محقق کا کام زیادہ وقیع ہے؟

7۔ ''اقبال نامہ'' کا مرتب کون ہے؟ اور یہ کب شائع ہوا؟

8۔ ''خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی'' کا مرتب کون ہے؟

9۔ ''مطالعہ مکاتیب اقبال'' کس کی مرتب کردہ تصنیف ہے؟

10۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق اقبال کے دستیاب شدہ خطوط کی تعداد کتنی ہے؟

13.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو ادب میں اقبال کی خطوط نگاری کی اہمیت کا جائزہ لیجیے۔

2۔ مکاتیب اقبال کی روشنی میں تصور مرد کامل کا تجزیہ پیش کیجیے۔

3۔ مکاتیب اقبال کی روشنی میں ان کے نثری اسلوب کا جائزہ لیجیے۔

4۔ ''اسرار خودی'' کی اشاعت اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے تنازعہ کا مختلف خطوط کے حوالے سے جائزہ لیجیے۔

5۔ سید سلیمان ندوی کو لکھے گئے خطوط پر تعارفی نوٹ قلمبند کیجیے۔

13.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مکاتیب اقبال کی روشنی میں ان کی سوانح حیات و شخصیت کا جائزہ لیجیے۔

2۔ اقبال کے خطوط ان کے افکار کے ترجمان و شارح ہیں۔ بحث کیجیے۔

3۔ اقبال کے مختلف تصورات کا جائزہ ان کے خطوط کے تناظر میں پیش کیجیے۔

13.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ مطالعہ مکاتیب اقبال	ڈاکٹر محمد امین اندرابی
2۔ کلیات مکاتیب اقبال	سید مظفر حسین برنی
3۔ روح مکاتیب اقبال	محمد عبداللہ قریشی
4۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
5۔ اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال	شیخ عطاءاللہ

اکائی14: خطوطِ اقبال کا فکری وفنی مطالعہ

اکائی کے اجزا

14.0		تمہید
14.1		مقاصد
14.2		خطوطِ اقبال کا فکری وفنی مطالعہ
	14.2.1	اقبال کی سیرت وشخصیت
	14.2.2	سیاسی وسماجی فکر
	14.2.3	اسلامی ومذہبی فکر
	14.2.4	علمی وادبی فکر
	14.2.5	خطوط اقبال کا طرزِ تحریر
14.3		نمونۂ خطوط اقبال برائے مطالعہ
14.4		اکتسابی نتائج
14.5		کلیدی الفاظ
14.6		نمونۂ امتحانی سوالات
	14.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	14.6.1	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	14.6.1	طویل جوابات کے حامل سوالات
14.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے علامہ اقبال کے خطوط کا موضوعاتی مطالعہ کیا۔اس اکائی میں آپ ان کے خطوط کا فکری وفنی مطالعہ کریں گے۔ علامہ اقبال کی شاعری اور نثر دونوں میں فکر وفلسفہ غالب ہے نیز انہوں نے جو خطوط اپنے زمانے کے مشاہیر کو لکھے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ہمیں اقبال کے فکری وعملی رجحانات سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس دور کے مسائل اور ان مسائل کے حل بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

جب ہم کسی شخص کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی شخصیت کے فکر واحساس اور اس کے رویوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔کیوں کہ خطوط ایک لحاظ سے ذاتی معاملہ ہوتا ہے لہٰذا ان میں انسان کی طبیعت کے وہ پہلو نمایاں ہوجاتے ہیں جو عام طور پر دوسری تحریروں میں نظر نہیں آتے۔خطوط

باہمی رابطے کی سطح کے بدلنے کے ساتھ ساتھ لب ولہجہ اور مضمون کے تنوع کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ علامہ اقبال جب قائداعظم کو خط لکھتے ہیں تو عصری سیاسی امور اور مسائل کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے معاملات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ جب سید سلیمان ندوی کو خط لکھتے ہیں تو دینی افکار اور فقہی مسائل کو موضوع بحث لاتے ہیں۔ اسی طرح اقبال نے جو خطوط مولانا غلام قادر گرامی کو لکھے ہیں ان میں دوستی کی بے تکلفانہ فضا اور شعر وسخن کے مسائل ملتے ہیں۔ سید نذیر نیازی کو لکھے گئے خطوط میں علامہ اقبال کی بیماری اور حکیم نابینا کے علاج معالجے کے معاملات کی تفصیلات نظر آتی ہیں۔ اسی طرح انہوں اپنے خطوط میں مختلف قسم کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، جس سے ان کی فکری بنیادوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگلے صفحات میں ان کے انہیں فکری وفنی پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ خطوط کی روشنی میں اقبال کی سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، علمی وادبی فکر کو واضح کر سکیں۔
- ☆ خطوط کے آئینے میں اقبال کی سیرت وشخصیت کو بیان کر سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے خطوط کی فنی اہمیت کو بیان کر سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے خط لکھنے کے طریقے سے واقف ہو سکیں۔

14.2 خطوطِ اقبال کا فکری وفنی مطالعہ

خطوط کا تعلق سیدھے طور پر انسان کی ذاتیات سے ہوتا ہے۔ خطوط سے انسان کی سیرت وشخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط نہ صرف لکھنے والے کے بارے میں ذاتی معلومات کا خزینہ ہوتے ہیں بلکہ ان کے مطالعے سے لکھنے والے کی پسند وناپسند، اس کی ذہنی سطح، اس کی خواہشات اور اس کے فکر وفن کے سفر کی داستان بھی سامنے آتی ہے۔ ادبا وشعرا اکثر وبیشتر اپنی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو دانستہ اور نادانستہ طور پر اپنی تخلیقات کے پردے میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اس لیے کسی فنکار کی شخصیت اور اس کے مزاج وکردار کے تجزیاتی مطالعے کے لیے اس کی تخلیقات سے کہیں زیادہ ان کے مکتوبات کا مطالعہ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ مکتوب ایک تحریر ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے صاف وشفاف آئینے کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جس میں مکتوب نگار کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''مکتوبات دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت وخلوص ہے، جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔''

(مقدمات عبدالحق، مرتب: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص329)

مولوی عبدالحق نے مکتوبات کے تعلق سے جو باتیں کہی ہیں وہ اقبال کے خطوط کے متعلق بالکل درست معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اقبال کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے اقبال کی زندگی، افکار وخیالات، پسند وناپسند اور تعلقات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

علامہ اقبال کی اردو نثر کا بڑا سرمایہ ان کے خطوط ہیں۔ اقبال کا دائرہ احباب بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں، عالموں،

دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھے ہیں۔ اب تک ان کے لکھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط دستیاب ہو چکے ہیں، لیکن انہوں نے اس سے کہیں زیادہ خط لکھے ہیں، جن میں سے بہت سے ضائع ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اب بھی گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوں گے۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال کے مرتب ''سید مظفر حسین برنی'' کے مطابق علامہ اقبال کا پہلا خط (جواب تک دریافت ہوا ہے) مولانا احسن مارہروی کے نام ہے، جو انہوں نے 28/فروری 1899ء کو لکھا تھا۔ اس وقت اقبال کی عمر بائیس سال تھی۔ یقیناً اس پہلے بھی وہ خط لکھے ہوں گے، لیکن ابھی تک اس سے پہلے کا کوئی خط دستیاب نہیں ہوا ہے۔ علامہ اقبال کے دس پندرہ خطوط سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب ''اتالیق خطوط نویسی'' میں شائع کیے تھے۔ اس کے بعد ان کے خطوط کے مختلف مجموعے الگ الگ لوگوں نے مرتب کر کے شائع کیے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1۔ ''شاد اقبال'' مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد، 1942

2۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' مرتبہ و مترجم حمید اللہ ہاشمی، یونیورسل بکس، لاہور 1942

3۔ ''اقبال نامہ (حصہ اول)'' مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ، لاہور، 1944/1945

4۔ ''اقبال از عطیہ بیگم'' مترجم ضیا الدین برنی، اقبال اکادمی، کراچی، 1956

5۔ ''اقبال نامہ (حصہ دوم)'' مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ، لاہور، 1951

6۔ ''مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان'' شائع کردہ بزم اقبال، لاہور، 1954

7۔ ''مکتوبات اقبال بنام نذیر نیازی'' مرتبہ نذیر نیازی، اقبال اکادمی، لاہور، 1957

8۔ ''انوار اقبال'' مرتب بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی، لاہور، 1967

9۔ ''Letters and Writings of Iqbal'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1967

10۔ ''مکاتیب اقبال بنام گرامی'' مرتب محمد عبداللہ قریشی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1969

11۔ ''نوادر اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، بزم اقبال، لاہور، 1973

12۔ ''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، 1976

13۔ ''Letters of Iqbal'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، لاہور، 1978

14۔ ''خطوط اقبال بنام بیگم گرامی'' مرتبہ حمید اللہ شاہ ہاشمی، محبوب بک ڈپو، فیصل آباد، 1987

15۔ ''اقبال کے خطوط جرمن خواتین کے نام'' مترجم سعید اختر درانی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1985

16۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر، پھوپال، 1981

17۔ ''اقبال جہانِ دیگر'' مرتبہ محمد فرید الحق ایڈووکیٹ، گردیزی پبلی شرز، کراچی، 1983

18۔ ''Iqbal, his Political Ideas at Crossroads'' مرتبہ حسن احمد، پرنٹ ویل پبلی کیشنز، علی گڑھ، 1979

19۔ ''منظوم اقبال'' مرتبہ شیخ اعجاز احمد، کراچی، 1985

20۔ ''روح مکاتیب اقبال'' مرتب عبداللہ قریشی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1977

ان مجموعوں کے علاوہ علامہ اقبال کے اور بھی خطوط ہیں، جو متفرق کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں یا وقتاً فوقتاً دریافت ہو کر مجلّات و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف گوشے اور ان کے فکر و فن کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے نیز ان کی شاعری کے فکری پس منظر کو جاننے کے لیے خطوط اقبال کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ ان کے خطوط کا مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکے گا جب تک کہ ان کے تمام خطوط کو یکجا کر کے تاریخی ترتیب اور ضروری حواشی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے۔ علامہ اقبال کے خطوط کے مختلف مجموعے پہلے بھی تاریخی ترتیب کے ساتھ شائع کیے جا چکے ہیں، لیکن ان میں تصحیح اور کلیات مکاتیب کو زمانی تسلسل سے پیش کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اسی کے پیش نظر سید مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے تمام خطوط کو ''کلیاتِ مکاتیب اقبال'' کے نام سے چار جلدوں (مع حواشی و تعلیقات) میں مرتب کیا ہے، جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

1۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال [جلد اول] 319 خطوط، (فروری 1899 تا دسمبر 1918)، سنہ اشاعت، 1889

2۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال [جلد دوم] 429 خطوط، (جنوری 1919 تا دسمبر 1928)، سنہ اشاعت، 1991

3۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال [جلد سوم] 411 خطوط، (جنوری 1929 تا دسمبر 1934)، سنہ اشاعت، 1993

4۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال [جلد چہارم] 365 خطوط (جنوری 1935 تا اپریل 1938)، سنہ اشاعت، 1998

کلیاتِ مکاتیب اقبال کی چار جلدوں کے علاوہ پانچویں جلد بھی ہے۔ یہ جلد علامہ اقبال کے انگریزی خطوط پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں شامل تمام خطوط کا اردو ترجمہ کلیاتِ مکاتیب اقبال کے اول تا چہارم میں بااعتبار تاریخ درج کیا گیا ہے۔ اس جلد میں انگریزی کے اصل (متن) خطوط کو جمع کر دیا گیا ہے۔

اس طرح کلیاتِ مکاتیب اقبال کی چاروں جلدوں میں 1624 خطوط موجود ہیں، جن میں اردو، انگریزی، جرمن، عربی اور فارسی تمام زبانوں میں لکھے گئے خطوط کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے سید مظفر حسین برنی لکھتے ہیں:

> ''میں نے مکاتیب اقبال کی ترتیب و تدوین کا جو خواب دیکھا تھا وہ اللہ کے فضل و کرم سے جلد چہارم کی طباعت کے ساتھ شرمندۂ تعبیر ہوا۔ گو اس میں عمر عزیز کے تو دس برس ضرور صرف ہو گئے، لیکن یہ ہرگز رائگاں نہ گئے... کلیات میں اقبال کے کل پندرہ سو ستہتّر (1577) دستیاب مکتوبات مرتب کیے گئے ہیں، جو انہوں نے تقریباً انتالیس (39) برس کے عرصہ میں لکھے۔ ان میں ایک سو اٹھائیس (128) غیر مدون اور ان میں سے چھیالیس (46) غیر مطبوعہ ہیں، ان میں دو سو انچاس (249) خطوط انگریزی، سترہ (17) جرمن، ایک عربی زبان اور دو (2) فارسی زبان میں ہیں۔ میری خوش بختی ہے کہ بسیار تلاش و جستجو کے بعد پانچ سو چورانوے (594) خطوط کی عکسی نقول حاصل ہو گئیں، جو شائع کر دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی مکاتیب کی کثیر تعداد کی عکسی نقلیں بھی دستیاب ہو گئیں۔ اس طرح تقریباً چالیس (40) فیصدی مکاتیب کے متون کو اصل سے موازنہ کرنے، ان کی تصحیح کرنے کی کماحقہٗ کوشش کرنے کا ایک نادر موقع مل گیا، جو کم مرتبین کو میسر آتا ہے۔''

(سید مظفر حسین برنی، کلیاتِ مکاتیب اقبال [جلد چہارم]، اردو اکادمی، دہلی، 1998، ص 18-17)

درج بالا اقتباس میں مرتب نے 1577 خطوط کا ذکر کیا ہے جب کہ کلیاتِ مکاتیب اقبال (چاروں جلد) میں 1624 خطوط شامل اشاعت ہیں۔ اقبال کے خطوط انتالیس سال کے طویل عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ ان کو جمع کر کے شائع کرنے میں مرتب کو دس برس لگ گئے۔ جب سید مظفر حسین برنی نے کلیات مکاتیب اقبال کا خاکہ تیار کیا اور اسے چار جلدوں میں تقسیم کر کے کام شروع کیا تو ان کے پاس 1577 خطوط ہی موجود تھے، لیکن چاروں جلدوں کو مکمل کرنے کے درمیان انہیں ترپن (53) خطوط اور دستیاب ہو گئے۔ ان خطوط کو انہوں نے جلد چہارم میں ضمیمہ کے تحت شامل کر دیا ہے۔ اس طرح کلیات مکاتیب اقبال میں جملہ 1624 خطوط شامل ہو گئے۔ اس کے متعلق سید مظفر حسین برنی خود لکھتے ہیں کہ:

''زیر نظر جلد میں ضمیمہ بھی شامل ہے، جو ترپن (53) مکتوبات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اکتالیس (41) غیر مدون اور دو (2) غیر مطبوعہ خطوط ہیں، اس ضمیمے میں تیرہ (13) خطوط کے عکس بھی شامل ہیں۔''

(ایضاً، ص 19)

اس اکائی میں اقبال کے تمام خطوط کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا یہاں پر ان کے چند اہم خطوط کے حوالے سے علامہ اقبال کی شخصیت اور خصوصیات کے غالب پہلوؤں کا فکری و فنی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

14.2.1 اقبال کی سیرت و شخصیت:

علامہ اقبال کی سیرت و شخصیت کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان کی شاعری سے کہیں زیادہ ان کی نثر بالخصوص ان کے خطوط کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ علامہ اقبال کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ حق بات کو بغیر کسی خوف و خطر کے کہہ جاتے تھے۔ کسی بھی بات کو کہنے سے پہلے اقبال صرف یہ دیکھتے تھے کہ وہ جو بات کہنے جا رہے ہیں اس میں کتنی سچائی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں کسی بات کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس تعلق سے علامہ اقبال 14/ جولائی 1916 کے ایک خط میں سید فصیح اللہ کاظمی کو لکھتے ہیں:

''تصوف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں۔ میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے، اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا ہے۔ مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے، لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔ شاعری میرے لیے ذریعۂ معاش نہیں کہ میں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں، آخر میں انسان ہوں اور مجھ سے غلطی ممکن کیا یقینی ہے۔ نہ ہمہ دانی کا دعوائی ہے نہ زبان کا۔''

(کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، سنہ اشاعت، 1889، ص 518)

مذکورہ بالا خط کے اس اقتباس میں ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مجھے حق بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں حق بات بلا خوف کہتا ہوں اور کہوں گا چاہے اس کے لیے مجھے گالی ہی کیوں نہ سننی پڑے۔ گالی کے ڈر سے میں حق بات کہنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرا ایمان مجھے اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ میں حق بات کہنے سے احتراز کروں۔ اسی طرح 10/ جولائی 1916 کے ایک اور خط میں سید فصیح اللہ کاظمی کو ہی لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک تصوف وجودی مذہب اسلام کا کوئی جز نہیں بلکہ مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ تعلیم غیر مسلم

اقوام سے مسلمانوں میں آئی ہے۔صوفی عبداللہ صاحب اس خیال کے اظہار سے قال سے حال میں آ گئے۔مگر
یہ ایک خاص علمی اور تاریخی بحث ہے جس میں تاریخ اور آثار سے مدد لینی چاہیے، گالیوں سے کام نہ چلے گا۔
صوفی عبداللہ صاحب نے گالیوں کی روش اختیار کی ہے۔اس کا جواب مجھ سے نہیں ہوسکتا۔تصوف پر جو میرے
خیالات ہیں ان کا اظہار میں متعدد مضامین میں کر چکا ہوں، جو وکیل اخبار (امرتسر) میں شائع ہوئے ہیں۔''

(کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، سنہ اشاعت، 1989، ص515)

علامہ اقبال نے جب تصوف پر اپنے نظریات پیش کیے تو کئی علما نے ان کے اس نظریے سے اختلاف کیا۔یہاں تک کہ صوفی عبداللہ نے گالی گلوچ کی روش اختیار کی۔اس کے باوجود اقبال صوفی عبداللہ کو کچھ نہیں کہتے بلکہ سید فصیح اللہ کاظمی کو خط لکھ کر کہا کہ صوفی عبداللہ کی گالیوں کا جواب میں نہیں دے سکتا، لیکن تصوف پر میرے جو نظریات یا خیالات ہیں ان کا اظہار میں کروں گا اور کر بھی رہا ہوں، جو متعدد مضامین کی شکل میں شائع بھی ہو رہے ہیں۔

ان دو خطوط کے حوالے سے علامہ اقبال کی شخصیت اور سیرت کا بخوبی اندزاہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حق بات کہنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے اور ان باتوں کے اعتراضات اور اختلافات پر کوئی ردعمل کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔یہ علامہ اقبال کی اعلیٰ شخصیت اور سیرت کی مثال ہے۔

14.2.2 سیاسی وسماجی فکر:

علامہ ایک حساس ذہن وفکر کے مالک تھے۔انہیں سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔علامہ اقبال کا تعلق ایک ایسے عہد سے تھا جو ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں کے لیے نہایت ہی پر آشوب تھا۔مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ایک نیا نظام پوری قوت وجاہ وجلال کے ساتھ ان کے اوپر مسلط ہو چکا تھا۔مسلمان ہر شعبہ حیات میں خواہ سیاسی ہو یا معاشی، پوری طرح سے ایک اجنبی قوم کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔چاروں طرف فسادات برپا ہو رہے تھے۔اس صورت حال سے اقبال بہت ہی زیادہ خوف زدہ تھے، پریشان تھے اور ہندوستان کے مستقبل کو لے کر خاصا مایوس بھی تھے۔وہ اس تعلق سے 22/مئی 1932 کے ایک خط میں 'مس فارک ہرسن' کو لکھتے ہیں:

''ذاتی طور پر میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں خاصا مایوس ہوں۔بمبئی کے فسادات ابھی جاری ہیں۔اس
صورت حال نے مجھے خاصا پریشان کیا ہے۔مجھے خدشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا نتیجہ خونریزی کے علاوہ کچھ
نہ ہوگا اور اس سے ایک طرح کی بے اطمینانی کے لیے میدان ہموار ہوگا۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد سوم، سنہ اشاعت، 1993، ص284)

علامہ اقبال کی نظر ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر ہی نہیں تھی بلکہ وہ پوری دنیا کے سیاسی حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔انہیں اس بات کی فکر لاحق تھی کہ پوری دنیا ایک عجیب کشمکش میں ہے۔جمہوریت ختم ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور ہر جگہ تاناشاہی قائم ہو رہی ہے۔اس صورت حال میں اسلام اور مسلمانوں کا کیا ہوگا۔اس بابت علامہ اقبال 15/جنوری 1934 کے ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے، جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔جرمنی میں

مادی قوت کی پرکشش کی تعلیم دی جارہی ہے۔سرمایہ داری کے خلاف بھی ایک جہادِ عظیم ہورہا ہے،تہذیب وتمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزاع میں ہے،غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کامحتاج ہے۔ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہوسکتا ہے۔اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیں۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال،جلدسوم،سنہ اشاعت، 1993،ص449)

خط کے اس اقتباس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کی ذاتی طور پر سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ ہی انہیں لیڈر شپ کا کوئی شوق تھا،لیکن ایک حساس ذہن اور سماجی شعور نے انہیں اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خط کے ذریعے نہ صرف یہ کہ سید سلیمان ندوی کو اپنی فکرمندی اور احساس سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ ان سے ان حالات سے باہر آنے کے لیے مشورہ بھی دریافت کرتے ہیں۔

''ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی اور تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہوسکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علما اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے بلکہ اس وقت بھی ہیں۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال،جلدسوم،سنہ اشاعت، 1993،ص402)

14.2.3 اسلامی و مذہبی فکر:

علامہ اقبال مذہبی شخص تھے۔ان کی شاعری کی طرح ان کے خطوط میں بھی اسلامی اور مذہبی فکر جابجا نظر آتی ہے۔اقبال نے قرآن کریم کی اساس پر اپنی فکر کا ایوان تعمیر کیا اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں ملت اسلامیہ اور اس کے ذریعے تمام مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔لہٰذا اقبال کی فکر کو بجا طور پر اسلامی فکر یا قرآنی فکر کا نام دیا جاسکتا ہے۔اس کے باوجود بعض لوگ انہیں اسلامی تصوف کا مخالف کہا کرتے تھے۔انہی باتوں کی وضاحت کے مدنظر اقبال نے شاہ سلیمان پھلواری کو 9/مارچ 1916 ایک خط لکھا تھا،جس میں وہ لکھتے ہیں:

''...لیکن حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیوں کر مخالف ہوسکتا ہوں کہ خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔میں نے تصوف کا لٹریچر کرات (یعنی بار بار) سے دیکھا ہے۔بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیے ہیں۔جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہو وہ تصوف کا خیر خواہ ہے نہ مخالف۔''

(کلیات مکاتیب اقبال،جلداول،سنہ اشاعت، 1889،ص481)

علامہ اقبال نہ صرف مذہب اسلام کے لیے فکرمند تھے بلکہ ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کے تعلق سے بھی انہیں ایک فکر لاحق رہتی تھی۔ اقبال نے جب مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب پر غور کیا تو ان میں ذوق عمل سے محرومی کو سرفہرست پایا۔مسلمان دنیا کو حقیر اور ناقابل التفات سمجھنے لگے تھے اور دینوی ترقی کے لیے کوشش کرنے کو گمراہی خیال کرتے تھے۔یہ سب دیکھ کر اقبال مسلمانوں کے مستقبل کو لے کر بہت فکرمند ہوگئے اور 18/اپریل 1931 کے ایک خط میں مولوی صالح محمد ادیب تونسوی کو لکھتے ہیں:

''اسلام پر ایک بہت بڑا نازک وقت ہندوستان پر آرہا ہے۔سیاسی حقوق وملی تمدن کا تحفظ تو ایک طرف،خود

اسلام کی ہستی معرضِ خطر میں ہے۔ میں ایک مدت سے اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے مقدم ہے کہ ایک بہت بڑا نیشنل فنڈ قائم کریں جو ایک ٹرسٹ کی صورت میں ہو اور اس کا روپیہ مسلمانوں کے تمدن اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت اور ان کی دینی اشاعت وغیرہ پر خرچ کیا جائے۔ اسی طرح ان کے اخباروں کی حالت درست کی جائے اور وہ تمام وسائل اختیار کیے جائیں جو زمانۂ حال میں اقوام کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد سوم، سنہ اشاعت، 1993، ص195)

14.2.4 علمی و ادبی فکر:

اقبال نے شعر و ادب کے بارے میں اپنے تصورات کا اظہار شاعری اور نثر دونوں میں کیا ہے۔ مثلاً اقبال کی علمی و ادبی فکر درج ذیل اشعار سے پوری طرح واضح ہوتی ہے۔

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مردِ ہنر مند ہے آزاد
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

درج بالا اشعار سے اقبال کا نظریۂ شعر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ شعر گوئی ایک خداداد صلاحیت ہے، لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اپنی محنت اور کوشش سے اپنی شاعری کو اعلیٰ درجے کی شاعری بنا سکتے ہیں۔ یعنی اقبال کے نزدیک آمد کا معاملہ محض خیال تک ہے اس آمد کو آورد سے گزار کر ایک اچھے فن کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ اقبال اپنی علمی و ادبی فکر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے 20/مئی 1930 کے ایک خط میں مولوی صالح محمد ادیب تونسوی کو لکھتے ہیں کہ:

''اس کے علاوہ یہ بھی گُر کی بات ہے کہ مجھ سے مشورہ نہ کیجیے، جس شعر کا جو اثر آپ کے دل پر ہوتا ہے، اسی کو صاف و واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مصنف کا مفہوم معلوم کرنا بالکل غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ ہاں ایک ضروری شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ جو تشریح آپ کریں، اس کی تائید شعر کی زبان سے ہونے چاہیے۔ ایک ہی شعر کا اثر مختلف قلوب پر مختلف ہوتا ہے بلکہ مختلف اوقات میں بھی مختلف ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ قلوب انسانی کی اصل فطرت اور انسانی تعلیم و تربیت اور تجربہ کا اختلاف ہے۔ اگر کسی شعر سے مختلف اثرات قلوب پر پیدا ہوں تو یہ بات اس شعر کی قوت اور زندگی کی دلیل ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت تنوع اور گونا گونی ہے۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد سوم، سنہ اشاعت، 1993، ص119)

اقبال محض شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ شاعری کے نقاد کی حیثیت سے بھی ادب پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کی کئی اہم اصناف پر اپنی رائے دی ہے۔ وہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ حیدر آبادی کو 10/اپریل 1934 کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سنئے غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے۔ اگر ردیف بھی بڑھادی جائے تو سخن میں اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں، قافیہ تو ہونا چاہیے۔
اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے، جس کا نام انگریزی میں ''بلینک ورس'' ہے۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد سوم، سنہ اشاعت، 1993، ص482)

اس خط سے اقبال کی علمی و ادبی فکر کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ جہاں ان کی فکر جذبے میں تحلیل ہو جاتی ہے وہاں اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں آتی ہے۔ وہ شعر کے فنی تقاضوں کی طرف اپنی کم التفاتی کا کتنا ہی ذکر کیوں نہ کریں، اصلیت یہ ہے کہ وہ فن شاعری پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے جس کا اظہار ان کی مختلف تحریروں اور خطوط سے ہوتا ہے۔ شاعری میں وہ ہر جگہ اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ پر اثر بنانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ چناں چہ حسب ضرورت وہ مختلف فنی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

14.2.5 خطوط اقبال کا طرزِ تحریر:

علامہ اقبال خط لکھتے وقت شاعری کی طرح کسی اصول یا طریقۂ کار کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ وہ خط قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ خط لکھتے وقت لغزش قلم سے ہونے والی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے تھے۔ مکاتیب کلیات اقبال کے مرتب سید مظفر حسین برنی علامہ اقبال کی خطوط نویسی کے متعلق لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کے یہاں خطوط نویسی میں کوئی اہتمام خاص نہیں تھا۔ القاب وہ بہت مختصر اور مکتوب الیہ کے رتبے کی رعایت سے لکھتے ہیں۔ عبارت میں اختصار کے ساتھ جامعیت ہے۔ وہ عموماً چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں اور عبارت آرائی نہیں کرتے۔ اکثر خطوط قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ اس لیے ان سے زبان و محاورہ کی غلطی بھی سرزد ہو جاتی تھی۔ تذکیر و تانیث کے معاملے میں وہ مسلمہ اصولوں سے انحراف بھی کر جاتے ہیں، کبھی سبقتِ قلم سے کوئی لفظ رہ بھی جاتا ہے۔ خط پر تاریخ کبھی اوپر لکھتے ہیں اور کبھی آخر میں۔''

(کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، سنہ اشاعت، 1889، ص47)

اس کے علاوہ اقبال خطوط لکھتے وقت کسی معیاری املے کا اہتمام بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر الفاظ ملا کر لکھتے تھے۔ جیسے آپکا، انکا، ملکر، علیگڑھ، گرونگا، لکھونگا، جاؤنگا، رہکر وغیرہ۔ مخلوط آواز کے ہندی حروف وہ اکثر ہائے مخفی سے لکھتے تھے۔ جیسے بہائی (بھائی)، بہلا (بھلا)، لکہنے (لکھنے)، مجہے (مجھے) وغیرہ۔ عام طور پر جہاں پر ہائے مخفی استعمال ہوتا ہے وہاں پر دو چشمی (ھ) استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کھا (کہا)، رھا (رہا)، سھا (سہا) وغیرہ۔

دراصل علامہ اقبال کسی معیاری املے کی پابندی کی شعوری کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خط لکھتے ہوئے املے کی طرف ان کا ذہن جاتا ہی نہیں تھا۔ وہ جو بات لکھنا چاہتے تھی اسی پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھتے تھے۔

14.3 نمونۂ خطوط اقبال برائے مطالعہ

1۔ اکبرالہ آبادی کے نام:

لاہور

6/اکتوبر، 1911ء

مخدوم ومکرم جناب قبلہ صاحب السلام علیکم!

کل ظفر علی خاں صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی۔ اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ جناب کا محبت نامہ ملا۔ دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے۔ تا کہ ہندوستان کے مسلمان اُس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں، جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں، جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت وعقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے، لیکن میں ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افساں میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں ''جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔'' سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبعِ سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفی:

رَستم ز مدّعی بقبولِ غلط ولے
درتابَم از شکنجۂ طبعِ سلیمِ خویش

ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔ ''غُرہ شوال'' پر چند اشعار لکھے تھے۔ زمین دار اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے ان کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ترکی واٹلی کی جنگ نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اگر زمیندار اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے، بھجوا دوں گا۔

خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے، مجھے بھی ان سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسول نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔ شیخ عبدالقادر لائل پور میں سرکاری وکیل ہو گئے۔ اب وہ لاہور سے وہاں چلے گئے۔ کچھ دن ہوئے یہاں آئے تھے مگر ان سے مل نہ سکا۔ آرڈر قائم کرنے کا خیال تھا اور اب تک ہے مگر اس راہ میں مشکلات بے حد ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مذاق کے لوگ کہاں ہیں۔ بہر حال میں ہم خیال پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ آپ دعا کریں۔

خیریت مزاج سے مطلع کیجیے۔ مجھے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا آپ کو صحتِ کامل کرامت فرمائے۔

دعا گو

محمد اقبال، بیرسٹر، لاہور

2۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام:

لاہور

3/اکتوبر، 1918ء

مخدوم مکرم جناب مولانا السلام علیکم!

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لیے نہایت ممنون ہوں۔ مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ میں چند روز کے لیے شملہ گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ آپ بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ مجھے ایک ضروری کام درپیش تھا، جس میں مصروفیت رہی۔ البتہ معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی کیوں کہ رات کو سیرت نبویؐ کا مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے، جس کا صلہ دربارِ نبوی سے عطا ہوگا۔

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چوں کہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا۔ اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں اور ظہوری کے ساقی نامہ کے چند اشعار بھی زیرِ نظر تھے۔ غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔

اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہوسکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کی رو سے بیدلؔ اور غنیؔ کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ گو کتبِ بلاغت کے خلاف ہے۔ زمانۂ حال کے مغربی شعرا کا بھی یہی طرزِ عمل ہے تاہم آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں اور میں ان سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا۔

بحرؔ تلخ روکلمہ (بہ سکون لام) باریکؔ تراز جو (بہ معنی کم درعرض وعُمق) کوریؔ ذوق، محفل از ساغر رنگین کردن، سرمۂ او دیدۂ مروم شکست۔ سازؔ برقِ آہنگ ازگل غربت (بہ معنی شر) نوابالیدن۔ صبح آفتاب اندر قفس وغیرہ کی مثالیں اساتذہ میں موجود ہیں۔ مگر اس خیال سے کہ آپ کا وقت ضائع ہوگا نظر انداز کرتا ہوں۔ البتہ اگر آپ اجازت دیں تو لکھوں گا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں نے غلط مثالیں تو انتخاب نہیں کیں۔

ایک امر دریافت طلب ہے اس سے آگاہ فرما کر ممنون کیجیے۔ ''قطرۂ از نرگس شہلاستی'' پر جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے میں نہیں سمجھ سکا۔ کیا آپ کا یہ مقصود ہے کہ قطرہ کا لفظ شہلا کے لیے (یعنی قطرۂ شہلا) موزوں نہیں یا کچھ اور؟ علیٰ ہذا القیاس ''خیمہ برزد در حقیقت از مجاز''، ''نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت''، ''باز بانت کلمۂ توحید خواند'' پر بھی جو ارشادات ہیں، میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ جب فرصت ملے اس جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیں۔ اس احسان کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ بعض خیالات زمانہ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوب بیان سے مدد نہیں ملتی بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔ اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضروری ہے کہ اہل زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔ بعض اشعار کے لکھنے میں تو مجھے اس قدر

روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی تاہم اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کاش چند روز کے لیے آپ سے ملاقات ہوتی اور آپ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

3۔ خان محمد نیاز الدین خاں کے نام:

لاہور

4/نومبر، 1917

مخدومی جناب خاں صاحب! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے، الحمدللہ کہ خیریت ہے۔

گرامی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں تشریف لائیں گے، مگر الکوفی لایوفی اب معلوم نہیں کہاں تشریف رکھتے ہیں، عرصہ سے ان کا خط بھی نہیں آیا۔

پنڈت چھجوم رام صاحب کی رائے سے کوئی تعجب مجھے نہیں ہوا۔ ہر شخص ہر کتاب کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے اور اس کے مضامین سے وہی نتائج نکالتا ہے جن کی اس کی دماغی تربیت مقتضی ہوتی ہے۔ سیاسیات مسلمانوں میں کوئی علاحدہ شے نہیں ہے، بلکہ خالص مذہبی نکتۂ خیال سے کچھ شے ہی نہیں، اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لونڈی ہے۔ کعبہ آباد است الخ والا مصرعہ اس وقت لگا گیا تھا جب موجودہ حالات کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

دوسرا حصہ ان شاءاللہ اس سال سے پہلے ختم ہوجائے گا، صرف چند اشعار کی کسر باقی ہے اگر آج وہ اشعار لکھے جائیں تو ایک ہفتے کے اندر نقل کر کے کتاب مطبع میں دی جاسکتی ہے، مگر میں انتظار میں ہوں کہ وہ اشعار آئیں تو ان کو مثنوی میں داخل کروں۔ دوسرے حصے کے مضامین سے پہلے حصہ پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات جو پہلے حصہ کے اشعار کی جارہی ہے، خود بخود غلط ہوجائے گی۔ اسلامی NATIONALISM کی حقیقت اس سے واضح ہوگی اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں ہوگی کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

گرامی صاحب تو امام غائب ہوگئے، معلوم نہیں اس غیبتِ صغریٰ کا زمانہ کب ختم ہوگا۔

خاکسار

محمد اقبال

4۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام:

لاہور

27/ستمبر، 1936ء

مخدومی جناب مولینا! نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔اس سے پہلے بھی آپ کا خط مع تجویز ملا تھا۔مگر میں علالت کے باعث جلد جواب نہ لکھ سکا۔ پہلے سے اچھا ہوں،مگر افسوس ہے کہ ابھی سفر کے لائق نہیں ہوں،خصوصاً جب کہ سفر 12 گھنٹے سے زیادہ ہو۔رات بھر ریل میں سفر قبض ہو جاتی ہے، جو سخت تکلیف دیتی ہے اور یہ سلسلہ کئی دن رہتا ہے۔ بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا تو انشا اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔اگر چہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی زیادہ گنجائش نہیں۔میرے خیال میں صرف دو باتیں زیر بحث آئیں گی:

اول یہ کہ فنڈ کہاں سے آئے گا۔عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔امرا توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان امرا مقروض ہیں۔

دوم یہ کہ صدر انجمن کا مستقر کہاں ہو میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں:

(i) مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہوگا۔پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔کیوں کہ اسلامی زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی۔مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے!

(ii) آپ انجمن اردو کے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔اس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے۔کیوں کہ ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔

(iii) یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اور مقامات سے بڑھ کر ہے۔ایک معمولی جلسے کے لیے آٹھ دس ہزار مسلمانوں کا جمع ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ بیس بیس ہزار کا مجمع بھی غیر معمولی نہیں۔یہ بات پنجاب کے ہندوؤں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

باقی رہا آپ کے خط کا آخری فقرہ! سو میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں،انسان جب تک زندہ ہے افکار و تردادات لازمہ حیات ہیں:

مرتا ہوں جو بے چین گھڑی بھی نہیں ہوتا

معنوی اعتبار سے تو مدت ہوئی کہ میں نے اسے آپ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔اب ظاہری اعتبار سے بھی چھوڑتا ہوں۔کیوں کہ آپ ایک صاحب عزم آدمی ہیں اور یہ بات مجھے مدت سے معلوم ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا۔والسلام

مخلص

محمد اقبال

5۔ عطیہ فیضی کے نام:

لاہور

30/مارچ،1910ء

مائی ڈیر مس عطیہ!

ملامت نامہ کے لیے جس سے میں بے حد لذت اندوز ہو، سراپا سپاس ہوں۔ ایک دوست کی ملامت سے بڑھ کر اور کیا پر لطف انگیز ہوا۔ نواب صاحب کا دعوت نامہ حیدرآباد ہی میں موصول ہوا تھا۔ میں نے فوراً آپ کو لکھا تھا کہ موروڈ (جنجیرہ) آنا میرے لیے ممکن نہیں، کل واپسی پر آپ کا خط ملا۔ عتاب شیریں۔ اور میں نے نواب صاحب کو تار دیا کہ میں اپنی کالج کی مصروفیت کی وجہ سے، جو پہلے بھی بارہا میرے لیے زنجیر پا بن چکی ہیں، شرف حاضری سے محروم رہ گیا ہوں۔ میں اگر حیدرآباد چندے اور ٹھہر جاتا تو مجھے یقین واثق ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام مجھے شرف باریابی بخشتے۔ میں حیدرآباد میں جملہ اکابر سے ملا اور اکثر نے مجھے اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ میرا سفر حیدرآباد بلا مقصد نہ تھا۔ عندالملاقات عرض کروں گا۔ خاندان حیدری سے ملاقات ہی مقصود سفر نہ تھا۔ میں ان سے اس سفر میں ہی ملا ہوں۔ قبل ازیں ان سے مجھے نیاز حاصل نہ تھا۔ بیگم حیدری کا کرم ہے کہ انہوں نے ان عنایت آمیز الفاظ میں میرا ذکر کیا ہے۔ مجھے ان کا اہل عرب کا سا جذبہ بے حد پسند آیا اور ان کے ہاں مجھے گھر کی سی آسائش میسر آئی۔ میں ان تمام امور میں جو ان کی توجہ یا ہمدردی کا مرکز ہیں، ان کے فہم و فراست کا مداح ہوں۔ حیدری اور بیگم حیدری ہی کے اثر سے مجھے حیدرآباد کی معاشرت کے بعض بہترین نمائندوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ حیدری صاحب ایک پابند وضع اور وسیع المشرب بزرگ ہیں۔ ان سے ملاقات سے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد و شمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ قدرت نے انہیں درد دل اور فکر بلند کی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ان دونوں کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ ایک حقیقی گھر کا نقشہ ایک تو میں نے آرنلڈ صاحب کے ہاں دیکھا تھا اور دوسرا ان کے ہاں۔ بیگم حیدری اپنے وجدان کی بدولت ہم مردوں کی نسبت جن کا سرمایہ بے جان تجزیاتی استدلال ہے، بہتر معاملہ فہم ہیں۔

اب اتنا کرم فرمائیے کہ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں میری طرف سے معذرت پیش کیجیے۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب کے تار کے جواب میں اس خط کا، جو میں نے انہیں لکھا تھا، کیا حشر ہوا؟ شومی قسمت سے میری افتاد طبیعت ایسی ہے کہ میں نے اپنے دلی جذبات کے اظہار و اعلان کا عادی نہیں۔ میرے تعلق خاطر میں ایک گہرائی و گرم جوشی پائی جاتی ہے مگر دنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں ایک بے حس انسان ہوں۔ ازراہ کرم نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو یقین دلائیے کہ میں دائم ان کا نیاز مند ہوں۔ جب کبھی حالات نے مساعدت کی، میں انتہائی مسرت کے ساتھ جنجیرہ حاضر ہوں گا۔ میری رخصت اتفاقیہ صرف دس دن کی تھی، جو 28/کو ختم ہوگئی۔ میں 23/کو حیدرآباد سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ چار دن کا سفر ہے۔ واپسی میں مجھے اورنگ زیب کے مزار پر بھی حاضر ہونا تھا۔ حضرت عالم گیر پر میں ایک انتہائی وجد انگیز اور ولولہ خیز نظم لکھوں گا کہ اردو خوانوں کی نظر سے آج تک نہ گزری ہوگی۔

29/کی صبح کو لاہور پہنچا، سیدھا کالج جانا پڑا، وہاں سے کچہری۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ اندریں حالات میرے لیے جنجیرہ کا سفر کیوں کر ممکن تھا۔ اس بنا پر مجھے بادلِ نخواستہ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے دیدار کی لذت سے محروم ہونا پڑا۔ مجھے یقین ہے اس تصریح سے آپ کی

تسلی ہو جائے گی اور آپ میری طرف سے وکالت کریں گی۔ اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کا مجھے خود اعتراف ہے، لیکن فراموش گاری اور ریاکاری کا کبھی مرتکب نہیں ہوا ہوں، لیکن شاید جیسا کہ آپ خیال کرتی ہوں گی میں تو خود اپنے لیے بھی ایک معمہ ہوں جس کو سب جانتے ہیں ۔

وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں

میرے طور طریقے انوکھے ہو سکتے ہیں، لیکن اس دنیا میں ایسوں کی کیا کمی ہے جن کے اطوار مجھ سے بھی حیرت انگیز ہوں۔ موقع ہی انسان کی اصل فطرت کا امتحان ہے اگر کبھی وقت آیا تو میں یقیناً آپ کو دکھا دوں گا کہ مجھے اپنے احباب سے کس قدر تعلق خاطر ہے اور ان کے لیے کس قدر دل سوزی مجھ میں پائی جاتی ہے۔ زندگی کسے پیاری نہیں اور کیوں نہ ہو، لیکن اپنے آپ میں اس قدر قوت ضرور پاتا ہوں کہ جب ضرورت پڑے اسے دوسروں پر نثار کر دوں۔ فراموش گاری، ریاکاری کو اشارۃً و کنایۃً بھی مجھ سے منسوب نہ کیجیے گا کہ اس سے میری روح کو اذیت ہوتی ہے۔ میری فطرت سے متعلق آپ کی ناواقفیت پر لرز اٹھتا ہوں۔ کاش میں اپنا باطن آپ پر عیاں کر سکتا۔ تاکہ میری روح پر فراموش گاری کا جو حجاب آپ کو نظر آتا ہے، دور ہو جاتا۔

براہ کرم اس ناگزیر فرد گذاشت کے لیے میری طرف سے ان کی خدمت میں معذرت پیش کیجیے اور مجھے فوری طور پر مطلع کیجیے کہ میری تصریح اُن کے نزدیک قابلِ قبول ثابت ہوئی یا نہیں۔

دائم آپ کا
محمد اقبال

14.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ☆ خطوط کا تعلق سیدھے طور پر انسان کی ذاتیات ہوتا ہے۔ خطوط سے انسان کی سیرت و شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔
- ☆ مکتوب ایک تحریر ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے صاف و شفاف آئینے کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جس میں مکتوب نگار کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہیں۔
- ☆ علامہ اقبال کی اردو نثر کا بڑا سرمایہ ان کے خطوط ہیں۔ اقبال کا دائرہ احباب بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں، عالموں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھے ہیں۔ اب تک ان کے لکھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط دستیاب ہو چکے ہیں۔
- ☆ کلیاتِ مکاتیب اقبال کے مرتب ''سید مظفر حسین برنی'' کے مطابق علامہ اقبال کا پہلا خط (جو اب تک دریافت ہوا ہے) مولانا احسن مارہروی کے نام ہے، جو انہوں نے 28 رفروری 1899ء کو لکھا تھا۔
- ☆ علامہ اقبال کے دس پندرہ خطوط سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب ''اتالیق خطوط نویسی'' میں شائع کیے تھے۔
- ☆ سید مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے تمام خطوط کو ''کلیاتِ مکاتیب اقبال'' کے نام سے چار جلدوں (مع حواشی و تعلیقات) میں مرتب کیا ہے۔
- ☆ کلیاتِ مکاتیب اقبال کی چار جلدوں کے علاوہ پانچویں جلد بھی ہے۔ یہ جلد علامہ اقبال کے انگریزی خطوط پر مشتمل ہے۔ اس جلد

میں شامل تمام خطوط کا اردو ترجمہ کلیاتِ مکاتیب اقبال کی اول تا چہارم جلدوں میں بہ اعتبار تاریخ درج کیا گیا ہے۔ اس جلد میں انگریزی کے اصل (متن) خطوط کو جمع کر دیا گیا ہے۔

☆ علامہ اقبال کی سیرت و شخصیت کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان کی شاعری سے کہیں زیادہ ان کی نثر بالخصوص ان کے خطوط کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ علامہ اقبال کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ حق بات کو بغیر کسی خوف کو خطر کے کہہ جاتے تھے۔

☆ علامہ ایک حساس ذہن و فکر کے مالک تھے۔ انہیں سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ اقبال ہندوستان کے صورت حال سے بہت ہی زیادہ خوف زدہ تھے، پریشان تھے اور ہندوستان کے مستقبل کو لے کر خاصا مایوس بھی تھے۔

14.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
فلسفہ	:	علم وحکمت، ایک علم جس سے انسان میں سوچنے اور بحث کرنے کا مادہ بڑھتا ہے
مشاہیر	:	مشہور اشخاص، بزرگ اور نامور لوگ
رجحانات	:	توجہ، میلان
تعلیقات	:	حاشیے کی وضاحت
تنوع	:	رنگا رنگی، مختلف اقسام کا پایا جانا
فقہی	:	فقہ کا، شرعی احکام سے و مسائل سے متعلق
صحیفہ	:	رسالہ، کتاب بالخصوص الہامی کتاب
صداقت	:	سچائی، ثبوت، راست بازی
اتالیق	:	معلم، استاد
تصحیح	:	درست کرنا، غلطی دور کرنا
اشد	:	بہت زیادہ، نہایت سخت
شرمندۂ تعبیر	:	کسی ارادے، خیال، منصوبے یا خواہش کا پورا ہونا
کماحقہٗ	:	بخوبی، جیسا کہ اس کا حق ہے

14.6 نمونۂ امتحانی سوالات

14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال نے پہلا خط کسے لکھا تھا؟

2۔ اقبال نے پہلا خط کب لکھا تھا؟

3۔ اقبال کے خطوط کو کس نے سب سے پہلے اپنی کتاب میں شامل کیا تھا؟

4۔ کلیات مکاتیب اقبال کی کل کتنی جلدیں ہیں؟

5۔ کلیات مکاتیب اقبال کو کس نے مرتب کیا؟

6۔ ''شادوا قبال'' کس نے مرتب کیا؟

7۔ ''اتالیق خطوط نویسی'' کس کی کتاب ہے؟

8۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال کی پہلی جلد پہلی مرتبہ کب شائع ہوئی؟

9۔ کلیات مکاتیب (چاروں جلد) میں جملہ کتنے خطوط شامل ہیں؟

10۔ ''خطوط اقبال'' کا مرتب کون ہے؟

14.6.1 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خطوط اقبال کی روشنی میں اقبال کے مذہبی افکار پر روشنی ڈالیے۔

2۔ خطوط اقبال کی روشنی میں اقبال کی علمی و ادبی فکر کو واضح کیجیے۔

3۔ اقبال کے خطوط میں فلسفۂ خودی کی نشاندہی کیجیے۔

4۔ اقبال کے خطوط میں سیاسی نظریات پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ خطوط اقبال کے طرز تحریر کو بیان کیجیے۔

14.6.1 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خطوط اقبال کا فکری و فنی مطالعہ پیش کیجیے۔

2۔ خطوط اقبال کی روشنی میں اقبال کی سیرت و شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ خطوط اقبال کی روشنی میں اقبال کی زبان و بیان پر ایک مضمون لکھیے۔

14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال	مرتبہ: سید مظفر حسین برنی (چار جلدیں)
2۔ روح مکاتیب اقبال	مرتب: عبداللہ قریشی
3۔ اشاریۂ مکاتیب اقبال	مرتبہ: صابر کلوروی
4۔ اقبال: ایک مطالعہ	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
5۔ اقبال کے سیاسی افکار	ظفر اقبال

اکائی15: خطباتِ اقبال کا موضوعاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

15.0		تمہید
15.1		مقاصد
15.2		خطبات اقبال کا موضوعاتی مطالعہ
	15.2.1	علم اور مذہبی مشاہدات
	15.2.2	مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار
	15.2.3	ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا
	15.2.4	خودی، جبر وقدر، حیات بعد الموت
	15.2.5	اسلامی ثقافت کی روح
	15.2.6	الاجتہاد فی الاسلام (اسلام میں اجتہاد)
	15.2.7	کیا مذہب کا امکان ہے؟
15.3		خطبہ کے اقتباسات برائے مطالعہ
15.4		اکتسابی نتائج
15.5		کلیدی الفاظ
15.6		نمونہ امتحانی سوالات
	15.6.1	معروضی جوابات کے حامل سولات
	15.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	15.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
15.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

علامہ اقبال کا شمار اردو زبان وادب میں بحیثیت شاعر، مفکر، مترجم، متکلم، فلسفی اور مدبر کے طور پر صفِ اول کے قدآور اور صاحبِ اسلوب ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں چار بڑے اور عظیم ادیب وشاعر گذرے ہیں۔ 1 میر تقی میرؔ، 2۔ غالبؔ، 3۔ انیسؔ، 4۔ اقبالؔ۔ لان جائینس (Longinus) نے کہا ہے کہ شاعری میں عظمت وترفع پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بلند خیالات، نفیس جذبات، عمدہ صنائع و

بدائع اور الفاظ کی مناسب ترتیب و تنظیم وغیرہ ہونی چاہیئے۔لان جائی نس کے بنائے ہوئے اصول وقوانین کی روشنی میں جب ہم مفکر اسلام،شاعرِ انسانیت علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری مذکورہ اوصاف کی حامل ہے۔

زیرِ نظر اکائی علامہ اقبال کے خطبات پر مشتمل ہے جس میں ہم اقبال کے خطبات کا موضوعاتی مطالعہ پیش کریں گے۔''تشکیلِ جدید الہیات اسلامیہ''اقبالؔ کے خطبات کا مجموعہ ہے۔یہ کتاب پہلی مرتبہ 1930ء شائع ہوئی تھی۔یہ کتاب اپنی اولین اشاعت میں چھ خطبات پر مشتمل تھی بعد میں ایک لکچر کا اضافہ کیا گیا۔یہ خطبات انگریزی میں **"The Reconstruction of ReligiousThoughts in Islam"** نام سے شائع ہوئے۔اصل خطبے انگریزی زبان میں ہیں جس کا اردو میں ترجمہ''تشکیلِ جدید الہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے سید نذیر نیازی نے کیا ہے۔جسے خطبات اقبال کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ان خطبات میں علامہ اقبال نے اسلام کی فلسفیانہ روایات،کلام اسلامی اور علوم انسانی کے مختلف شعبوں میں ارتقا اور مسلمانوں کے مذہبی فلسفہ کی جدید تشکیل کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔

ہم اس اکائی میں علامہ اقبال کے انہیں خطبات کا موضوعاتی مطالعہ پیش کریں گے اور ان کے خطبات کی اختصار کے ساتھ تشریح و توضیح بیان کریں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ علامہ اقبال کے خطبات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔
- ☆ علامہ اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا کے تشکیلی عناصر کو بیان کر سکیں۔
- ☆ خطباتِ اقبال کے مباحث سے کما حقہ آگاہی حاصل کر سکیں۔
- ☆ خطبات کی روشنی میں اقبال کی فکری،سیاسی و مذہبی بصیرت کا ادراک کر سکیں۔
- ☆ خطبات کے تناظر میں اسلامی فلسفے کی اساس کو سمجھ سکیں۔
- ☆ اقبال نے خطبات میں جو کائنات کی حقیقت کے متعلق بیان کیا ہے اس سے باخبر ہو سکیں۔

15.2 خطبات اقبال کا موضوعاتی مطالعہ

15.2.1: خطبہ اوّل: علم اور مذہبی مشاہدات(knowledge and Religious Experience)

اس خطبہ کے آغاز میں علامہ اقبال نے تمہید کے طور پر تین سوالات قائم کیے ہیں،پھر خود ہی ان سوالات کے جواب دیتے ہوئے کائنات کی حقیقت بیان کی ہے۔حقائق کائنات کے متعلق مذہب اور شاعری کے رویے کو بیان کیا ہے پھر انسان،خدا اور اس کائنات کے باہمی ارتباط کا ذکر کیا ہے۔یہ تمام باتیں علامہ اقبال نے قرآن و اسلامی نکتۂ نظر سے بتائیں ہیں۔خطبے کی ابتدائی سطور میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا ہے؟ کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں مقام کیا ہے؟ یہ سوالات ہیں جو مذہب،فلسفہ اور اعلیٰ شاعری میں مشترک ہیں۔''

ان سوالات کے جواب کے علاوہ انہوں نے مذہب اور عقل کی صداقتوں کا ذکر کیا ہے۔ان کے مطابق عقل اور مذہب کا رشتہ لازمی ہے اور اسلام کی فطرت میں عقلیت کے عناصر موجود ہیں۔ان کے مطابق حقائق کی بازیافت ضروری ہے۔اب سوال یہ ہے کہ فلسفہ اور عقل کی روشنی میں حقائق کی بازیافت ہوسکتی ہے یا مذہب کی۔کیوں کہ مذہب عقلی دلائل کو خارج کرتا ہے۔مذہب کل کی حیثیت رکھتا ہے اور بقول اقبال فلسفہ کا دخول مذہب میں مذہبی اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ عقلی، عقلِ محض سے کائنات کے حقائق کو دریافت نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد علامہ اقبال نے کائنات کے ارتباط اور اس کی ماہئیت کو قرآن کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں:

''دین وایمان کو عقل کی تلاش میں دیکھنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان پر فلسفے اور عقل کے تفوق کو تسلیم کرلیا جائے۔''

اس کے بعد علامہ اقبال نے وجدان اور عقل کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ:

''وجدان حقیقت الحقائق کے ابدی اور باطنی پہلو پر نظر رکھتا ہے جب کہ عقل اس کے برعکس خارجی اور عارضی پہلو کو مدنظر رکھتی ہے۔''

یعنی انہوں نے عقل و وجدان اور فکر وایمان کو ایک دوسرے کا معاون قرار دیا ہے۔

علامہ اقبال نے یونانی فلسفہ اور اسلامی نظریات کے فرق کو بیان کیا ہے ان کا خیال ہے کہ یونانی فلسفے کے برعکس قرآن نے نہ صرف انسان کے مطالعہ کی بات کی بلکہ خارجی کائنات کے مطالعے پر بھی زور دیا ہے۔

علامہ اقبال نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے فلسفہ کو ترک کر دیا اور عقل کو درکنار کر کے وجدان کی پناہ میں آ گئے اور تصوف اختیار کرلیا۔یہ لوگ اشاعرہ کے برعکس تھے جنہوں نے اسلام کے اصول کو یونانی فلسفہ جدلیات کی بنا سمجھتے تھے۔متصوفانہ تجربات نے اس پر عقل وفکر کی محدودیت کا راز آشکار کیا۔اس لیے اس نے عقل اور وجدان کی تعریف کو درست نہیں سمجھا۔علامہ اقبال لکھتے ہیں:

''غزالی اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا کہ عقل اور وجدان آپس میں مربوط ہیں۔''

آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ایک دور تھا کہ جب یورپ اسلامی تعلیم سے متاثر تھا مسلمانوں نے انہیں تہذیب وتمدن سے روشناس بھی کرایا لیکن پچھلی پانچ صدیوں سے جمود طاری ہوگیا ہے۔پہلے بھی لکھا ہے۔

''قرآن کی رو سے اس کائنات کی اصلیت کیا ہے جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں؟ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق محض دل لگی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ حقیقت پر مبنی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ کائنات اپنی ساخت کے لحاظ سے وسعت پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ کوئی تکمیل یافتہ حرکت اور غیر تغیر پذیر چیز نہیں۔قرآن گردش لیل ونہار کو خدا کی بڑی بڑی آیتوں میں شمار کرتا ہے۔اب یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ زبان الٰہی پر غور وخوض کر کے تسخیر فطرت کے لیے نئے نئے ذرائع معلوم کرے۔''

اقبال مذہب کو سائنسی قوانین کا مجموعہ نہیں تسلیم کرتے۔ان کی رائے میں مذہب اور سائنس کے درمیان اس وقت تک چپقلش پیدا ہوتی

ہے جب ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایک ہی قسم کی اشیا اور حقائق کی تعریفیں کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

''مذہب طبعیات یا کیمسٹری نہیں''

الطاف احمد اعظمی لکھتے ہیں:

''اقبال نے اپنے پہلے خطبے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ حقیقت مطلقہ کا ادراک عقلی استدلال کے ذریعہ ممکن نہیں کیوں کہ عقل حقیقت کو اجزا میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ادراکِ خدا کا واحد ذریعہ روحانی تجربہ ہے۔ وجود خدا کے سلسلے میں اس ذریعہ علم سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں ان کی صداقت کو عقلی معیار پر جانچا جا سکتا ہے۔ یہی اس خطبے کا مرکزی موضوع ہے۔

15.2.2: خطبہ دوم: مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار

The Philosophical Test of the Revolutions of Religious Experience

علامہ اقبال نے اس خطبہ میں تین اہم فلسفی اصول کے متعلق بیان کیا ہے اور پھر اس کی خامیوں کو بتایا ہے کہ محض ان اصولوں کی بنیاد پر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس خطبہ کو پہلے خطبے کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔ پہلے خطبے میں علامہ اقبال نے چند سوال اٹھائے تھے کہ حقیقت کیا ہے اور اس کا ادارک کیسے ہو؟ کائنات سے اس کا ربط کیا ہے؟ اور اس خطبے میں انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلسفے میں حقیقت کو کن دلائل سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں حقیقت کے ادراک کے لیے فلسفے میں تین اہم دلائل سے مدد لی جاتی ہے جو یہ ہیں،

ثباتی دلیل (Cosnological Argument) غائتی دلیل (Teleological Argument) وجودیاتی دلیل (Ontological Argument)۔ علامہ اقبال نے حقیقت کی تفہیم یا خدا کو جاننے کے لیے ان تینوں دلائل کو ناکافی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ثباتی دلیل کی خامی یہ ہے کہ خدا تک پہنچتے پہنچتے قانونِ تعلیل معطل ہو جاتا ہے۔

دوسری دلیل یعنی غایتی دلیل کی خامی یہ ہے کہ وہ صانع اور مصنوع کے تصور پر مبنی ہے۔ اس میں خدا خالق کے بجائے صانع عالم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات کی حیثیت ایک خام مواد کی ہے جس کے اندر خود اپنی تنظیم کی صلاحیت نہیں ہے۔ ایک لامحدود عقل والے خدا نے خارج سے اس خام مواد میں نظم و ترتیب اور حیات و جمال پیدا کیا ہے۔ یہ ایک میکانکی تصور خدا ہے جس سے اس کی خالقیت کی نفی ہوتی ہے۔

اقبال کی اس دلیل سے الطاف احمد اعظمی نے اتفاق نہیں کیا۔ ان کے نزدیک یہ نقد درست نہیں ہے اس کے جواب میں وہ چند سوال اٹھاتے ہیں اور پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً کائنات کی اشیاء میں جو حیرت انگیز نظم و ترتیب اور حسن و جمال ملتا ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ الطاف احمد اعظمی مزید رقمطراز ہیں:

> ''اقبال غایتی دلیل کے اس لیے منکر ہیں کہ اس سے خدا کو کائنات کے باہر موجود ماننا پڑتا ہے جب کہ ان کے خیال میں وہ کائنات کے اندر اور اس کی اصل و عین ہے اور اس سے باہر کسی چیز کا وجود نہیں ہے''۔ (خطبات اقبال، ایک مطالعہ از الطاف احمد اعظمی ص۔61)

علامہ اقبال نے تیسری دلیل وجودیاتی دلیل کو بھی خام قرار دیا۔ ان کے مطابق وہ چیزیں جس کا ہم تصور کرتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ خارج میں بھی ان کا وجود ہو۔ پھر کانٹ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ تصور تو وہمی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جیسے سونے کے پہاڑ کا تصور تو ممکن ہے لیکن

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس سے اس پہاڑ کا وجود لازم ہو جائے۔ یا یہ کہ جیب میں تین سو ڈالر کے تصور کرنے سے ڈالر نہیں آجاتے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

''اس دلیل کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں خدا کے وجود کو پہلے سے فرض کر لیا اور پھر اس تصور سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ فکری اعتبار سے تصور سے وجود کی طرف مراجعت ہونی چاہیے۔''

علامہ اقبال نے جس خیال پر اپنے استدلال کی بنا رکھی ہے وہ انائی (انا الحق) نظریہ ہے جو باعتبار اصل وحدۃ الوجود ہی کا نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وجودیاتی اور غایتی استدلال میں وزن پیدا ہو سکتا ہے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ انسان کی موجودہ حالت آخری حالت نہیں ہے اور وجود اور فکر اپنی آخری حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ انہوں نے مغربی سائنس دان فلسفی، حضرات کے علاوہ قرآن سے اپنے دلائل کی تائید کی ہے۔

اس کے بعد اقبال نے زندگی کو اساسی چیز قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسئلہ زماں کی بحث بھی اٹھائی ہے اور اسے خارجی چیز قرار دے کر اس پر اعتراض کیا اور اس کے مقابلے میں نفس کے وجود کو یقینی کہا کہ نفس کا وجود شک وشبہ سے بالاتر ہے کیوں کہ اس کا تعلق باطن سے ہے۔ نتیجتاً شعوری تجربہ کے ذریعہ حقیقت سے ہمارا براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے برگساں کے شعوری تجربے کا حوالہ دیا۔

علامہ اقبال کے مطابق زمان کی دو قسمیں ہیں ایک زمان مسلسل، دوسرا زمان غیر مسلسل۔ زمان غیر مسلسل کو انہوں نے حقیقت کی بازیافت کے لیے کارآمد کہا ہے کیوں کہ اس کا تعلق باطن سے ہے۔ مسئلہ زمان کی بحث وجود کی ماہئیت کی تفہیم ہے جو کہ بہت مشکل مسئلہ ہے۔

اس خطبہ میں علامہ اقبال نے خدا کے وجود یا حقیقت مطلقہ کی جو تعبیر پیش کی ہے اس سے مراد وحدۃ الوجود ہے۔ ان کے مطابق وہ خدا کو اس کائنات سے ماورا نہیں سمجھتے اور انائے مطلق ہی حقیقت کل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کہیں دور بیٹھا ایک اجنبی کی طرح کائنات کا نظارہ کرتا ہے۔ خدا کوئی خارج چیز نہیں ہے، وہ مزید کہتے ہیں:

> ''No doubt the immediate purpose of the Quran in this reflective observation of nature is to awaken in man the consciousness of that of which nature is regarded a symbol.''

اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے نزدیک فطرت کی حیثیت نشانی کی ہے کہ خدا کائنات کے باطن میں موجود ہے۔ ہم اس سے پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں قرآن مجید میں کہیں بھی مظاہر فطرت کو خدا کی نشانی نہیں کہا گیا ہے بلکہ کسی اضافت کے بغیر آیات کا لفظ استعمال کیا ہے۔

15.2.3: خطبہ۔سوم: ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا:

(The Concept of God and the meaning of Prayer)

اس میں اقبال نے فردیت اور محدودیت کے متعلق بات کی ہے کہ فرد ہونا محدودیت پر دلالت نہیں کرتا ہے اور خدا فرد کامل ہے اس کے لیے انہوں نے سورۂ اخلاص کا حوالہ دیا ہے ان کے اس نظریے پر بہت سے ناقدین نے اعتراض بھی کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اوصاف خدا

بیان کیے جو خلاقی (creativness) علم (knowledge) قدرت کاملہ (Omnipotence) اور سرمدیت (Eternity) ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ یہ کائنات خدا کا عمل تخلیق ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوا ہے اور مکمل ہونے کی طرف مسلسل گامزن ہے اور تخلیق کوئی ایسا مخصوص واقعہ نہیں ہے جو ماقبل اور مابعد رکھتا ہو اور خدا کو کائنات سے الگ غیر کی حیثیت سمجھنا بھی درست نہیں ہے کیوں کہ اس تصور سے کائنات اور خدا ایک دوسرے کے مقابل وجود بن جائیں گے۔

اس خطبے میں علامہ اقبال نے روح و نفس کی بحث کو بھی اٹھایا ہے اور مسئلہ زمان و مکان کو بھی اور وقت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنے کے لیے مسئلہ زمان و مکان کو بھی اٹھایا۔ وقت کو سمجھنے کے لیے اقبال کے مطابق:۔

''وقت کی ماہئیت کا صحیح ادراک اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنے شعوری تجربے کا نفسیاتی تجزیہ کریں۔''

خدا کی صفات کا ذکر جو علامہ اقبال نے کیا ہے اس پر الطاف احمد اجمل نے بعض دلائل پر اعتراض کیا ہے۔ مثلاً خلاق ہونے پر لکھا ہے۔

''خلاقی اپنی فطرت میں آزاد عمل رکھتی ہے۔ خدا کی خلاقی کوئی اندھا عمل نہیں ہے کہ اس کو اپنے گردوپیش کی خبر نہ ہو۔''

اسی طرح تصورِ علم کی خامی یہ ہے کہ اس میں علم اور تخلیق میں تفریق ہے۔ حالاں کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ علامہ اقبال صوفیا کے روحانی تجربوں کو اس اعتبار سے درست مانتے ہیں کہ نفس کی پوشیدہ قوتیں اسی کے ذریعہ منکشف ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی اصطلاحیں قدیم ہیں اور نئے ذہنوں کو ان میں کشش نظر نہیں آتی۔ وہ مزید رقم طراز ہیں:

''جدید دور کا انسان اپنے تجریدی طرز فکر کی وجہ سے خدا کا محسوس تجربہ چاہتا ہے اور یہ صرف عبادت کے ذریعہ ممکن ہے۔''

کائنات اور فطرت کے مظاہر پر غور و فکر بھی عبادت کا حصہ ہے۔

In fact prayer must be regarded as a necessary component to the intellectual activity of the observer of Nature."

ان کے مطابق عبادت کی روح اپنی ماہئیت میں معاشرتی ہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر مکمل عبادت ادا نہیں کی جا سکتی۔

اقبال نے اس خطبہ میں عبادت کے ساتھ سمت قبلہ کے متعلق بھی لکھا ہے۔ ان کے نزدیک سمت قبلہ نماز پڑھنے سے نمازیوں میں وحدت خدا کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

15.2.4: خطبہ چہارم: خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت:

(Human Ego - His freedom and Immortality)

یہ خطبہ نفس کی آزادی، اس کی بقا اور سرمدیت کے متعلق علامہ اقبال کے نظریات پر مبنی ہے۔ انہوں نے قرآن کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے اور کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ وہ Redemption کے تصور کے بھی منکر ہیں۔ انہوں نے انسانوں کے تین امتیازات کا ذکر بھی قرآن کے حوالے سے کیا ہے۔

1) انسان خدا کی ایک مخصوص اور منتخب مخلوق ہے۔

2) انسان اپنی تمام کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔

3) انسان صاحب اختیار ہے اور اس نے یہ اختیار اس میں موجود خطرات کے باوجود اختیار کیا ہے۔

اقبال نے علم کے تین ذرائع بیان کیے ہیں، تاریخ، فطرت اور نفس انسانی۔

صوفیائے کرام نے نفس انسانی کو بنیاد بنا کر وحدت کی تلاش شروع کی اور اناالحق کے نظریے کو مانا۔ انہیں روحانی تجربوں کی تکمیل منصور حلاج کے اناالحق کی صورت میں ہوئی۔ اقبال قدیم علم کلام کو انسانی نفس کی حقیقت کے ادراک کے لیے غیر مفید قرار دیتے ہیں ان کے مطابق زمانے کا عقلی مزاج بدل چکا ہے۔ اس لیے ہمیں جدید نفسیات اور فلسفہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پھر وہ مشہور مغربی فلسفی بریڈلے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''نفس اپنے ارتقا کے جس مرحلے میں ہے اس میں بلاشبہ کلی وحدت نظر نہیں آتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نفس میں وحدت کی طلب موجود ہے اور کلی وحدت (Perfect Unity) کی تشکیل کے لیے ابھی اسے مختلف النوع مراحل و عوالم سے گزرنا ہے۔''

علامہ اقبال نے نفس کی دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ پہلی خصوصیت ذہنی وحدت (Mental unity) اور دوسری خلوت (Privacy)۔

Mental Unity۔ یہ نفس ہی ہے جو ہماری شعوری حالتوں کو منظّم کر کے ایک وحدت میں لے آتا ہے۔

Privacy۔ اگر میں کسی چیز کی خواہش کرتا ہوں تو یہ میری تنہا خواہش ہے اور اس کی تکمیل میری ذاتی مسرت ہے نہ کہ کسی اور نفس کی۔

اقبال تصور روح کو نفسیاتی سے زیادہ مابعد الطبیعی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انا ایک ہادی و ناظم قوت ہے اور وہ'' من امر ربی'' کی تسلیم کرتے ہیں۔ اس خطبہ میں انہوں نے مسئلہ جبر پر بھی بات کی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''انسان کو جو زندگی ملی ہے وہ اعمال کے ذریعہ نفس کی ترقی و استحکام کے لیے ہے اور موت کی غرض اس بات کا امتحان ہے کہ کس انسان نے اپنے نفس کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ یعنی عمل صالح سے اس کا تزکیہ کر کے اس کو وہ مزید ترقی کے قابل بنایا یا عمل غیر صالح سے اس کی ترقی کے امکانات کو مسدود کر دیا۔''

اس خطبے میں جنت و جہنم کا بھی ذکر ہے اور اسے احوال (states) قرار دیتے ہیں نہ کہ مقامات (localities) اور اسے محض اظہار حقیقت کیا ہے نہ کہ ان کلی صورت گری۔ انہوں نے لکھا ہے:

''قرآن میں دوزخ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کے اوپر چڑھائی جائے گی۔ اس کا مفہوم ناکافی کے احساس سے پیدا ہونے والی تکلیف ہے اور جنت یعنی انتشار کی قوتوں پر غلبہ حاصل ہونے والی مسرت اور عدل کا تعلق ان کے نزدیک مجرموں سے اور قانون رحمت کا تعلق نیکو کاروں سے ہے۔ اس لیے جنت و جہنم دراصل ہمارے اعمال کے دو مختلف نتائج ہیں۔

15.2.5: خطبہ پنجم: اسلامی ثقافت کی روح (The Spirit of Muslim Culture)

اس خطبہ کا آغاز علامہ اقبال نے مشہور صوفی عبدالقدوس گنگوہی کے الفاظ سے کیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ محمدؐ آسمان کی بلندیوں تک گئے اور واپس آ گئے، میں اگر گیا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ اس پر اقبال لکھتے ہیں کہ ایک پیغمبر اور صوفی کے شعوری تجربے کا یہی فرق ہے۔ پیغمبر روحانی تجربے کی انتہائی بلندیوں تک جانے کے باوجود واپس آتا ہے اور اس کی یہ واپسی تمام تر تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کا یہ پیغام انقلاب انگیز ہوتا ہے اور تاریخ کا رخ بدل دیتا ہے۔

اس خطبہ میں اقبال نے نبی اور ولی کے فرق، وحی کیا ہوتی ہے، ختم نبوت کے مسئلہ اور دیگر موضوعات پر بات کی ہے۔ ان کے نزدیک بقول الطاف احمد ولی اور نبی میں کوئی فرق نہیں۔ اقبال وحی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''وحی نباتات، حیوانات اور انسان سب کو ان کی ضرورت کے مطابق ملتی ہے اور ان میں جو فرق ہے وہ صرف درجے کا ہے۔''

اقبال وحی کو ایک باطنی چیز سمجھتے ہیں اس کے بعد وہ ختم نبوت کے متعلق بات کرتے ہیں:

> ''اسلام کا ظہور دراصل استغراقی عقل یعنی عقلی استدلال کے ظہور کا زمانہ تھا اور یہ اس بات کی واضح علامت تھی کہ اب ختم نبوت کا زمانہ آ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں غور و فکر اور تجربے پر بہت زور دیا گیا ہے اور فطرت اور تاریخ کو انسانی علم کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔''

اسلامی ثقافت کا بنیادی عنصر اقبال کے یہاں تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ مسلمان علم منطق سے متاثر ضرور ہوئے لیکن بہت جلد غیر مطمئن ہو گئے انہوں نے استقراء کے ذریعہ معتبر استدلال پیش کیا اور اسی استقرائی (Induction) خیالات نے مشاہدہ اور تجربات کی بنا ڈالی۔

اقبال کے مطابق علم تاریخ کے اصول بھی ملتے ہیں۔ علم تاریخ کا ایک اصول مستنبط ہوا جس کے لیے انہوں نے سورۂ حجرات کی آیت نمبر 6 کا حوالہ دیا (اے ایمان والو اگر کوئی برا آدمی تمہارے پاس کوئی اہم خبر لائے تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو)۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ تاریخ کو سائنس کا درجہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کو عملی استدلال کی روشنی اور وسیع تجربات کے تناظر میں دیکھیں۔ اس حوالے سے اقبال نے دو اہم تصورات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا تصور نوع انسانی کی وحدت اور دوسرا تصور زندگی اور وقت کی صحیح تفہیم اور ان کی بنیاد پر اسلامی کلچر و ثقافت اور ختم نبوت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

15.2.6: خطبہ ششم: الاجتہاد فی الاسلام (اسلام میں اجتہاد)

(The Principle of Movemnet in the Structure of Islam)

اس خطبے میں علامہ اقبال نے مسئلہ اجتہاد پر بات کی ہے۔ لیکن اس سے پہلے انہوں نے توحید اور اتحاد عالم پر بات کی۔

> ''اسلامی ثقافت کی روح توحید ہے اور اس نے اتحاد عالم کی دعوت بھی اسی بنیاد پر دی ہے۔ اسلام کے سیاسی، سماجی، اقتصادی ادراک کی تشکیل میں تصور توحید کے عملی مظاہر ہیں۔ اسی کے ذریعہ توحید کا تصور عملی صورت اختیار کرتا ہے اور نسل انسانی کی عقلی اور جذباتی زندگی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔''

اور پھر توحید اور شرک کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''توحید خدا کے ساتھ مکمل اور خالص وفاداری کے اظہار کا نام ہے اور جس وقت یہ وفاداری خالص نہیں رہتی اور اس میں دوسرے لوگ شریک ہو جاتے ہیں تو یہی شرک ہے۔''

مغرب و مشرق کی ناکامی کی وجہ اقبال نے یہ بتائی ہے کہ انہوں نے سرے سے داعی اصول کے وجود کا انکار کیا۔ مشرق میں خاص کر مسلمانوں کی فکری جمود کی وجہ تغیر و تبدل سے مکمل طور پر اجتناب ہے جب کہ اسلامی فطرت اس جامد طرز فکر کے خلاف ہے۔ اس کی فطرت میں حرکت و تغیر ہے اور اصول حرکت جس پر اس کے تغیرات کی بنیاد ہے وہ اجتہاد ہے۔ اقبال کے مطابق اجتہاد کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں کسی ایک شخص یا دبستان کی پیروی کے بجائے اس طرح آزادانہ قانون سازی ہو جس طرح فقہائے اربعہ نے واضح کیا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی فقہی دبستان کی حدود میں رہتے ہوئے اجتہاد کیا جائے ایسے کو مجتہد کہتے ہیں اور تیسری شکل یہ ہے کہ کسی فقہی دبستان سے وابستگی کے ساتھ صرف ان مسائل میں اجتہاد کیا جائے جن کے بارے میں فقہی دبستان کے امام نے کوئی رائے نہ دی ہو۔ اس کو مجتہد مقلد کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اقبال نے مسلمانوں کے فکری جمود کے اسباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی اجتہاد کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسلامی ماخذات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اسلامی قانون کا پہلا ماخذ قرآن ہے جسے بنیادی ماخذ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرا ماخذ حدیث ہے، تیسرا ماخذ اجماع ہے اور چوتھا ماخذ قیاس (Reason) ہے جس کا اقبال نے اس خطبہ میں جائزہ لیا ہے۔

اقبال زندگی کا حرکی تصور رکھتے تھے جو قرآن سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اس کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دور (زمانہ انحطاط) میں تقلید ہی بہتر ہے۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:

نقش بر دل معنی توحید کن
چارہ ی کار خودار تقلید کن
اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہاد عالمان کم نظر
اقتدار بر رفتگان محفوظ تر

15.2.7: خطبہ ہفتم: کیا مذہب کا امکان ہے؟ (Is Religion possible)

اس خطبے میں علامہ اقبال نے مذہبی امکانات کے متعلق بحث کی ہے۔ انہوں نے مذہبی زندگی کے تین ادوار یا مراحل کا ذکر کیا ہے۔ پہلا مرحلہ اعتقاد (faith) ہے جس میں ایک مذہبی آدمی احکامات مذہب کا بے چوں و چرا پابند ہوتا ہے لیکن اسے احکامات کی غرض و غایت کا علم نہیں ہوتا۔

مذہبی زندگی کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں ضابطۂ عمل کی شعوری پابندی ہوتی ہے۔ آدمی نہ صرف احکام کی پابندی کرتا ہے بلکہ اسے ٹھیک سے سمجھتا بھی ہے اور اس کے مصدر و ماخذ کو بھی عقلی طور پر جانتا ہے۔ تیسرا مرحلہ (psychology) کا ہے جس میں مذہبی زندگی حقیقت مطلقہ سے براہ راست ہم آہنگ ہونا چاہتی ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں فرد کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ قانون کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا

ہے بلکہ وہ شعور کی گہرائی میں قانون کے اصل ماخذ کا ادراک کر لیتا ہے اور یہ تیسرا مرحلہ ہی حقیقی معنوں میں اقبال کے نزدیک مذہب کے اطلاق کا اہل ہے۔اسی مرحلے کے متعلق اقبال نے اس خطبے میں بحث کی ہے۔اس امکانات کے حوالے سے انہوں نے روحانی تجربے کی محدودیت اور فطری تقاضوں کا بھی ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''روحانی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت انا کی دریافت ہے جو ایک فرد ہے اور اس کے باطن میں مستور ہے۔حقیقت مطلقہ سے تعلق قائم ہونے کے بعد نفس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ ایک بے مثل چیز ہے اور اس کی مابعد الطبعیاتی حیثیت کا راز بھی اس پر آشکار ہوجاتا ہے۔وہ اس رمز سے بھی آگاہ ہوجاتا ہے کہ اس کی موجودہ حالت میں فرق واضافہ ممکن ہے۔''

اقبال فطرت کی تفہیم کے لیے کسی ایک مخصوص صورت پر اصرار درست نہیں مانتے ان کا خیال ہے کہ فطرت کا تجربہ ومطالعہ ہر تہذیب میں موجود ہے۔وہ مذہب اور سائنس کے درمیان ہم آہنگی کا تصور پیش کرتے ہیں۔لیکن وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ سائنس نے بہت سے مسائل کو حل کیا ہے تو بہت سے نئے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ طبعی سائنس نے مادی فطرت کی قوتوں پر غیر معمولی غلبہ عطا کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فطرت کی اس تسخیر نے انسان کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیا ہے۔وہ اپنے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ موجودہ تہذیب بھی اپنی تاریخ کے شدید بحران سے دوچار ہے۔اس سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے مذہبی مراجعت۔ یہاں پر اقبال کی مراد مذہب کی بلند ترین صورت ہے نہ کہ اندھا عقیدہ (Dogma) ہے نہ ہی رسم ورواج کا کوئی مرکب روپ۔اقبال نے اس ذیل میں قرآن اور مغربی واسلامی فلاسفر کی تائید وتنقید کی صورت میں استدلال کیا ہے۔

15.3 خطبہ کے اقتباسات برائے مطالعہ

پانچواں خطبہ: اسلامی ثقافت کی روح

(i) ''محمد عربی بر فلک الافلاک رفت وباز آمد۔واللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدمے''

یہ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے الفاظ ہیں۔جن کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرۂ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کر لیتے ہیں جو شعور ولایت اور شعور نبوت میں پایا جاتا ہے۔صوفی نہیں چاہتا واردات اتحاد میں اسے جو لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے اسے چھوڑ کر واپس آئے،لیکن اگر آئے بھی، جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس سے نوع انسان کے لیے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔برعکس اس کے، نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے۔وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رو میں داخل ہوجائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ وتصرف سے جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔صوفی کے لیے لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے لیکن انبیا کے لیے اس کا مطلب ہے ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جو دنیا کو زیر وزبر کرسکتی ہیں اور جن سے کام لیا جائے تو جہان انسانی دگرگوں ہوجاتا ہے۔لہٰذا انبیا کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان واردات کو ایک زندہ اور عالم گیر قوت میں بدل دیں۔گویا ان کی باز آمد ایک طرح کا عملی امتحان ہے خود ان کے مشاہدات اور واردات کی قدر وقیمت کا۔اسے ایک تخلیقی عمل کہیے جن میں انبیاء کا ارادہ اگر ایک طرف اپنے آپ کو جانچتا اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرتا ہے تو دوسری جانب حقائق کی اس دنیا کا جس میں خارجاً

وہ ان کو چاہتا ہے مشہود و متشکل دیکھ لے۔ پھر جب اس عالم میں جو ایک بے حس اور اثر ناپذیر ہیولیٰ کی طرح ان کے سامنے ہوتا ہے ان کی ذات نفوذ کر جاتی ہے تو ان پر یہی حقیقت منکشف نہیں ہوتی کہ ان کی ہستی کے معنی خود ان کے لیے کیا ہیں، وہ اسے دوسروں پر بے نقاب کرتے اور چشم تاریخ کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اس کا مشاہدہ کر لے۔ لہٰذا انبیاء کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہم یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے۔ علیٰ ہذا یہ کہ تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جس کا ظہور ان کی دعوت سے ہوا۔ چناں چہ اس خطبے میں بھی ہمارے پیش نظر یہی امر ہے۔ یہ نہیں کہ عالم اسلام نے علم و حکمت کی جو خدمات سرانجام دیں ان کی تفصیل بیان کی جائے۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنی نگاہیں ان تصورات پر رکھیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت میں کارفرما رہے۔ یوں ہی ہم اس سلسلۂ افکار کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں جس کی اس طرح ابتدا ہوئی ہے۔ یوں ہی ہمیں اس روح کی تھوڑی بہت جھلک بھی نظر آئے گی جو ان میں کام کرتی رہی، لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی بحث میں آگے بڑھیں ضروری ہے کہ اسلام کے ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی تصور میرا مطلب ہے عقیدہ ختم نبوت کی ثقافتی قدر و قیمت پورے طور پر ذہن نشین کر لی جائے۔

ایک اعتبار سے نبوت کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جاتیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی، یا از سر نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے۔ تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔ وہ ماضی کو مٹاتا اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے۔ لیکن اپنی ہستی اور وجود کی اساس سے انسان کا یہ تعلق کچھ اسی لیے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید نے لفظ وحی کا استعمال بھی ان معنوں میں کیا ہے ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسے زندگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جوں جوں اس کا گزر مختلف مراحل سے ہوتا یا یوں کہیے کہ جیسے جیسے وہ ارتقا اور نشو و نما حاصل کرتی ہے ویسے ہی اس کی ماہیت اور نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ کسی پودے کا زمین کی پہنائیوں میں آزادانہ سر نکالنا، یا کسی حیوان میں ایک نئے ماحول کے مطابق کسی نئے عضو کا نشو و نما، یا انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نور اور روشنی حاصل کرنا، یہ سب وحی کی مختلف شکلیں ہیں جو اس لیے بدلتی چلی گئیں کہ اس کا تعلق جس فرد سے تھا وہ بشر نوع میں اس کا شمار ہوتا تھا اس کی مخصوص ضروریات کچھ اور تھیں۔ اب بنی نوع انسان کے عالم صغر سنی میں ایسا بھی ہوا کہ اس کی نفسی توانائی کی نشو و نما شعور کی وہ صورت اختیار کر لے جسے ہم نے شعور نبوت سے تعبیر کیا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسندیدگی کیا۔ انہیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہ اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی یہ نہیں کہ انہیں اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے۔ شعور نبوت کو گویا کفایت فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے۔ لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی اور قوت تنقید بیدار ہوئی تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اولین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا ان کا ظہور اور نشو و نما رک جائے۔ انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کی تسخیر کر سکتا ہے تو صرف عقل استقرائی کی بدولت۔ لیکن عقل استقرائی اس کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے۔ جسے ایک دفعہ حاصل کر لیا جائے تو پھر مصلحت اسی میں ہے کہ حصول علم کے اور جتنے بھی طریق ہیں ان پر ہر پہلو سے بندشیں عاید کر دی جائیں تا کہ مستحکم کیا جائے تو صرف عقل استقرائی کو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے قدیم نے بڑے بڑے عظیم نظامات فلسفہ پیدا کیے۔ مگر یہ اس وقت جب انسان اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا اور اس پر ایما اور اشارے کا غلبہ تھا۔ لہٰذا ماضی کے یہ فلسفیانہ نظامات مجرد فکر کی بنا پر مرتب

ہوئے لیکن مجرد فکر کی بنا پر ہم زیادہ سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں۔ تو یہ کہ مذہبی عقائد اور مذہبی روایات میں تھوڑی بہت ربط و ترتیب پیدا کر دیں۔ رہا یہ امر کہ عملی زندگی میں ہمیں جن احوال سے فی الواقع گزر کرنا پڑتا ہے ان پر قابو حاصل کیا جائے تو کیسے، اس کا فیصلہ فکر مجرد کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلامؐ کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے۔ لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا۔ استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چوں کہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل ہو گی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا، یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا، یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے کیوں کہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیات انسانی اب واردات باطن سے جو باعتبار نوعیت انبیاء کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے ''آفاق و انفس'' دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اس کا ارشاد ہے کہ آیات الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کما حقہ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصول علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ تصور خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے۔ جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ واردات باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدہ یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چوں کہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعوؤں کا قلع قمع ہو جاتا ہے اور جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں بعینہٖ جس طرح اسلامی کلمہ کے جزو اول نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات کا مطالعہ نگاہ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے۔ جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور غیر طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لیے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔ آنحضرتؐ کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ چناں چہ ابن صیاد کے احوال نفسی کو دیکھتے ہوئے آپ نے جو روش اختیار کی وہ اس کا بین ثبوت ہے۔ اسلامی تصوف بھی دراصل صوفیانہ مشاہدات ہی کے نظم و ارتباط کی ایک کوشش ہے۔ گو یہ صرف ابن خلدون تھا جس نے اس سلسلے میں خالص علمی نہج پر قدم اٹھایا۔

لیکن مشاہدات باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا۔ قرآن پاک کے نزدیک اس کے دو سرچشمے اور ہیں۔ ایک عالم فطرت، دوسرا عالم تاریخ، جن سے استفادہ کرنے میں عالم اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر۔ یہ سایوں کا امتداد، یہ اختلاف لیل و نہار۔ یہ رنگ اور زبان کا فرق۔ اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد و شد۔ حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ

بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور وتفکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے۔ کیوں کہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی۔ جب مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے، وہ منتاہی ہے اور اضافہ پذیر تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر جس کا اپنی حیات ذہنی کی ابتدا میں انہوں نے بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا تھا، اتر آئے۔ شروع شروع میں تو انہیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفۂ یونان کے منافی ہے اور اس لیے حکمت یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا۔ لیکن قرآن مجید کا زور چوں کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کی بجائے نظریات پر، لہٰذا ظاہر ہے یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب وثقافت کی حقیقی روح برسرکار آئی، حتیٰ کہ تہذیب وجدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھیے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہون منت ہے۔

(ii) ابن مسکویہ کہتا ہے نباتات کی زندگی پر نظر ڈالیے تو ارتقا کے اولین مراحل میں نہ تو ان کی پیدائش اور نمو کے لیے بیج کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اپنی نوع کے تسلسل کے لیے انہیں اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر ہم نباتات کی زندگی اور معدنیات میں یوں ہی فرق کریں گے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں نباتات کو تھوڑی بہت حرکت کی طاقت مل جاتی ہے اور پھر اعلیٰ تر انواع کی صورت میں برابر بڑھتی رہتی ہے، تا آنکہ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ پودے شاخیں نکالتے اور بچوں کے ذریعے اپنی نوع کا تسلسل قائم رکھتے ہیں۔ لیکن پھر حرکت کی اس قوت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ درخت پیدا ہو جاتے ہیں ان کے تنے ہوتے ہیں اور وہ برگ وبار لاتے ہیں۔ اب اس سے بھی آگے بڑھیے تو نباتات کے ارتقا کا آئندہ مرحلہ وہ ہے جس میں ایسی انواع کا ظہور ہوگا جن کے لیے زیادہ بہتر زمین اور زیادہ بہتر آب وہوا کی ضرورت ہوگی۔ انگور اور کھجور ارتقائے نباتی کی آخری منزل ہیں جس کے ڈانڈے گویا حیوانی زندگی سے جا ملتے ہیں۔ چناں چہ کھجور کے اندر تو جنسی اختلاف بھی صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے، کیوں کہ کھجور میں جڑوں اور ریشوں کے علاوہ وہ شئے بھی نشوونما پا لیتی ہے جس کا وظیفہ کچھ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے دماغ کا اور جس پر گویا اس کی سلامتی اور حفظ وبقا کا دارومدار ہے۔ یہ نباتات کی زندگی میں ارتقا کا آخری درجہ ہے یا یوں کہیے کہ حیوانی زندگی کی تمہید حیوانی زندگی کا پہلا قدم زمین پیوستگی سے آزادگی ہے جسے گویا شعوری حرکت کی ابتدا سے تعبیر کرنا چاہیے اسے حیوانی زندگی کا آغاز کہیے، جس میں اول حس لامسہ اور بالآخر حس باصرہ کا نشوونما ہوتا ہے۔ مگر پھر جب حواس نشوونما حاصل کر لیتے ہیں تو حیوانات نقل وحرکت میں آزاد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حشرات الارض، رینگنے والے جانور، چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں، چوپایوں میں گھوڑا حیوانیت گویا انسانیت کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بندر باعتبار ارتقا انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہیں۔ ارتقا کے مزید مراحل میں کچھ اور عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے پہلو بہ پہلو انسان کی قوت تمیز اور روحانیت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے تا آنکہ وحشت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور انسان تہذیب وتمدن کی دنیا میں قدم رکھ دیتا ہے۔

لیکن یہ نفسیات مذہب ہے جس میں ہم تقریباً اسی مرحلے پر جا پہنچتے ہیں جس میں زمان ومکان کے مسئلہ پر کچھ ویسے ہی انداز میں بحث کی گئی تھی جیسے عصر حاضر میں اور جس کے لیے ہمیں عراقی اور خواجہ محمد پارسا سے رجوع کرنا چاہیے۔ عراقی نے مراتب زمانی کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔ یہاں مکان کے باب میں ہم اس کے خیالات کا لب لباب پیش کریں گے۔

عراقی کے نزدیک مکان کی موجودگی تو ذات الٰہیہ کی نسبت سے بھی ناگزیر ہے۔ چناں چہ وہ اس کا استدلال آیات ذیل سے کرتا ہے:

''أَلَمْ تَرَى أَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلاخَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلاأَدْنَى مِنْ ذَلِكَ وَلاأَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا''(۵۸۔۷)

''وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلاتَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلافِي السَّمَاءِ وَلاأَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلاأَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ''(۱۶:۰)

''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ''(۱۶:۵۰)

لیکن یاد رکھنا چاہیے قرب، اتصال اور باہمد گر افتراق وہ الفاظ ہیں جن کا اطلاق جس طرح مادی افہام پر کیا جاتا ہے ذات الٰہیہ پر نہیں ہوسکتا۔ حیات الٰہیہ کا تعلق ساری کائنات سے ہے، بعینہ جیسے روح کا بدن سے۔ روح بدن کے اندر ہوتی ہے، نہ باہر، نہ اس سے متصل نہ منفصل۔ بایں ہمہ اس کا اتصال بدن کے ہر ذرے سے قائم ہے اور ہم اس کا تصور کر سکتے ہیں تو یوں ہی کہ کسی ایسے مکان کا وجود تسلیم کرلیں جو روح ایسی نازک اور لطیف شئے کے شایان شان ہو۔ لہٰذا حیات الٰہیہ کی نسبت سے بھی کسی نہ کسی مکان کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ گو ہمیں چاہیے کہ اس کی تعریف اس طرح کریں کہ اس سے ذات الٰہیہ کی مطلقیت میں کوئی فرق نہ آئے۔ اب مکان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق مادی اشیا سے ہے، دوسری جو غیر مادی اشیا سے متعلق ہے اور تیسری ذات الٰہیہ سے متعلق۔ لیکن پھر مادی اشیا کا مکان بھی تین قسموں پر منقسم ہے اول بڑے بڑے اجسام کا مکان جس میں ہم وسعت اور پہنائی کا اثبات کرتے ہیں اور جس میں حرکت کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مکان میں ہر جسم کی اپنی ایک جگہ ہے جسے اگر دوسری جگہ منتقل کیا جائے تو بمزاحمت ہی ہوگا۔ اس کے بعد لطیف اجسام کا مکان ہے، مثلاً ہوا اور آواز کا۔ جس میں پھر اجسام اگرچہ ایک دوسرے کے مزاحم تو ہوتے ہیں اور ان کی حرکت کا حساب بھی وقت ہی سے کیا جاتا ہے، لیکن ان میں اور بڑے بڑے اجسام کے وقت میں فرق ہے۔ جب تک ہم کسی ملکی سے اس کے اندر کی ہوا نکال نہیں لیتے۔ اس میں دوسری ہوا داخل نہیں ہوسکتی۔ امواج صوت کو دیکھیے تو مادی اجسام کے وقت کے مقابلے میں ان کے وقت کی عملاً کوئی حقیقت نہیں۔ آخر الامر نور یا روشنی کا مکان ہے۔ سورج کی روشنی تو دیکھتے ہی دیکھتے ربع مسکون میں پھیل جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ نور اور صوت کی رفتار میں وقت کی مقدار صفر سے آگے نہیں بڑھتی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نور کا مکان ہوا کے مکان سے کہیں زیادہ لطیف ہے، کیوں کہ اس مکان کا داخلہ نور کے مکان میں ممکن نہیں۔ لیکن پھر اس امر کے باوجود کہ یہ سب مکان ایک دوسرے کے حوالی میں موجود رہتے ہیں ہم ان میں کوئی امتیاز قائم نہیں کر سکتے۔ الا یہ کہ عقلاً ان کا تجزیہ کریں، یا روحانی طور پر ان کا مشاہدہ کیا جائے۔ بعینہ گرم پانی کو دیکھیے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے اس میں آگ اور پانی۔ دو اضداد۔ باہم نفوذ کر جاتے ہیں اس لیے کہ ہم ان کو ایک ہی جگہ موجود پاتے ہیں۔ حالاں کہ بہ اعتبار فطرت ان کی نوعیت ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ لہٰذا اس واقعہ کی تشریح یوں ہی کی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کا تعلق جس جس مکان سے ہے وہ باوجود قرب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر اگرچہ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ان میں بعد کا عنصر سرے سے مفقود ہو جاتا ہے لیکن نور کے مکان میں مزاحمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دیئے کی روشنی اگرچہ ایک حد تک ہی پہنچتی ہے، مگر پھر سو دیئے بھی موجود ہوں تو ان کی روشنی یوں باہم مل جائے گی کہ ایک روشنی کی موجودگی میں دوسری روشنی کے اخراج کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

یوں باعتبار لطافت مادی اجسام کے مکانات کی تشریح کرتے ہوئے عراقی نے بالاختصار اس مکان کی وضاحت کی ہے جس کا تعلق غیر مادی

ہستیوں مثلاً ملائکہ سے ہے۔اس مکان میں بھی بعد کا عنصر جیسا کسی ہستی کا مرتبہ ہے قائم رہتا ہے، کیوں کہ غیر مادی ہستیاں اگرچہ سنگ وخشت سے گزر کرسکتی ہیں، بایں ہمہ ان کی حرکت وقت کی پابند ہے لیکن عراقی کے نزدیک حرکت چوں کہ نقص کی علامت ہے اس لیے کہ یہ صرف روح ہے جس کو مکان سے آزادی کا آخری مرتبہ حاصل ہے۔لہٰذا ہم اسے متحرک کہیں گے، نہ ساکن، مکان کے یہ لامتناہی اختلافات ہیں جن سے گزر کیجیے تو آخرالامر مکان الٰہیہ کی نوبت آئے گی۔وہ ہر قسم کے ابعاد سے پاک ہے اور اس میں سب لامتناہتیں آپس میں مل جاتی ہیں۔

عراقی کے اس نظریے کی مختصر سی تشریح سے آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک ایسے زمانے میں جب ابھی ریاضی اور طبیعیات کے جدید تصورات کا کسی کو علم نہیں تھا ایک روشن خیال صوفی نے زمان ومکان کے بارے میں اپنے باطنی مشاہدات کی ترجمانی کس رنگ میں کی عراقی چاہتا تھا مکان کا تصور بطور ایک حرکی مشہود کے کرے۔معلوم ہوتا ہے اس کا ذہن مبہم طور پر یہ سعی کررہا تھا کہ ہمیں مکان کا تصور لامتناہی مکانی، زمانی تسلسل کی شکل میں کرنا چاہیے، لیکن عراقی نے اس سلسلے میں جو خیالات قائم کیے وہ خود ان کے نتائج تک پہنچنے سے قاصر رہا جس کی ایک وجہ تو ریاضی سے اس کی ناواقفیت ہے، دوسری یہ کہ اس کا ذہن بھی ارسطو کے اس نظریے کی طرف مائل تھا کہ کائنات ایک ساکن وجامد وجود ہے۔بہرحال اس کا یہ کہنا کہ حقیقت مطلقہ میں فوق المکان ''یہاں'' اور فوق الابد ''اب'' ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں۔کچھ ویسی ہی بات ہے جیسے عہد حاضر کا تصور زمان ومکان جسے پروفیسر الیگزینڈر نے اپنے خطبات ''مکان وزمان اور ذاتِ الٰہیہ'' کی بحث میں ہر شئے، یعنی موجودات عالم کا بطن اور سرچشمہ ٹھہرایا ہے۔یہ دوسری بات ہے کہ عراقی نے زمانے کی ماہیت میں زیادہ غور وفکر سے کام لیا ہوتا تو اسے صاف نظر آجاتا کہ زمانے کا وجود دونوں میں زیادہ اساسی ہے۔علیٰ ہٰذا یہ بھی کہ یہ کہنا محض استعارہ نہیں۔گو پروفیسر الیگزینڈر نے استعارتاً ہی کہا ہے کہ زمانہ مکان کا ''دل'' ہے لیکن عراقی اس نسبت کا تصور جو ذات الٰہیہ کو کائنات سے ہے اس نسبت پر کرتا ہے جو روح کو بدن سے ہے اور پھر اس کی بجائے کہ محسوسات ومدرکات کی زمانی اور مکانی نسبتوں کی تنقید فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کی جاتی، عراقی نے اس کا وجود صرف اپنی روحانی واردات کی بنا پر تسلیم کرلیا۔حالاں کہ مکان وزمان کے محض لمحہ نقطہ میں ضم کردینا کافی نہیں۔اس لیے کہ اگر ہم فلسفہ ہی کے راستے اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں کہ خدا فی الواقع کائنات کا نفس کلی ہے تو سب سے پہلے اس امر کا انکشاف کرنا پڑے گا کہ مکان وزمان کا اصول آخری بھی ''فکر زندہ'' ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ عراقی کے ذہن نے جس سمت میں حرکت کی اس کا رخ ٹھیک تھا۔لیکن عراقی کے ارسطاطالیسی تعصّبات، علیٰ ہٰذا نفسیاتی تحلیل سے ناواقفیت نے اس کا راستہ روک لیا۔اپنے اس نظریے کے ماتحت کہ زمان الٰہیہ تغیر سے عاری ہے اور ظاہر ہے اس کا یہ نظریہ واردات شعور کے ایک ناکافی تجزیے پر مبنی تھا۔عراقی اس نسبت کے فہم سے قاصر رہا جو زمان تسلسل کو زمان الٰہیہ سے ہے اور جو اگر اس کی سمجھ میں آجاتی تو تخلیق مسلسل کا خالصاً اسلامی تصور بھی اس پر منکشف ہوجاتا۔یعنی یہ حقیقت کہ کائنات اضافہ پذیر ہے۔

بہرحال اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا اس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھیے کائنات کے حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جسے ابن مسکویہ کے اس نظریے سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے۔مزید تقویت پہنچی، علیٰ ہٰذا ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ سے۔قرآن پاک نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام وامم کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے، مزید یہ کہ انہیں اپنی بداعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے بار بار تاریخ سے استناد کیا۔علاوہ ازیں قارئین کو توجہ دلائی کہ نوع انسان کے گزشتہ اور موجودہ احوال وشئون کے مطالعے میں غور وفکر سے کام لیں:

’’ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنْ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ‘‘(۱۴:۵)

’’ وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُون، وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لايَعْلَمُونَ ، وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ‘‘(۷:۱۸۱۔۱۸۳)

’’ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ‘‘(۳:۱۳۷)

’’ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ‘‘(۳:۱۴۰)

’’ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ‘‘(۷:۳۴)

آخری آیت پر نظر رکھیے تو اس کی حیثیت ایک مخصوص تاریخی تعمیم کی ہے جس میں گویا بڑے حکیمانہ انداز میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ امم انسانی کا مطالعہ بھی ہمیں بہ طور اجسام نامیہ علمی نہج پر کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس سے بڑی غلط بیانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ قرآن پاک میں کوئی ایسا خیال موجود نہیں جو فلسفۂ تاریخ کا سرچشمہ بن سکے، حالاں کہ بہ نگاہِ حقیقت دیکھا جائے تو ابن خلدون کا ’’مقدمہ‘‘ سرتاسر اس روح سے معمور ہے جو قرآن مجید کی بدولت اس میں پیدا ہوئی۔ وہ اقوام وامم کے عادات وخصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں بھی زیادہ تر قرآن پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے۔ چناں چہ اس نے بحیثیت ایک قوم عربوں کی سیرت اور کردار کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے، قرآن پاک ہی کی اس آیت کی تفصیل مزید ہے:

’’الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنزَلَ اللهُ عَلَى رَسُولِهِ وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ، وَمِنْ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمْ الدَّوَائِرَ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ وَاللهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ‘‘(۹:۸۷۔۹۸)

پھر اگر قرآن پاک کو تاریخ سے اس لیے دلچسپی ہے کہ وہ علم کا ایک سرچشمہ ہے تو صرف اس حد تک نہیں کہ اس کا سلسلۂ تاریخ تعمیمات سے آگے نہ بڑھے۔ برعکس اس کے قرآن پاک نے تاریخی تنقید کا ایک بنیادی اصول قائم کیا۔ کیوں کہ بطور ایک علم تاریخ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کا مواد جن واقعات سے تیار کیا جاتا ہے ہمیں ان کی صحت کا یقین ہو۔ لیکن واقعات کی صحت کا انحصار آخرالامر اس بات پر ہے کہ ان کے راوی کون ہیں۔ لہٰذا تاریخی تنقید کا اصول اولین یہ ہوگا کہ ہم ان کی سیرت اور کردار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرسکیں۔ بغیر اس کے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ انہوں نے جس امر کی شہادت دی ٹھیک تھا یا غلط۔ لہٰذا قرآن پاک کا ارشاد ہے:

’’ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَائَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ‘‘(۴۹:۶)

آگے چل کر اسی اصول سے جو اس آیت میں پیش کیا گیا اور جس کا اخلاق جب راویان حدیث پر ہوا تو رفتہ رفتہ تاریخی تنقید کے قوانین مرتب ہوتے چلے گئے۔ عالم اسلام میں اس تاریخ کی پرورش جس طرح ہوئی وہ بجائے خود ایک بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ یہ قرآن پاک کا بارہا حقائق پر زور دینا اور اس کے ساتھ ساتھ پھر اس امر کی ضرورت کہ آنحضرتؐ کے ارشادات صحت کے ساتھ متعین ہوں، علیٰ ہٰذا مسلمانوں کی یہ آرزو کہ اس طرح ان کی آئندہ نسلوں کو اکتساب فیض کے دوامی سرچشمے مل جائیں۔ یہ عوامل تھے جن کے زیر اثر ابن اسحاق طبری اور مسعودی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ لیکن تاریخ سے دلوں کو گرمانا اور ان میں جوش اور ولولوں کا ابھرنا وہ ابتدائی مرحلہ ہے جس سے رفتہ رفتہ تاریخ کا نشوونما ایک علم کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کے علمی مطالعے کے لیے بڑے وسیع اور بڑے گہرے تجربے کے ساتھ ساتھ بڑی پختہ عقل علمی کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں زندگی اور

زمانے کی ماہیت کے بارے میں بعض اساسی تصورات کا نہایت صحیح ادراک۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس سلسلے میں دو بڑے تصور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دونوں تعلیمات قرآنی کا سنگ بنیاد ہیں۔

(iii)1۔ وحدت مبداء حیات:

''اور ہم نے تمہیں نفس واحد سے پیدا کیا۔'' یہ ہے قرآن مجید کا ارشاد۔ مگر پھر یہ امر کہ زندگی کا ادراک بطور ایک وحدت نامیہ کے ہوجائے، کچھ دیر ہی کے بعد ہوتا ہے۔ یوں بھی اس تصور کا نشوونما اس امر پر موقوف ہے کہ اقوام وامم احوال عالم کی اصل رو میں داخل ہوجائیں۔ اسلامی فتوحات کی رفتار چوں کہ بڑی تیز تھی اس لیے مسلمانوں کو یہ موقع جلد ہی میسر آ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا، لیکن یہ امر کہ نوع انسانی ایک جسم نامی ہے، مسیحی روما کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ فلنٹ کہتا ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کسی عیسائی یا دولت روما کے کسی مصنف کے حق میں بالخصوص کہی جاسکتی ہے یہ کہ اس کے ذہن میں وحدت انسانی کا ایک مجرد تصور موجود تھا مگر پھر رومی عہد سے لے کر اب تک بھی تو صورت حال کچھ ایسی ہے کہ یہ تو ریورپ کے دل ودماغ میں جاگزیں نہیں ہوسکا۔ برعکس اس کے وطنی قومیت کے نشوونما سے جس کا سارا زور نام نہاد قومی خصائل پر ہے، وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا برابر دب رہا ہے۔ لیکن اس سے کس قدر مختلف ہے عالم اسلامی کی تاریخ! یہاں وحدت انسانی کا خیال نہ تو محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا، نہ شاعرانہ خواب بلکہ روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو چپکے چپکے اور غیر محسوس طریق پر اپنا کام کرتا رہا۔

2۔

اس امر کا نہایت گہرا احساس کہ زمانہ ایک حقیقت ہے، لہٰذا زندگی کا یہ تصور کہ وہ عبارت ہے ایک مسلسل اور مستقل حرکت سے۔ زمانے کا یہی تصور ہے جو ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ میں ہماری دلچسپی کا خاص مرکز بن جاتا ہے اور اس لیے فلنٹ بجا طور پر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ کہتا ہے افلاطون ہو یا ارسطو یا اگسٹائن، ان میں کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔ رہے دوسرے سوان کا ذکر ہی کیا ہے۔ ان کا تو اس کے ساتھ نام بھی نہیں لیا جاسکتا۔ لیکن یہاں غلط فہمی نہ ہو کہ ہمیں ابن خلدون کی بداعت فکر سے انکار ہے۔ ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن نے اپنے اظہار کے لیے جو راستہ اختیار کیا اس پر نظر رکھیے تو یہ کسی مسلمان ہی کا کام ہوسکتا تھا کہ تاریخ کا تصور بطور ایک مسلسل اور مجموعی حرکت کے کرتا، یعنی زماناً ایک ایسے نشوونما کی حیثیت سے جس کا ظہور ناگزیر ہے۔ گویا ہمیں ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ سے دلچسپی ہے تو اس کی وجہ بھی ابن خلدون کا وہ تصور ہے جو اس نے تغیر کے باب میں قائم کیا۔ یہ تصور بڑا اہم ہے کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ چوں کہ ایک مسلسل حرکت ہے زمانے کے اندر، لہٰذا یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اس کی نوعیت فی الواقع تخلیقی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہ حرکت نہیں جس کا راستہ پہلے سے متعین ہو۔ اب اگرچہ ابن خلدون کو مابعد الطبیعات سے مطلق دلچسپی نہیں تھی، بلکہ وہ درحقیقت اس کا مخالف تھا۔ بایں ہمہ زمانے کا تصور جس رنگ میں کیا، ہم اس کے پیش نظر اس کا شمار برگساں کے پیشروؤں میں کریں گے۔ اسلامی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کرآئے ہیں۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ ''اختلاف لیل ونہار'' کو حقیقت مطلقہ کی جس کی ''ہر لحظہ ایک نئی شان ہے'' ایک آیت تصور کرنا چاہیے، اسلامی مابعد الطبیعات کا یہ رجحان کہ زمانہ ایک خارجی حقیقت ہے، ابن مسکویہ کا یہ نظریہ کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے اور آخرالامر بیرونی کا یہ صاف وصریح اور واضح اقدام کہ کائنات کا تصور بطور ایک عمل تکوین کے کرے، یہ سب باتیں ابن خلدون کو ذہناً ورثے

میں ملیں۔لہٰذا اس کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہ ہے کہ وہ اس تہذیب وتمدن کی روح کو خوب سمجھ گیا تھا جس کا وہ خود سب سے زیادہ روشن اور تاب ناک مظہر ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس کی ترجمانی بھی بڑی باقاعدہ اور مرتب شکل میں کی۔چناں چہ یہ اس کی ذہانت وفطانت تھی کہ قرآن مجید کی روح جو سرتاسر یونانیت کے منافی ہے،حکمت یونان پر ہمیشہ کے لیے غالب آ گئی۔یونانیوں کے نزدیک زمانے کی یا تو کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، جیسا کہ زینو اور افلاطون کا خیال تھا۔یا یہ کہ وہ ایک دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے،جیسا کہ ہراق الطّوس اور رواقین نے اس کا تصور کیا۔حالاں کہ ہم کسی تخلیقی حرکت کے پیش رس اقدامات پر جس معیار کے رو سے بھی حکم لگائیں گے،اس حرکت کا تصور بطور ایک دائرے کے کیا گیا تو اس کی خلاقی کالعدم ہو جائے گی۔دوامی رجعت دوامی تخلیق نہیں اسے دوامی تکرار ہی کہا جائے گا۔

میرا خیال ہے اب شاید ہم بخوبی سمجھ گئے ہیں کہ عالم اسلام میں یونانی فلسفہ کے خلاف ذہناً جو بغاوت پیدا ہوئی اس کی اہمیت کیا ہے۔پھر یہ امر کہ اس بغاوت کا آغاز خالصاً الٰہیاتی نقطۂ نظر سے ہوا۔اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ قرآن مجید کی روح چوں کہ اساساً یونانیت کی ضد ہے لہٰذا بالآخر وہ اس پر غالب آئی،حالاں کہ شروع شروع میں بعض افراد کی فی والواقع یہ خواہش تھی کہ قرآن پاک کی ترجمانی بھی فلسفۂ یونان ہی کی روشنی میں کریں۔

اب صرف اس غلط فہمی کا ازالہ باقی ہے جسے اشپینگلر نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''زوال مغرب'' میں پھیلایا۔اس تصنیف کے ان دو ابواب کو جن میں اس نے عربی ثقافت سے بحث کی ہے۔ایشاء کی تہذیب وتمدن کی تاریخ میں ایک بڑا قابل قدر اضافہ تصور کرنا چاہیے۔لیکن افسوس یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے،اشپینگلر نے ان دونوں ابواب میں یہ سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی کہ بحیثیت ایک مذہبی تحریک اسلام کی ماہیت کیا ہے،نہ یہ کہ وہ کیا سرگرمیاں تھیں جن کا اس کی بدولت تہذیب وثقافت کی دنیا میں آغاز ہوا۔اشپینگلر کا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی تہذیب ہوا سے اپنی جگہ پر ایک جسم نامی تصور کرنا پڑے گا،اس لیے کہ زماناً دیکھا جائے تو کسی تہذیب کا اس تہذیب سے جو اسی سے مقدم ہے یا متاخر کوئی تعلق نہیں ہوگا۔اشپینگلر کے نزدیک ہر تہذیب کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے اور وہ جس شئے کو دیکھتی ہے اسی نقطۂ نظر کے ماتحت جسے دوسری تہذیبوں کے افراد سمجھ ہی نہیں سکتے۔یہ دعویٰ ہے جس کی حمایت میں اشپینگلر کا اضطراب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ وہ ایک واقعے کے بعد دوسرا اور ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر پیش کرتا اور اس طرح واقعات اور تعبیرات کا ایک طومار کھڑا کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ مغربی تہذیب کی مخالفت یونانیت روح اس کی اپنی ذہانت اور فطانت کا نتیجہ ہے۔نہ کہ ان اثرات کا جو بہت ممکن ہے اس نے اسلامی تہذیب سے قبول کیے ہوں،کیوں کہ یہ تہذیب،کیا باعتبار روح اور کیا باعتبار نوعیت،اشپینگلر کے نزدیک خالصاً مجوسی ہے۔تہذیب حاضر کے بارے میں تو ہمیں اشپینگلر کے نقطۂ نظر سے پورا اتفاق ہے،لیکن ہم جیسا کہ ان خطبات میں بار بار کہہ چکے ہیں،عصر حاضر کی روش اگر یونانیت کے منافی ہے تو اس کی ابتدا دراصل اس بغاوت سے ہوئی جو عالم اسلام نے فکر یونان کے خلاف کی۔مگر اشپینگلر اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے؟ کیوں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ تہذیب جدید کی مخالف یونانیت روح سچ مچ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو اس نے اپنی پیشرو تہذیب سے قبول کیے تو تہذیبوں کی باہم دگر آزادی اور جداگانہ نشوونما کے متعلق اشپینگلر کا دعویٰ ایک ظلم باطل ہو جائے گا۔میری رائے میں اشپینگلر کا یہی اضطراب کہ وہ اپنے اس دعوے کو کسی نہ کسی طرح صحیح ثابت کر سکے،اس امر کا باعث ہوا کہ بہ حیثیت ایک ثقافتی تحریک اس نے اسلام کو بڑی ہی غلط اور فاسد نگاہوں سے دیکھا۔

بہرحال مجوسی تہذیب سے اشپینگلر کی مراد وہ مشترک تہذیب ہے جو بقول اس کے مجوسی مجموعۂ مذاہب،یعنی یہودیت،قدیم کا کلدانی

مذہب، ابتدائی عیسائیت، زرتشتیت اور اسلام پر مشتمل تھی۔ اب اگر چہ اس امر سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام پر بھی مجوسیت کا ایک غلاف ضرور چڑھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان خطبات میں میری برابر یہ کوشش رہی کہ مجوسیت کے ان غلافوں کو ہٹا کر جنہوں نے گویا اسلام کی حقیقی روح پر پردہ ڈال رکھا ہے اور جو اشپنگلر کی گمراہی اور غلط روی کا باعث ہوئے، ہم اس کا صاف ستھرا چہرہ دیکھ سکیں۔ چناں چہ زمانے ہی کی بحث میں اسلامی افکار کے متعلق اشپنگلر کی بے خبری کا جو عالم ہے اسے، علی ہذا محسوسات و مدرکات کے ایک آزاد اور بااختیار مرکز کی حیثیت سے خودی یا ''انا'' کا اظہار اسلام کے مذہبی مشاہدات اور واردات میں جس طرح ہوا، اس باب میں اس کے خیالات کو دیکھ کر ہمارے تعجب اور حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ بجائے اس کے کہ زمانے کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں اشپنگلر اسلامی افکار اور واردات کی تاریخ پر نظر رکھتا، اس نے اس مسئلے میں اپنے فیصلوں کی بنا عام عقائد پر رکھی۔ ذرا خیال تو فرمائیے کہ اسلام کی مفروضہ تقدیر پرستی کے ثبوت میں اشپنگلر ایسا پڑھا لکھا اور فاضل انسان بعض مشرقی اقوال اور ضروب الامثال کو، مثلاً زمانے کی جست، یا یہ کہ ''ہر چیز کا ایک وقت ہے۔'' بطور دلائل پیش کرتا ہے۔ بہر حال اس مسئلے میں مسلمانوں کے یہاں زمانے کے تصور کا سرچشمہ کیا تھا، علاوہ ازیں یہ کہ اس کا نشو ونما کس رنگ میں ہوتا رہا، پھر ایسے ہی بطور ایک آزاد اور بااختیار طاقت کے انسانی خودی کی بحث میں ہم ان خطبات میں بہت کچھ کہہ آئے ہیں۔ یوں بھی اسلام اور اسلامی تہذیب کے بارے میں اشپنگلر نے جس خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تحقیق وتنقید کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ لہٰذا ہم اس سلسلے میں جو کچھ عرض کر چکے ہیں۔ اس میں صرف ایک بات کا اضافہ، جس کی حیثیت ایک عام اصول کی ہے، کافی ہوگا۔

اشپنگلر کہتا ہے: ''تعلیمات نبوی کا لب لباس مجوسی ہی تو ہے۔'' خدا ایک ہے، اسے یہولاہ کہئے، اہورمزد، یا مردوک بعل، وہی اصول خیر ہے، باقی سب یا تو بے بس ہیں یا محض شر۔ پھر اس عقیدے کے ساتھ ایک اور عقیدہ بھی وابستہ ہے، یعنی یہ امید کہ مسیح آئے گا جس کا الیسعیاہ میں تو واضح طور پر اور پھر ایک خاص ضرورت کے ماتحت آئندہ صدیوں میں بار بار ذکر آتا ہے۔ یہ مجوسی مذہب کا بنیادی خیال ہے، کیوں کہ اس نے تاریخ عالم کا تصور ہی اس طرح کیا ہے کہ اس کا آغاز خیر وشر کی آویزش سے ہوا جس میں بیچ کا دور اگر چہ شر کے غلبے کا دور ہے، لیکن روز جزا میں خیر ہی کی فتح ہوگی۔ اب اگر اشپنگلر یہ سمجھتا ہے کہ تعلیمات نبوی کی بحث میں اس کا یہ نظریہ اسلام پر بھی منطبق ہو سکتا ہے تو اس سے بڑھ کر غلط فہمی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ مجوسی بہر حال خدایان باطل کے وجود کا قائل تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے ان کی عبادت سے انکار تھا، لیکن اسلام نے تو خدایان باطل کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا۔ نہ اشپنگلر یہ سمجھا، نہ اسلام کے اصول خاتمیت کی تہذیبی قدر و قیمت اس پر واضح ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امید اور توقع مجوسی تہذیب وثقافت کی ایک مستقل روش ہے، یعنی زرتشت کے نازائیدہ بیٹوں کے ظہور کا مسلسل انتظار، خواہ کوئی مسیح ہو یا انجیل چہارم کا فارقلیط۔ لیکن جو طالب علم یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کے اصول خاتمیت کے معنی تہذیب وثقافت کے لیے کیا ہیں تو اس کو چاہیے اس سمت کا رخ کرے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں، اس لیے کہ یہ اصول مسلسل انتظار کی اس مجوسی روش کے خلاف جس سے تاریخ کا ایک غلط نظریہ قائم ہو جاتا ہے، ایک نفسیاتی روک بھی ہے۔ دراصل ابن خلدون نے تاریخ کا جو نظریہ قائم کیا وہ اس کی حقیقی روح کو خوب سمجھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اسی نوع کے ایک اسلامی عقیدے کی تنقید سے جس نے مسلمانوں میں گویا مجوسی خیالات کے زیر اثر سر اٹھایا تھا ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ اور نہیں تو کم از کم ان نتائج ہی کے اعتبار سے جو بلحاظ نفسیات اس سے مرتب ہوتے ہیں، اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔

15.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ خطباتِ اقبال میں علامہ اقبال نے ''علم اور مذہبی مشاہدات، مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار، ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا، خودی، جبر وقدر، حیات بعد الموت، اسلامی ثقافت کی روح، الاجتہاد فی الاسلام، کیا مذہب کا امکان ہے؟ کے عنوانات سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

☆ پہلے خطبے میں اقبال نے ابتدا میں کائنات کی حقیقت کو بیان کیا ہے پھر انسان، خدا اور اس کائنات کے باہمی ارتباط کا ذکر کیا ہے۔

☆ اقبال نے اپنے تمام معروضات کو قرآن و اسلامی روایات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

☆ دوسرے خطبے کا عنوان مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار ہے جس میں انہوں نے تین اہم فلسفی اصول کے متعلق بحث کی ہے پھر اس کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محض ان اصولوں کی بنیاد پر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس خطبے کو پہلے خطبے کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔

☆ تیسرے خطبے کا موضوع ''ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا'' ہے۔ اس میں اقبال نے فردیت اور محدودیت کے متعلق بیان کیا ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے روح و نفس کے تعلق سے بحث کی ہے اور مسئلہ زمان و مکان کو سمجھنے کے لیے اس مسئلے کو بھی مورد بحث قرار دیا ہے۔

☆ خطبہ چہارم خودی، جبر وقدر، حیات بعد الموت کے نظریہ سے متعلق ہے۔ اس میں نفس کی آزادی، اس کی بقا اور سرمدیت کے حوالے سے قرآن کریم کی روشنی میں لکھا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے اور کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

☆ ''اسلامی ثقافت کی روح'' اقبال کے پانچویں خطبے کا عنوان ہے۔ اس خطبے کا آغاز انہوں نے مشہور صوفی عبد القدوس گنگوہی کے الفاظ ''محمد عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد۔ واللہ اگر من رفتے ہرگز باز نیامدمے'' سے کیا ہے۔

☆ خطبہ ششم ''الاجتہاد فی الاسلام'' کے مسئلے پر مبنی ہے جس میں اقبال نے اسلام میں اجتہاد کو اپنی تقریر کا عنوان رکھا ہے لیکن اس سے پہلے انہوں نے توحید اور اتحادِ عالم پر بات کی ہے۔

☆ ''کیا مذہب کا امکان ہے'' کے تحت اقبال نے مذہبی امکانات کے متعلق بحث کی ہے جس میں انہوں نے مذہبی زندگی کے تین ادوار یا مراحل کا ذکر کیا ہے۔

☆ اقبال نے اپنے خطبات میں سینکڑوں قرآنی آیات و روایات سے استفادہ کیا ہے۔

15.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ساخت	:	بناوٹ
جمود	:	ٹھہرا ہوا
تسخیر	:	گھیر لینا
وجدان	:	عقل، بصیرت

احساسات	:	واردات
متکلمین فرنگ	:	جواز منہ متوسطہ میں حکمت یونان کے زیرِ اثر مذہب اور فلسفہ کو باہم تطبیق دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔
افلاک	:	فلک کی جمع، آسمان
ناظر	:	دیکھنے والا
زمان	:	وقت
مکان	:	جگہ

15.6 نمونۂ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سولات:

1۔ خطبات اقبال کا ترجمہ کس نے کیا؟

2 خطبات کی تعداد کتنی ہے۔

3۔ خطبات اقبال کا اردو میں ترجمہ کس زبان سے ہوا؟

4 پہلے خطبے کا موضوع کیا ہے؟

5 اردو میں خطبات اقبال کس نام سے شائع ہوا؟

6 تشکیلِ جدید الہیاّتِ اسلامیہ کس کے خطبات کا مجموعہ ہے؟

7 مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار کس نمبر کا خطبہ ہے؟

8 خطبات اقبال، ایک مطالعہ کس کی تصنیف ہے؟

9 ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب کا نام بتایئے؟

10 خطبہ 'اسلامی ثقافت کی روح' میں اقبال نے کس صوفی کی بات سے اپنے خطبے کا آغاز کیا ہے؟

15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خطبات اقبال کے موضوعات کو بیان کیجیے۔

2۔ خطبہ نمبر ایک کا خلاصہ اختصار سے کیجیے۔

3۔ کائنات کی حقیقت کے بارے میں اقبال کے نظریے پر روشنی ڈالیے۔

4۔ خطبہ 'کیا مذہب کا امکان ہے؟ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

5 ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا پر مختصر نوٹ لکھیے۔

15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خطبات اقبال کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

2 اقبال کے دو خطبوں کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3 خطبات کی روشنی میں اقبال کے علمی مرتبہ کا تعین کیجیے۔

15.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ تشکیلِ جدید الہیاّتِ اسلامیہ	سید نذیر نیازی (ترجمہ)
2۔ خطباتِ اقبال، ایک مطالعہ	الطاف احمد اعظمی
3۔ موضوعاتِ خطباتِ اقبال	محمد شریف بقا (ترجمہ و تشریح)
4۔ تلخیص خطباتِ اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
5۔ خطبات اقبال۔ نئے تناظر میں	محمد سہیل عمر
6۔ خطبات اقبال پر ایک نظر	سعید احمد اکبر آبادی

اکائی16: خطبات اقبال کا فکری وفنی مطالعہ

اکائی کے اجزا

16.0		تمہید
16.1		مقاصد
16.2		خطبات اقبال کا فکری وفنی مطالعہ
16.3		خطبہ برائے مطالعہ
16.4		اکتسابی نتائج
16.5		کلیدی الفاظ
16.6		نمونہ امتحانی سوالات
	16.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	16.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	16.6.3	طویل سوالات کے حامل سوالات
16.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

اقبال بیسویں صدی کے مسلمان متکلمین اور مفکرین میں بہت نمایاں ہیں اور جو اسلام میں تحریک تعقل کے پرجوش موید تھے، فلسفہ جدید کے ماہر ہونے کی وجہ سے انہیں اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ کسی بھی تہذیب کی فکری بنیاد فلسفے پر ہی استوار ہوا کرتی ہے اور اقوام عالم اپنے مخصوص فلسفے کے سہارے ارتقاء کی منزلیں طے کرتی اور سیاسی، ثقافتی، عمرانی، تعلیمی اور معاشی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں۔ اپنے مخصوص فلسفہ حیات سے گریز کر کے ہر تہذیب پہلے زوال آمادہ اور رفتہ رفتہ موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ تہذیبی زوال آمادگی کا مرض اس وقت لاحق ہوتا ہے جب ان کا انداز فکر ونظر اور علم وعمل عصری تقاضوں کی پروا نہیں کرتا۔ کسی تہذیب پر بیتنے والا یہ لمحہ بے حد نازک ہوتا ہے۔ اقبال جس عہد میں ایک متکلم، فقیہ، فلسفی، شاعر اور تہذیب اسلامی کے نباض کی حیثیت سے ابھرے، برصغیر کے مسلمان ذہنی طور پر پسماندہ، نفسیاتی طور پر قنوطیت اور زندگی کی ہر سطح پر احساس محرومی کا شکار تھے۔ وہ صرف ماضی میں گم تھے۔ ان کا حال بے معنی تھا اور مستقبل سے ان کا تعلق صرف حضرت مہدی کے انتظار کی حد تک باقی تھا۔ مسلمانوں کے ماضی کے پرشوکت ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن محض ماضی پرستی کی بناء پر مستقبل اور باوقار مستقبل کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جس قوم کا اپنے مذہب کی انقلاب آفریں تعلیم پر یقیں باقی نہ رہا ہو وہ عصر حاضر کے تقاضوں اور مستقبل کی ضرورتوں سے خوف زدہ رہنے لگتی ہے۔ نتیجتاً خود اعتمادی اور عمل کی قوت کھو دیتی ہے۔

ان حالات میں اور کچھ ایسی ہی سوچ کے تحت اقبال نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بیڑا اٹھایا اور مسلمان دانشوروں، ذہین افراد اور طبقہ علماء کے لیے ایسے راستے تجویز کیے جو روشن اور جاندار مستقبل کی طرف لے جاتے ہوں۔ وہ خود خطہ مشرق کے فرد تھے اس لیے مشرقی روایات کی مخالفت کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ انہیں ان روایات پر ناز بھی تھا۔ دوسری طرف مغربی افکار کو تمام تر رد کر دینا بھی عالمانہ دیانت داری کے خلاف تھا لہٰذا اپنے خطبات میں اقبال نے پوری کوشش کی کہ فکر و دانش اور علوم و فنون کے میدان میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے اسے گنایا جائے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے افکار کو متناسب اور موزوں امتزاج کے ساتھ قرآنی معیار علم پر جانچ کر نئی اسلامی فکر کا موضوع بنایا لیکن مغرب سے بس اسی قدر تعلق رکھا کہ متکلم کی حیثیت سے سائنسی رویے اور محسوسات سے رابطہ رکھا جائے کہ (بقول اقبال) یہ بھی اصل میں اسلامی فکر ہی کی میراث ہے۔ تاہم اقبال نے کہیں اور کبھی تہذیب و ثقافت کے ان پہلوؤں کو قبول نہیں کیا، جو دینی اقدار کے برعکس تھے۔ ان کے نزدیک مشرق کی اخلاقی اور مذہبی فضا صرف اس لیے زہر آلود ہوئی کہ عقیدہ آخرت کے بارے میں مسلمانوں نے مایوس کن غور و فکر کا ثبوت دیا۔ ان حالات میں اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلامی فکر نو کی تشکیل جدید محسوس حقائق ہی پر استوار کی جائے۔

اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں نے اپنی نااہلی اور روحانی افلاس کے سبب وحدت ملت کے مفہوم کو وطنیت اور قوم پرستی میں گم کر دیا ہے اور وہ ایک طرح سے اپنے روحانی احیاء سے مایوس ہو کر نام نہاد تصوف کی فکری آسودی کی جانب نکل گئے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ ''اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسان کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ اس کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔''

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ خطبات کی تحریر کے مقاصد کو بیان کر سکیں۔
- ☆ خطبات کے فکری لوازم سے واقف ہو سکیں۔
- ☆ اقبال کے اہم فلسفیانہ تصورات کو بیان کر سکیں۔
- ☆ جدید علوم اور سائنسی نظریات پر اقبال کے ردعمل کو واضح کر سکیں۔
- ☆ مغربی فکر و فلسفہ پر اقبال کی تنقید کے اسباب و علل کو بیان کر سکیں۔

16.2 خطبات اقبال کا فکری و فنی مطالعہ

ڈاکٹر محمد اقبال نے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر 30-1929 میں الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید کے سلسلے میں چھ خطبے تحریر کیے جن میں تین مدراس میں اور تین علی گڑھ میں پڑھے۔ یہ خطبات انگریزی میں The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے 1930 میں لاہور سے شائع ہوئے۔ پھر جب علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے لندن گئے تو وہاں ارسطاطلین سوسائیٹی (Aristotelian Society of London) کی دعوت پر انہوں نے ایک خطبہ مذہب کی اہمیت و افادیت پر دے دیا، جس کا عنوان Is Religion Possible تھا۔ علامہ اقبال کا یہ خطبہ بھی مذکورہ کتاب میں شامل کیا گیا اور ان خطبات کا دوسرا ایڈیشن مئی 1934ء میں بعض لفظی ترمیمات کے ساتھ آکسفورڈ لندن سے The Reconstruction of Religious Thought in

Islam کے نام سے منظر عام پر آیا۔

علامہ اقبال کے یہ خطبات اسلامی حکمت اور مغربی فلسفہ کا نچوڑ ہیں۔ اِن خطبات میں علامہ اقبال نے موجودہ زمانے کے فکری مسائل اور فلسفیانہ موضوعات پر اسلامی حکمت کے حوالے سے تنقید بھی کی ہے اور مغرب کے جدید علوم کی روشنی میں حکمت اسلامیہ کے بعض اہم مسائل کی تشریح کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اپنے یقین کی حد تک حضرت علامہ نے کامیاب کوشش کی ہے لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی سوال کا قطعی جواب دینا فلسفہ کی حدود سے خارج ہے اور اس کی روح کے منافی ہے، البتہ فلسفہ موجودہ سوالات کو زیادہ قابل فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور مسائل کی تفہیم میں نئے ربط اور نئی ترتیب کے ذریعے اُن کے نئے رخ اور نئی جہات کی تلاش اس کے منصب میں داخل ہے۔ چناں چہ علامہ اقبال نے خطبات کے مقدمہ میں فلسفے کی حدود اور طریقِ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''فلسفیانہ افکار میں کوئی قطعیت موجود نہیں ہوتی۔ میرے پیش کردہ نظریات سے ممکن ہے بہتر اور مناسب نظریات پیش کیے جائیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم فکرِ انسانی کی روز افزوں ترقی کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہوئے آزادانہ تنقید کا راختیار کریں''۔

علامہ اقبال نے اِن خطبات کی تیاری میں یہی طریقِ کار اختیار کرتے ہوئے انسانی فکر کا جو سرمایہ اُن تک پہنچا یا اس کی تنقید اور تنقیح کر کے مختلف فلسفیانہ مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ایک مرتب نظام فکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلامی الٰہیات کی جدید تعبیر پر مبنی ہے۔ علوم جدیدہ کی اصطلاحات کی روشنی میں مذہبی واردات کے حوالے سے اسلامی الٰہیات کی یہ تشریح بذات خود بہت مشکل کام تھا۔ مزید برآں کہ اقبال نے اس کام کے لیے نہایت ادق اسلوب اختیار کیا۔ یہ خطبات دراصل انگریزی نثر میں اقبال کے حقیقی شاہ کار (Magnum opus) ہیں جن کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ان کے تراجم کا سلسلہ اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال کے ایک قریبی دوست سید نذیر نیازی کو اس سلسلے میں یہ امتیاز اور اختصاص Specialization حاصل ہے کہ انہوں نے اقبال کی خواہش پر اُن کی حیات میں ہی ان خطبات کا ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور بزم اقبال لاہور سے اس شاندار کتاب کا اردو ترجمہ بعنوان ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' 1958ء میں منظر عام پر آیا۔ سید نذیر نیازی اس نام کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تشکیل ایک نئی فکر کی تشکیل ہے۔ الٰہیات عقل اور ایمان کا وہ نقطۂ اتصال ہے جس کی بناء علم پر ہے اور اسلام محسوس حقائق کی اس دنیا میں زندگی کا راستہ ہے۔''

عنوان کی اس تشریح سے علامہ کے ان خطبات کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی فلسفے کی دنیا میں ان خطبات کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر انا میری شمل Dr.Annemarie Schimmel نے اپنی معروف تصنیف Gabriel's Wing میں اور ڈاکٹر سید حسین نصر نے خطبات کے فارسی مقدمے میں ان خطبات کو دوسری احیائے علوم الدین کہا ہے یعنی جس طرح امام غزالی نے احیائے علوم الدین میں اپنے زمانے کے تمام فلسفوں کا جائزہ لیتے ہوئے عقل اور فلسفیانہ بنیادوں پر اسلام کی برتری ثابت کی تھی۔ وہی کام اس دور میں علامہ اقبال نے کیا ہے۔

اقبال نے محسوس کیا کہ عہد جدید کے فکری مسائل عہد قدیم کے فکری مسائل سے بالکل مختلف ہیں۔ ماضی میں مذہب اور فلسفہ کے درمیان

آویزش تھی اور یہ خالص تصورات کی آویزش تھی۔لیکن جدید عہد میں جہاں ایک طرف قدیم مذہبی فکر اور جدید فکر وفلسفہ میں تصادم ہے وہیں سائنسی علوم سے بھی جن کی بنیاد مشاہدہ وتجربہ پر ہے، مذہب ہم آہنگ نہیں ہے۔چناں چہ بہت سے اصحابِ علم مذہبی عقاید کے بارے میں تشکیلی ذہن رکھتے ہیں۔ان کے ذہنوں سے شک کا کانٹا نکالنے میں ہمارے قدیم علوم کی افادیت مشکوک ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ جس طرح قدیم علم کلام اپنی محدود افادیت کے باوجود عہد حاضر کی فکر کے پیدا کردہ سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے اسی طرح قدیم تصوف بھی جس نے بلاشبہ مذہبی تجربے کی قدیم روایت کو آگے بڑھایا ہے۔اپنے قدیم اندازِ فکر اور پیچیدہ مصطلحات کی وجہ سے عہد جدید کے انسان کے لیے ناقابل فہم ہے۔اُن کے الفاظ میں:

> "The more genuine school of Sufism have, no doubt done good work in shaping and directing the evolution of religious experience in Islam, but their later day representatives, owing to their ignorance of the modern mind have become absolutely incapable of receiving any fresh inspiration from modern thought and experience. They are perpetuating methods which were created for generationsposessing a cultural outlook differing in important respects from our own."

اس صورت حال کے پیش نظر اقبال کا خیال ہے کہ اسلام کے پورے فکری نظام پر از سرنو غور وفکر کی ضرورت ہے۔عہد جدید کا یہ اہم ترین تقاضا ہے کہ اسلامی افکار کو جدید فکر کی روشنی میں پیش کیا جائے۔وہ لکھتے ہیں:

> "In these lectures I have tried to meet, even though partailly, this urgent demand by attempting to reconstruct Muslim religious philosophy with due regard to the philosophical tradition of islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge."

اقبال کے ذہن میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا خیال اس وجہ سے بھی آیا کہ عہد جدید کے انسان کی توجہ تصورات سے زیادہ اشیاء وحوادث (Concrete Thing) کی حقیقت یعنی اس کے روابط اور قوانین حدوث کی دریافت پر مرکوز ہے۔

علامہ اقبال بلاشبہ دانش قرآنی سے متاثر تھے۔وہ مغربی فلسفیانہ افکار، جدید نظریات اور سائنسی انکشافات سے قطعاً مرعوب نہ تھے اور وہ دنیا

کے تمام نظام ہائے حیات پر دین اسلام کی فوقیت کا یقینِ کامل رکھتے تھے۔ اور وہ دانش برہانی کے ذریعے ہی دانشِ قرآنی کی عظمت، فوقیت اور قطعی صداقت کے صدقِ دل سے قائل ہوئے۔ مذہب کو چند غیر عقلی اعتقادات وتبرکات کا مجموعہ سمجھنے کی جس غلطی میں مادہ پرست فکر کے حامل فلسفی اکثر گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اُن کے افکار پر کڑی تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ دین یا اسلام ایک فعال تمدنی قوت کا نام ہے جو انسانی زندگی کی تمام عملی وفکری ضروریات میں اس کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا ہے اور اسی بحث کے دوران میں وہ وسیع پیمانے پر فلسفہ، مابعد الطبیعات، تاریخ، نفسیات، طبیعات اور ریاضیاتی سائنس کے مشہور نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اِن مباحث میں اُن کا رویہ آزادانہ تنقید کا ہے۔ ان علوم کی نفی کرنا اُن کا مقصد نہیں بلکہ معقول تفہیم وتشریح کے ذریعے اُن کی حدود کا تعین ہے۔ اس طرح علامہ اقبال ذات وکائنات کے مسائل کے حل کے لیے روحانی وارات، مذہبی تجربہ اور وجدانی حقائق سے بحث کرتے ہیں اور مختلف عنوانات کے تحت ان مباحث کو اپنے ساتوں خطبوں پر پھیلا کر نوع انسانی کی فکری رہنمائی کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کے لیے 1908ء میں یورپ سے واپسی کے بعد سے 1938 میں انتقال تک کے پورے عرصے میں وہ مسلسل بے تاب رہتے ہیں۔ اردو شاعری، پھر فارسی شاعری اور پھر انگریزی کے یہ خطبات سب اسی حکیمانہ شعور کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش ہیں جو اقبال کو مسلسل غور وتدبر اور فکر وذکر سے حاصل ہوا۔ ان خیالات کی ترتیب واظہار میں علامہ اقبال نے کس قدر دکھ اُٹھایا اور کیسے کیسے یاس انگیز لمحات میں انہوں نے اپنے دل میں جلنے والے اس الاؤ کو سرد ہونے سے بچانے کے لیے انہوں نے جدوجہد جاری رکھی، اس کا کچھ اندازہ 1909ء سے 1920ء تک کے ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے اس عرصے میں اپنے دوستوں کو لکھے۔ 1909ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا کیے ہوئے ہیں، عوام پر ظاہر ہوں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرے گی''۔

خیالات کے اظہار کی یہ تڑپ بالآخر 1920 تا 1929 میں ان خطبات کے لکھنے کا سبب بنی۔ ان خطبات کے عنوانات یوں ہیں:

1۔ علم اور مذہبی مشاہدات (Knowledge and Religious Experience)
2۔ مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار (Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience)
3۔ ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا (The Concept of God and the Meaning of Prayer)
4۔ خودی، جبر اور حیات بعد الموت (The Human Ego-His Freedom and Immortality)
5۔ اسلامی ثقافت کی روح (The Spirit of Muslim Culture)
6۔ الاجتہاد فی الاسلام (The Principle of Movement in the structure of Islam)
7۔ کیا مذہب کا امکان ہے؟ (Is Religion Possible?)

پہلے خطبے 'علم اور مذہبی مشاہدات' میں کائنات کی حقیقت اور کائنات کی تغیر پذیری میں انسان کا منصب، کائنات اور خدا، کائنات اور انسان، انسان اور خدا کے باہمی رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کائنات کے بارے میں فلسفہ اور مذہب کے رویہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کے مشترک اور غیر مشترک امور سے بحث کرتے ہیں۔ پھر ظاہر اور باطن یعنی مرئی اور غیر مرئی حقائق یا عالم محسوسات اور عالم اقدار وارواح

کے بارے میں مختلف مذاہب کا طرزِ عمل بیان کر کے بتاتے ہیں کہ قرآن مطالعہ انفس و آفاق پر کیوں زور دیتا ہے۔ پھر حقیقت تک رسائی کے ذرائع کی حیثیت سے عقل اور وجدان پر بحث کرتے ہیں۔ اقبال عقل و وجدان اور فکر و ایمان کو ایک دوسرے کا معاون قرار دیتے ہیں۔ وہ ان دونوں کی آمیزش کو مادی اور روحانی زندگی کے لیے لازمی تصور کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ دونوں ہماری ظاہری اور باطنی زندگی کے ترجمان ہیں۔ عقل کا آفاق یعنی مادی دنیا اور وجدان و مذہب کا انفس یعنی روحانی اور باطنی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اقبال کا ماننا ہے کہ عقل اور وجدان میں کوئی آویزش نہیں ہے ، دونوں کا ایک ہی منبع و ماخذ ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر حقیقت کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر کے ایک وقت میں صرف اس کے ایک جزء کا مطالعہ کرتی ہے۔ ایک کی نظر حقیقت کلی کے زمانی پہلو Temporal Aspects of Reality پر اور دوسرے کی نگاہ اس کے سرمدی پہلو Eternal Aspect پر مرکوز ہوتی ہے۔ وجدان کے لیے کل حقیقت، حقیقت حاضرہ ہے اور اس سے پوری طرح بہرہ اندوز ہوتی ہے جب کہ عقل کا سفر تدریجی ہے لیکن تجدید باہمی Mutual Rejuvenations کے لیے دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ برگساں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ وجدان بلند تر عقل ہی کا نام ہے۔

عقل اور مذہب (وجدان) کے اس لازمی رشتے کی وضاحت کے بعد اقبال ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کی فطرت میں عقلیت کے عناصر موجود ہیں اور اس کا ظہور خود نبی ﷺ کی زندگی میں ہو چکا تھا۔ اقبال اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اسلام میں عقلی بنیادوں کا سلسلہ رسول کریم ﷺ کی ذات بابرکات سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنِي حَقَائِقَ الاَشیَاءَ کَمَا ھِیَ (اے اللہ تو مجھے چیزوں کی اصلیت سے آگاہ کر)''

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام معقولیت پسندی کا دشمن نہیں بلکہ وہ اسے اشیائے کائنات کی حقیقت کے انکشاف کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

اقبال کائنات کے بارے میں دین و دانش، مذہب و فلسفہ اور ایمان و عقل کے نقطہ ہائے نگاہ کو بیان کرنے، عقل و وجدان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالنے اور حقیقت مطلقہ کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں پر تبصرہ کرنے کے بعد فلسفۂ یونان اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ فلسفۂ یونان نے تاریخ اسلام پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ اس فلسفہ کے محاسن و معائب کو گناتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ فلسفۂ یونان نے مسلمان مفکرین کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کر دی تھی۔ لیکن مجموعی طور پر اُس نے اُن کی قرآنی بصیرت کو دھندلا دیا تھا۔ سقراط نے اپنی توجہ صرف انفس پر مرکوز کی تھی۔ اس کی رائے میں پودوں، حشرات الارض اور ستاروں کی دنیا ہیچ تھی وہ کائنات میں صرف انسان کی ذات کو لائق مطالعہ خیال کرتا تھا۔ سقراط کا یہ خیال روح قرآنی کے کس قدر خلاف ہے۔''

اس خطبے کے آخر میں اقبال نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ روحانی تجربہ کی صداقت کو تسلیم کرنے کے باوجود ایک شخص پوچھ سکتا ہے کہ جب روحانی تجربہ ایک تاثر کی حالت (State of Feeling) ہے اور اس میں علم بھی موجود ہے اور اس کو دوسروں تک قضایا (Judgements) کی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہے تو کسی دوسرے شخص کے لیے وہ کیوں کر قابل قبول ہو سکتا ہے جس نے یہ تجربہ کیا ہی

نہیں۔ وہ دریافت کرسکتا ہے کہ جو تجربہ میرے سامنے تصدیق کے لیے پیش کیا جارہا ہے اس کی صداقت کی کیا ضمانت ہے، کیا ہمارے پاس اس کی درستی (Validity) کو پرکھنے کے لیے کوئی مضبوط کسوٹی ہے؟ اگر ذاتی تجربے پر مذہب کی سچائی کا مدار ہوتا تو وہ چند ہی افراد تک محدود ہوتا۔ اقبال کی رائے میں صوفی اور پیغمبر کی وجدانی کیفیت میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیوں کہ اس وجدانی کیفیت کے ختم ہونے پر پیغمبر بنی نوع انسان کے لیے پیغام انقلاب لے کر آتا ہے لیکن اس کے برعکس صوفی کے سامنے صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ صوفیانہ تجربات ومشاہدات کے خصائص واضح کرنے کے بعد اس بات کو دہراتے ہیں کہ صوفیانہ تجربہ بھی علم کا حقیقی، مفید اور اہم ذریعہ ہے۔

اقبال نے دوسرے خطبے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ حقیقت مطلقہ کا ادراک عقلی استدلال کے ذریعے ممکن نہیں ہے کیوں کہ عقل حقیقت کو اجزاء میں تقسیم کردیتی ہے۔ ادراک خدا کا ذریعہ روحانی تجربہ ہے۔ خطبے کا آغاز وجود باری تعالیٰ کے اثبات سے ہوتا ہے۔ علم کلام کے ماہرین نے ہستی باری تعالیٰ کے اثبات میں تین طرح کے دلائل دیے ہیں۔

1۔ کائنائی دلیل (Comsological Argument)

2۔ غایتی دلیل (Teleological Argument)

3۔ وجودیاتی دلیل (Ontological Argument)

اقبال نے ان کلامی دلائل پر نقد کیا ہے لیکن دلائل کی تفصیل نہیں کی ہے۔ کائناتی دلیل یہ ہے کہ ہر حرکت کے لیے ایک محرک کا وجود لازمی ہے۔ بالفاظ دیگر ہر معلول کے لیے ایک علت ناگزیر ہے۔ اس فلسفے کی رو سے ایک چیز دوسری چیز کے وجود کا باعث بنتی ہے۔ پھر وہ دوسری چیز کسی اور چیز کو جنم دیتی ہے۔ اسی طرح علت ومعلول کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور آخر کار یہ سلسلہ خُدا پر جا کر ختم ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ وہ سب غایتوں کی غایت اولیٰ ہے۔ اس قسم کے استدلال کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ خود اپنے ہی اصول کی تردید کرتا ہے کیوں کہ یہ سلسلہ علت ومعلول کو خدا پر ختم کردیا ہے۔ فلسفیانہ نقطہ نظر سے خدا بھی تو کسی علت کا معلول ہوسکتا ہے اور اگر نہیں تو یہ اصول ہی غلط ہوجاتا ہے۔ اس استدلال کی دوسری خامی یہ ہے کہ وہ خُدا کو محدود کرتا ہے کیوں کہ محدود معلول محدود علت کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر کوئی استدلال ہمارے دل ودماغ میں خدا کی ہستی کا یقین کامل پیدا نہیں کرسکتا۔

غایتی دلیل کا تعلق کائنات اور اس کی اشیاء میں غیر معمولی نظم وترتیب اور حیات وجمال کی موجودگی سے ہے۔ آپ اس عالم رنگ وبو کی جس چیز کو بھی غور سے دیکھیں اور اس کے باطن کا مطالعہ کریں تو صاف محسوس ہوگا کہ اس میں عقل کو حیرت میں ڈال دینے والا ایک نظام عمل کارفرما ہے۔ اس کا نظم وقانون اس درجہ مستحکم ہے کہ کبھی اس کے خلاف کوئی عمل یا واقعہ ظاہر نہیں ہوتا۔ خود انسان کا اپنا وجود اس نظم وقانون اور مقصدیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آنکھ، کان، ناک، منہ، قلب، دماغ، غرض کہ جس عضو بدن کی ساخت اور نظام عمل کو غور سے دیکھیں ہر جگہ ایک مخصوص غایت کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ حیرت انگیز نظام عمل کسی بلند وبرتر ذہن کا زائیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کائنات کے ہر گوشے میں نظم وترتیب اور مقصدیت کے آثار وشواہد ایک ایسی ہستی کی خبر دیتے ہیں جو علم وحکمت میں منتہائے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔

خدا کی ہستی کے بارے میں تیسری دلیل وجودیاتی دلیل ہے جسے مختلف مفکرین نے مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے۔ اس وجودیاتی استدلال کی رُو سے خدا کا تصور ہی اُس کی ہستی کا واضح ثبوت ہے۔ اس فلسفۂ خیال کے حامیوں کی رائے میں اگر خدا موجود نہ ہوتا تو اس کا تصور بھی ہمارے

دماغ میں جاگزیں نہ ہوتا۔ جب تک کوئی چیز موجود نہ ہو اُس کا تصور ناممکن ہے۔

اقبال کے خیال میں وجودیاتی استدلال کائناتی استدلال سے ملتا جلتا ہے کیوں کہ جس طرح اس میں خُدا کو تمام علتوں کی آخری علت پہلے سے فرض کرلیا جاتا ہے اسی طرح وجودیاتی استدلال میں خُدا کے وجود کو بھی پہلے سے ہی فرض کیا جاتا ہے۔

ان دلائل پر بحث کرنے کے بعد اس خطبہ کے اختتام پر اقبال دعا کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اور فلسفہ اور مذہب کا مقابلہ کرتے ہوئے مذہب کو فلسفے پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ فلسفہ حقیقت کاملہ کو دور سے دیکھتا ہے اس کے برعکس مذہب اس حقیقت سے قرب و اتصال چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ صرف افکار و نظریات پر مشتمل ہوتا ہے لیکن مذہب زندہ تجربے کا نام ہے اس میں فکر کے علاوہ عمل و یقین بھی شامل ہوتا ہے۔ فلسفے کو پستی سے بلند مقام تک جانے کے لیے ذکر و قربِ خدا کی ضرورت ہے، اسے مذہب کی اصطلاح میں دعا کہا جاتا ہے۔ گویا کہ علامہ اقبال فکر و ذکر کے امتزاج کے حامی ہیں۔

خطبہ سوم جس کا عنوان (The Concept of God and the meaning of Prayer) (ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا) ہے اس خطبہ میں اقبال نے مندرجہ ذیل امور پر بحث کی ہے:

1۔ مذہبی حقائق کی عملی تعبیر کیا ہے؟

2۔ مردِ کامل یا انائے مطلق کی صفات کیا ہیں؟ اسلامی تصورِ خُدا کیا ہے؟

3۔ نظریہ تخلیق کائنات کیا ہے؟ نظریہ ارتقا کا بیان۔

4۔ فلسفہ زمان و مکان۔ خودی اور زمانے کا کیا تعلق ہے؟

5۔ فلسفہ جبر و قدر وغیرہ۔

اس خطبہ کی ابتدا میں اقبال نے اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ مذہبی واردات اور روحانی کیفیات کافی حد تک عقلی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ان تمام واردات کی اساس ایک ایسی تخلیقی مشیت ہے جو عقل و حکمت کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس قسم کی ہستی کو ہم انائے مطلق کہتے ہیں۔ اقبال نے اس اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہبی حقائق و معارف کی عقلی تعبیر و تشریح ممکن ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے انائے مطلق یا ذات غیر محدود کی صفات کو قرآنی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سورۂ اخلاص اور سورۂ نور کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے نظریہ تخلیق کائنات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں ارسطو اور اشاعرہ کے نظریات کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مادیت اور روحانیت کے اہم موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے اقبال نے ہر لحاظ سے کائنات کی اصل روحانیت (Spiritual) ثابت کی ہے۔ زمان و مکان کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے ارسطو، زینو، اشاعرہ، جلال الدین دوّانی، عراقی، رازی، برگساں وغیرہ کے افکار عالیہ کے محاسن و معائب بیان کیے ہیں۔ زمان و مکان کی بحث کے دوران انہوں نے خودی کے موضوع کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ زمان و مکان، کائنات اور خُدا کے ساتھ خودی کے باہمی ربط کی نوعیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ خودی کی اہم صفات مثلاً خلوت و جلوت، خلاقی صفات اور اختیار کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے۔ اس کے بعد اقبال نے چند نمایاں ترین خدائی صفات جیسے علم، طاقت، سرمدیت اور خلاقی کی اہمیت و افادیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

چوتھے خطبے ''خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت'' میں علامہ اقبال خودی کی بحث کرتے ہیں اور انسان کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے

ہیں کہ قرآن کے مطالعے سے تین باتیں بالکل واضح دکھائی دیتی ہیں۔پہلی یہ کہ انسان خدا کی برگزیدہ مخلوق ہے۔دوسری یہ کہ انسان اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود زمین پر خدا کا نائب ہے۔تیسری اہم ترین بات یہ ہے کہ انسان آزاد شخصیت کا امین ہے۔اس خطبے میں وہ ماضی سے رشتہ منقطع کیے بغیر اسلامی تعلیمات کو جدید علوم کی روشنی میں بیان کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور پھر خودی کی وضاحت کی طرف آجاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ خودی وابستۂ مکان نہیں ہے۔مثلاً یہ کہنا ممکن نہیں کہ تاج محل کے حسن و جمال کے بارے میں میرا جذبۂ تحسین آگرہ سے مسافت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

اسی طرح زمان بھی خارجی دنیا میں ماضی، حال اور مستقبل کی صورت اختیار کرنے کے باوجود اندرونی دنیا میں ناقابلِ تقسیم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ خلوت پسندی خودی کی یکتائی کا اظہار ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شعوری تجربہ خودی کے روحانی جوہر کا صحیح سراغ نہیں دے سکتا لیکن اس کے باوجود شعوری تجربے کی تعبیر ہی وہ شاہراہ ہے جس پر چل کر ہم خودی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔اقبال کے لیے یہ امر موجبِ حیرت ہے کہ مسلمان فلاسفہ نے انسانی شعور کی وحدت میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔حالاں کہ انسانی نفس کی یہ وحدت انسانی شخصیت کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔علاوہ ازیں مسلمان حکماء نے یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر روح کو مادّے کی ایک لطیف شکل قرار دیا تھا جو جسم کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اور جسے قیامت کے دن دوبارہ تخلیق کیا جائے گا۔گویا مسلمان فلاسفہ بھی غیر اسلامی تصورات کے زیر اثر روح اور مادے کی ثنویت کے قائل ہو گئے تھے۔یہ تصورات اپنے آغاز وارتقا میں مجموعی طور پر مجوسی الاصل ہیں۔اقبال کسی طرح بھی جسم و جان اور روح اور مادے کی ثنویت میں یقین نہیں رکھتے۔اقبال کی رائے میں یہ دونوں چیزیں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

پانچویں خطبے ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں اقبال اسلامی کلچر کی روح کا ذکر کرتے ہیں اور نبوت اور ولایت کا فرق واضح کرتے ہیں۔ولی کا منتہائے مقصود صرف ذات ربانی سے وصال ہے لیکن نبی اس صعود کے بعد ہدایت عامہ کے لیے نزول کرتا ہے۔اس خطبے کا آغاز مشہور صوفی عبدالقدوس گنگوہی کے اس قول سے ہوا ہے۔''محمد عربی ﷺ آسمان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئے اور واپس آگئے۔خُدا کی قسم اگر میں اس بلندی تک گیا ہوتا تو کبھی زمین پر واپس نہیں آتا۔''

اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے کہ ایک پیغمبر اور صوفی کے شعوری تجربے میں نفسیاتی اعتبار سے جو فرق ہے وہ عبدالقدوس گنگوہی کے مذکورہ الفاظ سے بالکل واضح ہے۔صوفی روحانی تجربے کی بلندیوں تک پہنچتا ہے اور وہاں سے فراغ خاطر کی جس نعمت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے اس حالت اور مقام سے وہ کبھی جدا ہونا پسند نہیں کرتا اور اگر کبھی ان مقامات بلند سے اترتا ہے تو خدمت انسانیت کے نقطہ نظر سے اس کی یہ واپسی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔اس کے برخلاف پیغمبر روحانی تجربے کے انتہائی بلندیوں تک جانے کے باوجود واپس آتا ہے اور اس کی یہ واپسی تمام تر تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہے۔اس کا پیغام انقلاب انگیز ہوتا ہے، وہ تاریخ کا رخ بدلتا ہے اور دنیا کو نئے تصورات سے آشنا کرتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اپنے روحانی تجربے کو ایک زندہ اور متحرک عالم گیر قوت میں تبدیل کرے۔

اقبال کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔وہ اپنے الہام کے سرچشمے کی بدولت عالم قدیم سے متعلق ہیں، لیکن اپنی الہامی سیرت کی وجہ سے عصر حاضر سے مربوط ہیں۔اُن کی بدولت زندگی نے اپنی نئی سمتوں کے مناسب علوم اور نئے سرچشمے دریافت کیے۔دراصل اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔وہ فقہ کو اسلام کی اصل قوت قرار دیتے ہیں۔جو اسے سب

زمانوں کے لیے کافی بنا دیتا ہے۔

تصوف اور شریعت میں فرق واضح کرنے کے بعد اقبال عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت وعظمت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ختمِ نبوت کے عقیدے کو اسلامی تعلیمات کا اہم جز وتصور کرتے ہیں۔ انہوں نے ختم نبوت کے نظریے کی ثقافتی قدر و قیمت کو بڑے ہی دلنشین اور موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ شعور نبوت دراصل وہ شعور ہے جو اپنی حدود سے تجاوز کر کے ثقافتی زندگی کی تشکیل جدید اور راہنمائی کے لیے نئے نئے مواقع تلاش کرتا رہتا ہے۔ نبوت کی اہمیت کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے دوران اقبال نے وحی کے وسیع استعمال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

وحی اور ختم نبوت کی بحث کے بعد اقبال نفس موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی اسلامی کلچر کی روح۔ اس سلسلے میں اقبال کی بحث جامع اور مدلل ہے۔ اسلامی کلچر کی بنیادی خصوصیات یہ ہے کہ اس نے مطالعہ کائنات میں عقل وفکر کی اہمیت کو واضح کیا اور خارجی کائنات اور اس کے آثار وشواہد پر غور وفکر کی تلقین کی۔ اس کا تصورِ حیات وکائنات حرکی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید اقوام وملل کی تاریخ کے مطالعہ پر بھی زور دیتا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے حصول علم کے تین اہم ماخذ ہیں:

باطنی مشاہدات، مطالعۂ فطرت اور تاریخ۔ قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ مطالعۂ انفس وآفاق کی دعوت اور اقوام عالم کی تاریخ پر مشتمل ہے اور دونوں جگہ مقصود ایک ہے یعنی حقیقت الحقائق تک رسائی اور اخروی زندگی کا احقاق۔ الغرض اس خطبے میں علامہ اقبال نے اسلامی ثقافت کی نمایاں ترین خصوصیات پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فلسفۂ یونان اور مغربی ثقافت کے بھی نقائص بیان کیے ہیں۔

چھٹے خطبے کا عنوان ہے ''الاجتہاد فی الاسلام'' یہ خطبہ اقبال نے "The Principle of Movement in the Structure of Islam" کے عنوان سے دیا تھا۔ اس خطبے کا مرکزی خیال اجتہاد، اس کی ضرورت اور تقاضے ہیں۔ اقبال کی نگاہ میں اسلام اپنے حرکی نظریۂ حیات اور تصور توحید کی وجہ سے تمام زمانوں پر محیط اور بنی نوع انسان کی وحدت کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ اس لیے اسلام ہی کسی قوم کو قیادت اقوام کے اہل بناتا ہے۔ اقبال اسلام میں فقہی جمود کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کے اسباب میں عقل پرستی کی تحریکوں، راہبانہ تصوف اور سیاسی انتشار کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ دین اور سیاست دو مختلف حقیقتیں نہیں بلکہ اسلام کی واحد حقیقت کے ستون ہیں۔ وہ عقیدۂ توحید کو بنی نوع انسان کی وحدت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، جو مصنوعی امتیازاتِ رنگ ونسل وغیرہ کو مٹا کر ساری انسانیت کو ملتِ واحدہ بنا سکتا ہے۔ پھر وہ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس یعنی اَدِلّہ شرعیہ پر بحث کرتے ہیں، جن کی وجہ سے اسلام کا ہر زمانے اور کل انسانیت کے لیے منبع ہدایت ہونا ممکن ہے۔

ساتویں خطبے جس کا عنوان ''کیا مذہب کا امکان ہے'' (Is Religion Possible) ہے میں علامہ اقبال نے مذہبی، صوفیانہ، سائنسی، فلسفیانہ اور نفسیاتی مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے شروع میں مذہبی زندگی کے تین مراحل یعنی ایمان، فکر اور انکشافِ ذات پر روشنی ڈالی ہے۔ دور ایمان دین اور شریعت سے تعلق رکھتا ہے۔ دور تفکر فلسفہ اور حکمت سے متعلق ہے اور دورِ انکشاف ذات، نفسیات اور تصوف سے بحث کرتا ہے۔

مندرجہ بالا موضوعات کی تشریح کرنے کے بعد اقبالؒ مابعد الطبیعات کے بارے میں فلسفے اور مذہب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں کانٹ کے نظریات پر تنقید کرتے ہوئے عراقی اور محی الدین عربیؒ کے تصورات بھی پیش کرتے ہیں۔ کانٹ نے سب سے پہلے سوال اُٹھایا تھا کہ کیا مابعد الطبیعات ممکن ہے''۔

اس نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تھا۔ اُس نے مابعدالطبعیات کو بے معنی قرار دیا تھا کیوں کہ اُس کی رائے میں محسوسات کے دائرۂ عمل سے باہر کوئی تجربہ ممکن ہی نہیں، چوں کہ مابعدالطبیعات کے مسائل لازمی طور پر محسوسات سے متعلق نہیں ہوتے۔ اس لیے اُن کا وجود قابلِ قبول نہیں۔

سائنس اور مذہب کے مقامات اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد اقبال رومی کے نظریۂ ارتقار جائیت پر مبنی خیال کرتے ہوئے یورپ کے تصورِ ارتقا کو ناقص اور قنوطیت پر منحصر قرار دیتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ ارتقا نے انسان کے حیاتیاتی مستقبل کے بارے میں رومی کے جوش وخروش کو جنم دیا۔ اس کے برعکس یورپی تصورِارتقا نے انسان کو مایوسی اور ذہنی اضطراب کا شکار بنا دیا ہے۔

اس خطبہ کے آخر میں اقبال خودی کے موضوع پر بھی رائے زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقیقت مطلقہ کی جستجو میں خودی کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ خودی کا حقیقی نصب العین فکر کے بجائے عمل ہے۔ اپنی انفرادیت کو گم کرنے کے بجائے خودی کو اپنے استحکام اور بقا کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ آخر میں اقبال خودی کی اہمیت اور اس کے مدارج کو واضح کرنے کے لیے جاوید نامہ کے چند اشعار بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ الغرض اس لیکچر میں علامہ موصوف نے ہر ممکن ذریعے سے مذہب کے امکان، اہمیت، عظمت اور افادیت کو کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

16.3 خطبہ برائے مطالعہ

ساتواں خطبہ: کیا مذہب کا امکان ہے؟

اجمالاً پوچھیے تو مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں ہوجاتی ہے۔ جن میں ہر دور کو ایمان، فکر اور معرفت کے ادوار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ایمان کا ہے، دوسرا فکر تیسرا عرفان کا۔ دور اول کی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس میں مذہب کا ظہور ایک ایسے نظم وضبط کی شکل میں ہوتا ہے جیسے افراد ہوں، یا اقوام ایک حکم کے طور پر اور اس لیے بے چوں و چرا قبول کر لیتے ہیں۔ انہیں اس امر سے بحث نہیں ہوتی کہ اس نظم وضبط کی حکمت از روئے عقل وفکر کیا ہے اور مصلحت کیا۔ سیاسی اور ملکی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ طرز عمل قوموں کی تاریخ میں بڑے بڑے دوررس اور وقیع نتائج کا باعث ہوتا ہے لیکن جہاں تک افراد کے اندرونی نشوونما اور وسعت ذات کا تعلق ہے اس پر اس سے کوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ نظم وضبط کی پوری پوری اطاعت کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب لوگ عقلاً اس پر غور کرتے اور سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس کا حقیقی سرچشمہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مذہب کو کسی ایسی مابعدالطبعیات کی جستجو رہتی ہے جو اس کے لیے اساس کا کام دے سکے۔ یعنی منطقی اعتبار سے کائنات کے کسی ایسے نظریے کی جو تضاد و تناقض سے پاک ہو اور جس میں خدا کے لیے بھی کوئی جگہ ہو۔ لیکن تیسرا دور آتا ہے تو مابعدالطبعیات کی جگہ نفسیات کے لیے خالی ہوجاتی ہے اور انسان کو یہ آرزو ہوتی ہے کہ حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتحاد و اتصال قائم کرے۔ چناں چہ یہی مرحلہ ہے جس میں مذہب کا معاملہ زندگی اور طاقت وقدرت کا معاملہ بن جاتا ہے اور جس میں انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ ایک آزاد اور بااختیار شخصیت حاصل کرلے، شریعت کے حدود و قیود کو توڑ کر نہیں بلکہ خود اپنے اعماق شعور بیں اس کے مشاہدے سے۔ جیسا کہ صوفیا اسلام میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک مومن کے دل پر بھی کتاب کا نزول ویسے نہ ہوجائے جیسے آنحضرتؐ پر ہوا تھا اس کا سمجھنا محال ہے۔ مذہب کا یہی آخری مرحلہ ہے جس کے پیش نظر میں اس بحث میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے لفظ مذہب کا استعمال کر رہا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس صورت میں تصوف کی اصطلاح اختیار کی جائے تو اسے کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا، کیوں کہ تصوف کے متعلق عام خیال تو یہی ہے کہ اس سے مراد ہے وہ مخصوص ذہنی روش جس کا تقاضا ہے زندگی کی نفی اور حقائق سے چشم پوشی۔ لہٰذا اسے عصر حاضر کے اس مطمح نظر سے کیا نسبت جس کا سارا زور ہی محسوسات پر ہے؟ حالاں کہ اپنی اعلیٰ اور ارفع شکل

میں مذہب کی حیثیت بھی سرتاسر محسوسات و مدرکات کی ہے، کیوں کہ وہ بھی اپنے رنگ میں ایک ایسی زندگی کی جستجو ہے جس میں وسعت اور افزونی ہو۔ چناں چہ مذہب نے تو سائنس سے بھی بہت پہلے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ اس کی بنا محسوسات و مدرکات پر ہونی چاہیے۔ لہٰذا اسے بھی اپنی جگہ پر یہ کاوش ہے کہ شعور انسانی کی گتھیاں سلجھائے۔ بالفاظ دیگر اگر فلسفہ طبیعی کو ان حقائق کی تنقید اور چھان بین مطلوب ہے جو اس کے پیش نظر ہیں تو مذہب بھی اپنے مخصوص حقائق کی تنقید کرتا اور دیکھتا ہے کہ ان میں غلط کیا ہے اور صحیح کیا۔

پھر جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کانٹ ہی نے سب سے پہلے یہ سوال اٹھایا تھا کہ مابعدالطبیعات کیا ممکن ہے اور کانٹ ہی نے جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے اس کا جواب نفی میں دیا تھا۔ لیکن مابعدالطبیعات کی نفی میں اس نے جو دلائل پیش آئے ہیں ان سے وہ حقائق بھی محفوظ نہیں رہتے۔ جن سے مذہب کو بہت قریب کا تعلق ہے۔ کانٹ کہتا ہے اس سے پہلے کہ موجودات حواس ہمارے علم میں آئیں ضروری ہے کہ وہ ضابطے کی کچھ شرائط پوری کریں۔ ہمارا ان کو شئے کہنا بھی گویا ان کی تحدید کرنا ہے، کیوں کہ ہم ان کو شے کہتے ہیں تو اس لیے کہ ان میں نظم و ربط پیدا کر سکیں۔ لہٰذا ہمارے کسی خیال کے مقابلے میں اگر سچ مچ کچھ موجود ہے تو یا جو کچھ ہے ہمارے محسوسات و مدرکات کے حلقے سے باہر رہے گا اور اس لیے از روئے عقل ہم اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن کانٹ کے اس زور استدلال نے جو فیصلہ صادر کیا ہے ہمیں اس کے صحیح ماننے میں تامل ہے۔ بلکہ اب تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کے جدید اکتشافات کو دیکھیے تو عقلاً بھی الٰہیات کے ایک مرتب نظام کی تشکیل کچھ زیادہ دشوار نظر نہیں آتی جیسا کہ کانٹ کا کبھی خیال تھا۔ مثلاً سائنس کا یہی اکتشاف کہ مادہ لہروں ہی کی ایک مخفی صورت ہے، یا یہ کہ کائنات فکر ہی کا ایک عمل ہے، یا یہ کہ زمان و مکان متناہی ہیں۔ علیٰ ہٰذا ہائیزن برگ کا اصول عدم لزوم، بایں ہمہ مسئلہ زیر بحث کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر زیادہ گہری نظر ڈالیں۔ کانٹ کا کہنا یہ ہے کہ شئے عقل محض بذاتہ کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتی، کیوں کہ اس کا وجود محسوسات و مدرکات کے حلقے سے باہر ہے، صرف اس صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ معمولاً ہم اشیا کا مشاہدہ جس طرح کرتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے محسوسات و مدرکات کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ محسوسات و مدرکات کی طبعی سطح کے علاوہ کوئی ایسی سطح بھی ہے جہاں ہمارے محسوسات و مدرکات علم کا سرچشمہ بن سکیں؟ کانٹ نے تو اس مسئلے میں کہ مابعدالطبیعات کا وجود کیا ممکن ہے جو فیصلہ صادر کیا ہے اس نظریے کے ماتحت کہ ایک تو شے ہے 'بذاتہٖ' اور ایک شئے ہے 'بظاہر' لیکن فرض کیجئے معاملہ یوں نہ ہو جیسا کانٹ کا خیال تھا بلکہ اس کے برعکس ہو، چناں چہ اسلامی اندلس کے مشہور صوفی فلسفی محی الدین ابن عربی کا یہ قول کیا خوب ہے کہ وجود مدرک تو خدا ہے، کائنات معنی۔ ایسے ہی ایک دوسرے مسلمان صوفی مفکر اور شاعر عراقی نے کہا ہے زمان و مکان کے متعدد نظامات ہیں۔ حتیٰ کہ ایک وہ زمان و مکان بھی ہے جو صرف ذات الٰہیہ سے مخصوص ہے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ ہم جسے کائنات، یا عالم خارجی ٹھہراتے ہیں وہ عقل ہی کی ایک تاویل ہو۔ بعینہٖ محسوسات و مدرکات کے بعض ایسے مراتب کا وجود بھی غیر ممکن نہیں جو اپنے ربط و نظم کے لیے زمان و مکان کے کسی جداگانہ نظام کے مقتضی ہیں۔ یعنی وہ مراتب جن میں معانی کو دخل ہوگا نہ تحلیل و تجزیہ کو جیسا کہ طبعی مراتب کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ مراتب معانی کے عمل دخل سے آزاد ہیں تو ان کے ذریعے جو علم حاصل ہوگا اسے ایک کلیے کے طور پر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ صرف معانی ہیں جن میں ہم دوسروں کو شریک کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب صرف مذہبی واردات پر قناعت کرتے ہیں ہم حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمارا نقطۂ نظر لازماً انفرادی ہو جاتا ہے اور اس لیے ناممکن ہے ہم دوسروں کو بھی اس میں شریک کر سکیں۔ یہ اعتراض خاصا وقیع ہے لیکن صرف اس صورت میں جب صوفیا ان طور طریقوں سے باہر قدم نہ رکھیں جو روایتاً چلے آ رہے ہیں۔ یعنی جب ان کا ہر طرز عمل اور ہر توقع

روایات کے دائرے میں محدود رہے۔قدامت پرستی کوئی اچھی چیز نہیں۔اس سے مذہب کی دنیا میں بھی وہی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اعمال انسان میں کسی اور پہلو سے۔اس سے خودی کی تخلیق آزادی سلب ہو جاتی ہے اور اس میں یہ جرأت ہی نہیں رہتی کہ عالم روحانیات میں کسی دوسرے راستے سے قدم بڑھا سکے۔یہ جو سلوک وعرفان کے ان طریقوں سے جو ازمنۂ متوسط میں صوفیا نے وضع کیے اب اس قسم کے افراد پیدا نہیں ہو رہے جو قدیم حق وصداقت کا پھر سے انکشاف کریں تو اس کی سب سے بڑی وجہ بھی ہماری یہی قدامت پرستی ہے۔بہرحال مذہبی واردات کو اگر دوسروں تک پہنچانا ممکن نہیں تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اہل مذہب کی جستجو سرتاسر عبث اور لاحاصل ہے، کیوں کہ واردات کی یہی تو وہ خصوصیت ہے جس سے ہمیں خودی کی حقیقت کا تھوڑا بہت سراغ مل جاتا ہے۔ہماری روزمرہ کی زندگی بھی تو باوجود ربط وضبط کے بے تعلقی اور انزدا کی زندگی ہے۔ہمیں اس سے کیا غرض کہ دوسروں کے اعماق ذات میں اتر کر ان کی انفرادیت تک پہنچیں۔ہم تو یہی دیکھا کرتے ہیں ان سے کیا وظائف سرزد ہوتے ہیں اور ہم ان سے سروکار بھی رکھتے ہیں تو اسی لحاظ سے کہ ان کی جداگانہ شخصیت کے کون سے پہلو ہمارے تصورات کی گرفت میں آسکتے ہیں۔برعکس اس کے مذہبی زندگی کا معراج کمال ہی یہ ہے کہ خودی اپنے اندر زیادہ گہری انفرادیت کا احساس پیدا کرے، بہ نسبت اس کے جو عادتاً اس کے تصور میں آتی ہے۔دراصل یہ صرف وجود حقیقی ہے جس سے اتصال میں خودی کو اپنی یکتائی اور مابعدالطبیعی مرتبہ ومقام کا عرفان ہوتا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اس مرتبہ ومقام میں کہاں تک اصلاح اور اضافہ ممکن ہے۔لہٰذا صاف صاف پوچھیے تو جن واردات سے اس عرفان کا تعلق ہے ان کی حقیقت عقلی حقائق کی نہیں کہ معانی اور تصورات کی گرفت میں آئیں۔یہ زندگی کے واردات ہیں، بہ الفاظ دیگر خودی کی وہ روش جو نتیجہ ہے خود ہمارے اندرون ذات میں زبردست حیاتی تغیرات کا اور جس کو ناممکن ہے منطق کے مقولات اپنے دام میں لاسکیں۔ان کا اظہار ہوگا تو کسی ایسے عمل سے جو عالم انسانی کو زیروزبر کردے۔یا پھر یہ کہ ان سے ایک نئی دنیا تعمیر کی جائے۔چناں چہ یہی ایک صورت ہے جس میں ان لازمانی واردات کا مشمول زمانے کی رو میں نفوذ کرتا اور ایک ایسی مرئی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے تاریخ اس کے مشاہدے پر مجبور ہو جاتی ہے۔معلوم ہوتا ہے تصورات کا ذریعہ حقیقت متعلقہ تک پہنچنے کا کوئی عمدہ ذریعہ نہیں۔لہٰذا اگر ان کی مدد سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی تو یہ کوشش کچھ بہت زیادہ موثر ثابت نہیں ہوگی۔سائنس کو اس امر سے کیا غرض کہ برقیے کا وجود حقیقی ہے یا غیر حقیقی، کیوں کہ ہوسکتا ہے یہ محض علامت ہو، یا محض ایک نام۔لہٰذا یہ صرف مذہب ہے جو حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے کیوں کہ وہ بجائے خود ایک طریق زندگی ہے۔سائنس سے زیادہ سے زیادہ کوئی نتیجہ مرتب ہوسکتا ہے تو یہ کہ ہم اس کے ماتحت ان تصورات کی چھان بین کریں جو از روئے فلسفہ الٰہیات میں داخل کر لیے جاتے ہیں، یا پھر ہوسکتا ہے وہ ہمیں عقل کی اس کارفرمائی ہی سے بدگمان کردے جو اس قسم کے تصورات وضع کرتی ہے۔سائنس کے لیے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مابعدالطبیعات کو سرے سے نظرانداز کردے۔یا پھر جیسا کہ لانگے کا خیال تھا یہ سمجھیں کہ اس قسم کی شاعری میں کیا مضائقہ ہے، یا بقول نیٹشے یہ کہ آدمی بڑا ہو جائے تو اسے اس مشغلے کی اجازت ہونی چاہیے۔لیکن جس کسی نے مذہب کے راستے پر اس لیے قدم رکھا ہے کہ اشیا کی ترکیب میں اپنا مرتبہ ومقام دریافت کرے وہ اپنی اس جدوجہد کے پیش نظر اس بات پر قناعت نہیں کرے گا جس کو سائنس ایک حیاتی جھوٹ، یا محض جیسا کہ سے تعبیر کرتا ہے تاکہ ہم اپنے فکر اور عمل میں نظم وربط پیدا کرسکیں یوں بھی جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ حقیقت مطلقہ کی کن اور ماہیت کیا ہے سائنس کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔برعکس اس کے خودی چوں کہ بذات خود زندگی اور اس کے واردات یعنی مشاہدات اور تجربات کے حصول اور جذب واکتساب کا ایک مرکز ہے لہٰذا مذہب کے معاملے میں اس کی ساری ہستی خطرے میں ہوگی۔یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی سیرت اور کردار کی بنا محض کسی ''فریب'' یا ''قیاس'' پر رکھیں کیوں کہ یہ سیرت اور کردار ہی تو ہے جس سے انجام

کار صاحب کردار کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ فرض کیجئے ہم ایک غلط تصور قائم کرتے ہیں۔ اس سے اتنا ہی تو ہوگا کہ ہمارا فہم وخرد گمراہ ہوجائے لیکن ایک ناسزا فعل کے ارتکاب سے تو ہماری ساری ہستی قعر مذلت میں جا گرتی ہے، بلکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم شاید اپنی خودی کی دولت بھی کھو بیٹھیں۔ ''خیال'' سے زندگی صرف ایک حد تک متاثر ہوتی ہے۔ برعکس اس کے 'عمل' کو حقیقت سے ایک حرکت یا نسبت ہے۔ لہٰذا عمل کا سرچشمہ ہے انسان کا وہ رویہ جو حقیقت کے بارے میں بالعموم مستقلاً اختیار کیا جاتا ہے۔

لہٰذا ''عمل'' یا دوسرے لفظوں میں نفسیاتی اور عضویاتی افعال پر ہمارا اس لیے قابو رکھنا کہ خودی کے اندر حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتصال کی صلاحیت پیدا ہوجائے بہ اعتبار ہیئت اور بہ اعتبار مشمول انفرادی ہی رہے گا۔ بایں ہمہ اس کے اندر بھی یہ خصوصیت موجود ہے کہ دوسروں کو اپنے ساتھ شریک کرلے اور وہ اس طرح کہ ہم بھی اسی کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں اور خود دیکھ لیں کہ حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کے لیے ہمارا یہ طریق کہاں تک موثر ہے۔ لہٰذا کاملان مذہب کا کہنا تو یہی ہے کہ شعور کے طبعی مراتب کے حوالی میں بعض دوسرے مراتب بھی بالقوہ موجود رہتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کا تعلق کس ملک، یا کس زمانے سے تھا۔ لہٰذا ان مراتب کی موجودگی سے اگر بعض ایسے مشاہدات اور ایسے احوال بھی ممکن ہوجاتے ہیں جو ہمارے لیے علم کا ذریعہ بن سکیں تو پھر ہمارا یہ قول سرتاسر حق بجانب ہوگا کہ مذہب بھی دراصل نام ہے محسوسات ومدرکات کے ایک برتر مرتبے کا اور اس لیے ہمیں چاہیے اس مسئلے پر نہایت درجہ سنجیدگی سے توجہ کریں۔

پھر قطع نظر اس سے کہ ہمارا یہ قول حق بجانب ہے یا نہیں تہذیب جدید کا گزر جس مرحلے سے ہو رہا ہے اس کے پیش نظر یہ مسئلہ بعض دوسرے پہلوؤں سے بھی مستحق توجہ ہوجاتا ہے۔ اول تو کوئی ایسی تہذیب نہیں جو اپنے احساس عالم کا اظہار فلسفۂ فطرت کی کسی نہ کسی شکل میں نہ کرے۔ بعینہ کوئی فلسفہ فطرت نہیں جس کی انتہا کسی نہ کسی جواہریت علیٰ ہٰذا جواہریت حاضرہ جس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی اور جس سے ریاضیات کو وہ حیرت انگیز ترقی ہوئی کہ ہم اس کی رو سے بآسانی کائنات کو ایک مبسوط تفریقی مساوات کی شکل دے سکتے ہیں۔ پھر اس کی بنا پر طبعیات کو بھی جس طرح نشوونما ہوا اس کا یہ عالم ہے کہ اس کے اپنے ہی منہاجات نے اپنی اس عبادت گاہ کے کئی ایک بت توڑ ڈالے، حتیٰ کہ اب ہم اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالم کائنات کی حقیقت کیا واقعی یہی ہے کہ وہ ایک سلسلہ ہے علت ومعلول کا؟ کیا ایسا نہیں کہ حقیقت مطلقہ کسی اور راستے بھی ہمارے شعور میں درآتی ہو؟ کیا عالم فطرت پر تسخیر کا صرف ایک ہی منہاج ہے، یعنی منہاج عقل وفکر؟ پروفیسر اڈنگٹن کہتے ہیں ''ہم نے یہ تو مان لیا ہے کہ طبعیات کی رو سے جن چیزوں کی ہستی کا اقرار لازم آتا ہے باعتبار ماہیت ہم ان کو حقیقت کا ایک جزوی پہلو ہی ٹھہرائیں گے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ہم اس کے دوسرے پہلوؤں کی طرف قدم بڑھائیں تو کس طرح؟ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ موجودات طبیعی کی نسبت ہمیں ان سے بہت کم سروکار رہتا ہے۔ ہمارے احساسات ہمارے مقاصد اور ہماری قدریں ہمارے شعور کا ویسا ہی جزو لاینفک ہیں جیسے ارتساتِ حس جن کی پیروی سے ہم نے عالم خارجی میں قدم رکھا۔ لیکن پھر ان دوسرے عناصر کی پیروی کی گئی تو ہم کسی اور ہی عالم میں جا پہنچیں گے، زمان ومکان کی دنیا میں بہرحال قدم نہیں رکھیں گے۔

مزید برآں ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عملی اعتبار سے بھی یہ مسئلہ کچھ کم اہم نہیں عہد حاضر کے تنقیدی فلسفوں اور علوم طبیعہ میں اختصاص نے انسان کی جو حالت کر رکھی ہے بڑی ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے فلسفۂ فطرت نے تو بے شک اسے یہ صلاحیت بخشی کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرلے، مگر مستقبل میں اس کے ارادہ اور اعتماد کی دولت چھین کر۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ تصور تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس سے مختلف تہذیبیں، مختلف

اثرات قبول کرتی ہیں۔ دنیائے اسلام میں نظریہ ارتقا کی تشکیل ہوئی تو اس سے حیاتیات ہی کے نقطہ نظر سے انسان کے مستقبل کے لیے مولانا روم کے اندر وہ ذوق وشوق پیدا ہوا کہ آج بھی ایک پڑھا لکھا مسلمان جب ان کے اشعار کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے دل میں مسرت اور ابتہاج کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

از جمادی مردم ونامی شدم
وزنماں مردم بحیوان سرزدم

مردم از حیوانی وآدم شدم
پس چہ ترسم کہ زمردن کم شوم

حملۂ دیگر بمیرم از بشر
پس برآرم از ملائک بال وپر

باردیگر از ملک پراں شوم
آنچہ اندر وہم ناید آں شوم

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون
گویدم کا ناالیہ راجعون

برعکس اس کے یورپ میں اس نظریے کی تشکیل زیادہ تحقیق وتدقیق سے کی گئی وہاں اس کی انتہا اس عقیدے پر ہوئی کہ جہاں تک علوم طبیعہ کا تعلق ہے اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ انسان کو جو گوناگوں صلاحتیں حاصل ہیں آئندہ بھی ان کا کوئی خاص ارتقا جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے انسان میں یاس ونومیدی کی جو کیفیت پیدا ہو چکی ہے وہ اس کو علمی اصطلاحات کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ نطشے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حالاں کہ نطشے کا خیال تھا کہ نظریہ ارتقا کی رو سے یہ ماننا لازم نہیں آتا کہ انسان اپنے ارتقا کی جس منزل میں ہے اس سے آگے ترقی کی کوئی منزل نہیں۔ لیکن نطشے کے دل میں انسان کے مستقبل کے لیے جوش اور ولولے کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کا اظہار عقیدہ ''رجعت ابدی'' میں ہوا اور عقیدہ ''رجعت ابدی'' سے بڑھ کر بقائے دوام کا یاس انگیز تصور آج تک قائم ہی نہیں کیا گیا۔ نیٹشے کے دوامی تکرار سے دوامی تکوین کا اثبات نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس یہ کون سا قدیم تصور ہے جو تکوین کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد

افراد سے۔اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لیے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے۔اس کی نظر حقائق پر ہے یعنی حواس کے اس سرچشمے پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے اور پھر جیسا کہ بکسلے کو بھی خدشہ تھا اور جس کا بہ تاسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے مادیات کے اس باقاعدہ نشوونما نے اس کے رگ وپے بھی مفلوج کر دیئے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت مشرق کی ہے۔اس لیے کہ سلوک وعرفان کے جو صوفیانہ طریق ازمنہ متوسط میں وضع کیے گئے تھے اور جن کی بدولت مشرق ومغرب میں کبھی مذہبی زندگی کا اظہار بڑی اعلیٰ اور ارفع شکل میں ہوا تھا اب عملاً بے کار ہو چکے ہیں۔ یوں بھی اسلامی مشرق میں تو بہ نسبت دوسرے ممالک کے ان سے جو نتائج مرتب ہوئے شاید کہیں زیادہ المناک اور حسرت انگیز ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ طور طریق ان قویٰ کی شیرازہ بندی کریں جن کا تعلق انسان کی اندرونی زندگی سے ہے تاکہ یوں اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ تاریخ کی مسلسل حرکت میں عملاً حصہ لے سکے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ ہمیں دنیا ہی سے منہ موڑ لینا چاہیے۔لہٰذا یہ قدرتی بات تھی کہ ہم اپنی جہالت اور غلامی پر قناعت کر لیتے۔ اندریں صورت اگر ترک اور مصری، یا ایرانی اب نئی نئی وفاداریوں کا سہارا لے رہے ہیں تاکہ یوں انہیں قوت اور طاقت کا کوئی نیا سرچشمہ مل جائے۔مثلاً حب الوطنی یا وطنیت کا جن کو کبھی نیٹشے نے بیماری اور پاگل پن سے تعبیر کیا تھا، یا جن کے متعلق اس کا کہنا یہ تھا کہ ان سے بڑھ کر تہذیب وتمدن کا اور کوئی دشمن نہیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ دور حاضر کا مسلمان قطعاً مایوس ہو چکا ہے وہ سمجھتا ہے اس کی روحانی زندگی کا احیا اب مذہب کے ذریعے ناممکن ہے، حالاں کہ مذہب ہی وہ ذریعہ ہے جس سے افکار وخیالات کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور جس کے سہارے ہم زندگی، قوت اور طاقت کے دائمی سرچشمے تک پہنچتے ہیں۔اس کا خیال ہے وہ از سر نو زندگی اور طاقت حاصل کرے گا تو اس طرح کہ اپنے افکار وخیالات اور جذبات واحساسات کی دنیا تنگ کرتا کرتا چلا جائے۔عصر حاضر کی لادین اشتراکیت کا مطمح نظر بیشک نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش وسرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا لیکن اس کی اساس چوں کہ ہیگل کے مخالف نظر متبعین پر ہے۔لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسرپیکار ہے جو اس کے لیے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔ بہرحال یہ وطنیت ہو، یا لادین اشتراکیت، دونوں مجبور ہیں کہ بحالت موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں تطابق وتوافق کی جو صورت ہے اس کے پیش نظر ہر کسی کو نفرت بدگمانی اور غم وغصے پر اکسائیں۔حالاں کہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔لہٰذا یہ ازمنہ متوسط کا تصوف ہے، نہ وطنیت اور لادین اشتراکیت جو اس مایوسی اور دل گرفتگی کا مداوا بنے گی جس میں آج کل کی دنیا گرفتار ہے اور جس کے زیر اثر تہذیب انسانی کو ایک زبردست خطرہ درپیش ہے۔معلوم ہوتا ہے اس وقت دنیا کو حیاتیاتی اعتبار سے زندہ ہونے کی ضرورت ہے۔گویا عصر حاضر کا انسان اگر پھر سے وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھا سکے گا جو علوم جدیدہ کے نشوونما نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت، یوں ہی اس کے اندر ایمان ویقین کی اس کیفیت کا احیا ہوگا جس کی بدولت وہ اس زندگی میں ایک شخصیت پیدا کرتے ہوئے آگے چل کر بھی اسے محفوظ اور برقرار رکھ سکے گا۔اس لیے کہ مذہب یعنی جہاں تک مذہب کے مدارج عالیہ کا تعلق ہے، نہ تو محض عقیدہ ہے، نہ کلیسا، نہ رسوم وظواہر، لہٰذا جب تک انسان کو اپنے آغاز وانجام، یا دوسرے لفظوں میں اپنی ابتدا اور انتہا کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا جس میں باہم دگر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، نہ اس تہذیب وتمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

پھر جیسا کہ ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہب کی حیثیت دراصل اس اقدام کی ہے جو بالارادہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ ہم اس اصول تک پہنچ سکیں جس پر فی الحقیقت قدروں کا دارومدار ہے اور جن کے سہارے ہم اپنے قوائے ذات کی شیرازہ بندی کرسکیں۔ پھر یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں دنیا کا سارا مذہبی ادب علیٰ ہٰذا کملائے مذہب کے مشاہدات بطور تائید پیش کیے جاسکتے ہیں، خواہ ان کا اظہار کسی ایسی نفسیات کے صور افکار میں ہوا جو اب مردہ ہوچکی ہے۔ مذہبی مشاہدات ایسے ہی طبعی اور فطری ہوتے ہیں جیسے ہمارے معمول کے مشاہدات اور ان کے اندر بھی صاحب واردات کے لیے تعقل کا ایک عنصر شامل رہتا ہے۔ لیکن یہاں جو بات اہم ہے وہ یہ کہ یہی مشاہدات ہیں جن کی بدولت صاحب مشاہدات اپنی خودی کی قوتوں کو ایک مرکز پر لاتا اور اس طرح ایک نئی شخصیت کی تعمیر کرلیتا ہے۔ ہم ان مشاہدات کو سوئے اعصاب کا نتیجہ ٹھہرائیں۔ یا صوفیانہ کہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ نہ اس طرح یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان کے معنی کیا ہیں اور قدر و قیمت کیا۔ لہٰذا اگر کبھی ہمارا مطمح نظر طبیعات کی سطح سے آگے بڑھ سکے تو ہمیں اس امکان کا حوصلے سے سامنا کرنا چاہیے، خواہ اس طرح ہماری زندگی یا ہمارے غور وفکر کے معمول میں تھوڑا بہت فرق ہی کیوں نہ آجائے۔ حق کا تقاضا بہرحال یہ ہے کہ ہم نے اس باب میں جو روش اختیار کر رکھی ہے اسے بلا تامل ترک کردیں۔ مانا کہ اس قسم کے مشاہدات یعنی مذہبی احوال وواردات کی صورت میں ابتدا خصوصی طور پر بھی کچھ اختلال رونما ہوجاتا ہے، لیکن اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ کہا جاتا ہے جارج فاکس کو سوئے اعصاب کی شکایت تھی، لیکن جارج فاکس نے انگلستان کی مذہبی زندگی کا تزکیہ جس طرح کیا اس سے کوئی انکار کرسکتا ہے۔ کچھ ایسے ہی نظریے نفسیاتی اعتبار سے آنحضرت کی ذات والاصفات کے بارے میں بھی قائم کیے جاتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچیے تو کہ جب کوئی انسان تاریخ عالم کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل کر اسے ایک نئی سمت پر ڈال دے تو نفسیات کے لیے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم ان واردات کی سنجیدگی سے تحقیق کریں جن کی بدولت غلاموں کے اندر وہ صفات پیدا ہوئیں کہ انہوں نے دنیا کی امامت اور رہنمائی کا فریضہ ادا کیا اور جن کی زیر اثر قوموں اور نسلوں کے اخلاق وکردار اس طرح بدلے کہ ان کی زندگی نے ایک بالکل نئی شکل اختیار کرلی۔ لہٰذا جب ہم ان گوناگوں سرگرمیوں کا تصور کرتے ہیں جن کا آغاز پیغمبر اسلامؐ کی دعوت سے ہوا، علیٰ ہٰذا اس روحانی کشاکش کا جس سے آپ کو گزرنا پڑا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا کہ اس طرح آپ کی سیرت وکردار نے کیا اثرات قبول کیے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ نتیجہ تھا۔ چند خیالی باتوں کا۔ ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں تو صرف اس خارجی صورت احوال کی رعایت سے جو نئے نئے ولولوں، نئی نئی اجتماعی تنظیمات اور نئے نئے اقدامات کا سرچشمہ بنی۔ گویا بشریات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہم انسانوں کے نظم اجتماعی کا تعلق ہے مہتوسین کی بدولت وقت کی بڑی کفایت ہوتی ہے۔ وہ حقائق کی صنف بندی یا ان کے اسباب وعلل کی تحقیق نہیں کرتے۔ ان کی نگاہیں زندگی اور حرکت پر ہوتی ہیں، کیوں کہ وہ چاہتے ہیں انسان کی سیرت اور کردار نئے نئے سانچوں میں ڈھال دیں اور یوں ان کے لیے نئے نئے نمونے وضع کریں۔ لہٰذا ان کا راستہ بھی ایسا ہی پرخطر ہوتا ہے جیسے سائنس دانوں کا جن کا دارومدار تمام تر واردات حواس پر ہے۔ ان کے لیے بھی ویسے ہی فریب اور التباسات ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب ہم ان کے طرز زندگی کا مطالعہ بہ نگاہ غائر کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ وہ بھی اپنے مشاہدات اور تجربات میں کھرے سے کھوٹا الگ کرنے میں ویسا ہی اہتمام کرتے ہیں جیسے ارباب سائنس اپنے مشاہدات میں۔

لہٰذا ہم لوگ جو اس قسم کے مشاہدات اور تجربات سے محروم ہیں ہمیں کسی ایسے منہاج تحقیق کی ضرورت ہے جس سے ان غیر معمولی تجربات اور مشاہدات کی حقیقی ماہیت اور کنہ دریافت ہوسکے۔ مشہور عرب مورخ ابن خلدون جو تاریخ جدید کے علمی مطالعہ کا موسس ہے، پہلا شخص تھا

جس نے نفسیات کے اس پہلو میں نہایت گہرے غور وفکر سے کام لیتے ہوئے وہ تصور قائم کیا جسے آج کل نفس تحت الشعور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر سر ولیم ہملٹن نے انگلستان اور لائب نٹس نے جرمنی میں نفس انسانی کے ان غیر معمولی مظاہر کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا۔ بایں ہمہ ینگ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ہم اس کا مطالعہ تحلیلی نفسیات کی رو سے نہیں کر سکتے۔ تحلیلی نفسیات اور فن شاعری کو باہم جو نسبت ہے اس سے بحث کرتے ہوئے ینگ نے لکھا ہے کہ فن کا صرف وہی پہلو جو صوری طور پر متشکل ہوتا ہے نفسیات کا موضوع بن سکتا ہے اس لیے کہ نفسیات کی رو سے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم فن کی ماہیت اور کنہ تک پہنچ سکیں۔ لہٰذا ینگ کہتا ہے ''کچھ ویسا ہی امتیاز ہمیں مذہب کے باب میں بھی قائم کرنا پڑے گا۔ یہاں بھی نفسیاتی لحاظ سے بحث کی جا سکتی ہے تو مذہب کے جذباتی پہلو، یا رموز و کنایات سے لیکن یہ وہ باتیں ہیں جن سے مذہب کی حقیقی ماہیت کا نہ تو انکشاف ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے، ورنہ مذہب کیا ہم فن کو بھی نفسیات ہی کی ایک شاخ ٹھہراتے۔'' بایں ہمہ ینگ نے اپنے اس اصول کی ایک نہیں کئی مرتبہ خلاف ورزی کی ہے۔ یوں بھی نفسیات حاضرہ نے اس سلسلے میں جو طریق بحث اختیار کر رکھا ہے اس سے اس بارے میں کوئی بصیرت حاصل نہیں ہوتی کہ مذہب کی ماہیت دراصل کیا ہے، نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا۔ اس سے کوئی نتیجہ مترتب ہوا تو یہ کہ نئے نئے نظریوں کا ایک بے معنی طومار ہمارے سامنے آ گیا ہے جس کی بنا سرتا سر غلط فہمی پر ہے اور جن میں مذہب کو، جیسا کہ اپنی اعلیٰ اور ارفع شکل میں اس کا اظہار ہوتا ہے نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں ایک ایسے راستے پر ڈال دیا گیا ہے جو کہیں نہیں پہنچتا۔ ان نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو مذہب میں خودی کا تعلق کسی ایسی حقیقت سے قائم نہیں ہوتا جو ہماری ذات سے باہر اور خارج میں واقع ہو۔ برعکس اس کے یہ ایک مخلصانہ حیلہ ہے جس کو ہم اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ جماعت پر کچھ اخلاقی بندشیں عائد کر دیں اور یوں اس کا تار و پود خودی کی نا قابل مزاحمت جبلتوں سے محفوظ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نفسیات کی رو سے عیسائیت مدت ہوئی اپنا یہ ''حیاتی'' منصب پورا کر چکی، حتیٰ کہ عہد حاضر کا انسان تو یہ بھی نہیں سمجھتا کہ اس کا منشا و مدعا فی الحقیقت تھا کیا۔ ینگ کہتا ہے:

> ''ہم آج بھی اسے سمجھ لیتے اگر ہمارے رسم و رواج میں قدیم وحشت اور بربریت کا ذرا سا شائبہ موجود ہوتا۔ ہم اس بے روگ شہوت رانی کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے جو قیاصرہ کے روما میں ایک طوفان کی طرح بار بار سر اٹھاتی۔ آج کل کا متمدن انسان تو جنسی تسکین کے ان مظاہر سے بہت ہٹ چکا ہے۔ برعکس اس کے وہ سوئے اعصاب میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں تو اب وہ تقاضے ہی موجود نہیں جن کی بنا پر کبھی عیسائیت کا ظہور ہوا تھا۔ ہمیں کیا معلوم وہ تقاضے کیا تھے۔ ہم نہیں سمجھتے عیسائیت ہمیں کس چیز سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ اب تو ہر روشن خیال انسان یہی سمجھتا ہے کہ مذہبیت بڑی حد تک فساد اعصاب ہی کی ایک شکل ہے۔ پچھلے دو ہزار برس میں البتہ عیسائیت نے اپنا وظیفہ ضرور ادا کیا۔ اس نے کچھ ایسی بندشیں اور رکاوٹیں عائد کر دی ہیں جن سے ہماری گنہگاری کے منظر ہماری اپنی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔''

لیکن اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ینگ کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ بات یہ ہے کہ جنسی ضبط نفس خودی کی تربیت کا اولین مرحلہ ہے اور اس لیے مذہب چاہتا ہے اس نشو و نما کو اس راستے پر ڈال دے جس کا تعلق خودی کی تقدیر اور مستقبل سے ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت صرف اس امر تک محدود نہیں کہ جس ماحول میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں ہماری حیات اجتماعیہ کا تار و پود اخلاقی اعتبار سے محفوظ رہے۔ مذہبی زندگی کی بنیاد ہمارا یہ ادراک ہے کہ خودی کی وحدت کو جو یوں دیکھنے میں بڑی نازک اور ناپائیدار نظر آتی ہے اور جسے ہر لحظہ ہلاکت اور فنا کا خدشہ ہے۔ پھر سے تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اس

میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ہر ماحول میں خواہ ہمیں اس کا علم ہو، یا نہیں زیادہ سے زیادہ آزادی سے کام لیتے ہوئے جیسے مواقع چاہے پیدا کر لے۔ یہ ادراک ہے جس کے ماتحت اعلیٰ مذہبی زندگی میں ہماری نگاہیں محسوسات مدرکات کی اس نوع کی طرف منعطف ہو جاتی ہیں جن سے حقیقت کی بعض بڑی نازک حرکات کا سراغ ملتا ہے اور جو اس پہلو سے کہ خودی حقیقت کی ترکیب میں ایک دوامی عنصر بن جائے، اس کے تقدیر اور مستقبل کے لیے بڑے فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو نفسیات حاضرہ نے مذہبی زندگی کا گویا نشر تک بھی نہیں چھوا۔ وہ اس تنوع اور گونا گونی سے بالکل بے خبر ہے جو مذہبی واردات اور مشاہدات میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جس کا تھوڑا بہت اندازہ شاید آپ سترہویں صدی کے ایک بہت بڑے مرشد کامل حضرت شیخ احمد سرہندی کی ایک عبارت سے کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے تصوف کا تجزیہ جس بے باکی اور تنقید سے کیا اس سے سلوک و عرفان کا ایک نیا طریق وضع ہوا۔ ان سے پہلے جتنے بھی سلسلہ ہائے تصوف رائج ہوئے وہ یا تو وسط ایشیاء یا سرزمین میں عرب سے آئے تھے۔ مگر یہ صرف انہیں کا طریق ہے جس نے ہندوستان کے حدود سے نکل کر باہر کا رخ کیا۔ اور جواب بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک بہت بڑی اور زندہ قوت کی شکل میں موجود ہے۔ البتہ جہاں تک شیخ موصوف کی عبارت کا تعلق ہے مجھے ڈر ہے میں نفسیات حاضرہ کی زبان میں اس کے حقیقی معنی شاید ہی بیان کر سکوں۔ کیوں کہ اس قسم کی زبان موجود ہی نہیں۔ لیکن میرا مقصد چوں کہ سردست صرف اتنا ہے کہ آپ کی توجہ مذہبی واردات کے اس تنوع اور گونا گونی کی طرف منعطف کراؤں جن سے ایک سالک راہ کو گزرنا پڑتا ہے اور جن کی چھان بین اس لیے ضروری ہے، لہٰذا آپ مجھے ان غیر مانوس مصطلحات کے لیے معذور سمجھیں جن کا تعلق ایک دوسری سرزمین اور ایک ایسی نفسیات مذہب سے ہے جس نے تہذیب و تمدن کی ایک سرتاسر مختلف فضا میں پرورش پائی تھی اور جو وضع ہوئیں تو اس کے زیر اثر، لیکن جن میں سچ مچ معانی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ بہرحال اب میں شیخ موصوف کی عبارت پیش کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ جب ایک شخص عبدالمومن نام کے اس مشاہدے اور تجربے کا حال شیخ موصوف سے بیان کیا گیا:

> ''میرے لیے نہ تو ارض و سماوات کا وجود ہے نہ عرش الٰہی کا، نہ جنت اور دوزخ کا۔ میں اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہوں تو ان کو کہیں نہیں دیکھتا میں جب کسی کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ بلکہ میں اپنا وجود کھو دیتا ہوں۔ ذات الٰہیہ لامتناہی ہے۔ کوئی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہی منتہا ہے روحانی مشاہدات کا۔ کسی ولی کا گزر اس سے آگے نہیں ہوا۔''

تو اس پر شیخ نے فرمایا:

> ''میرے سامنے جو مشاہدات بیان کیے گئے ہیں ان کا تعلق قلب کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے صاحب مشاہدات نے قلب کے لاتعداد مقامات میں سے ابھی ایک چوتھائی بھی طے نہیں کیے۔ ان مقامات کا طے کرنا ضروری ہے تاکہ عالم روحانیت کے مقام اول کے مشاہدات کی تکمیل ہو جائے۔ اس مقام کے بعد اور بھی کئی مقامات ہیں۔ مثلاً روح کا مقام، سر خفی اور سر اخفی کے مقامات۔ ان سب مقامات کے جن کو مجموعاً ہم اپنی اصطلاح میں عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنے اپنے احوال اور واردات ہیں۔ جب سالک کا گزر ان مقامات سے ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ اس پر اسمائے الٰہیہ اور پھر صفات الٰہیہ کی تجلی ہوتی ہے۔ بالآخر ذات الٰہیہ کی۔''

شیخ موصوف نے ان ارشادات میں جو امتیازات قائم کیے ہیں ان کی نفسیاتی اساس کچھ بھی ہو اس سے اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ اسلامی

تصوف کے اس مصلحِ عظیم کی نگاہوں میں ہماری اندرونی واردات اور مشاہدات کی دنیا کس قدر وسیع ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ان بے مثال واردات اور مشاہدات سے پہلے جو وجودِ حقیقی کا مظہر ہیں، عالم امر یعنی اس دنیا سے گزر کرنا ضروری ہے جسے ہم رہنما توانائی کی دنیا کہتے ہیں۔ ہم نے اس لیے تو کہا تھا کہ نفسیات حاضرہ کا قدم ابھی مذہبی زندگی کے قشر تک نہیں پہنچا۔ یوں بھی بحالتِ موجودہ ہمیں حیاتیات ہی سے کوئی توقع ہے نہ نفسیات سے۔ یہ اس لیے کہ جس تنقید کا دارومدار محض تحلیل و تجزیے پر ہے، یا جو علم صرف اس امر تک محدود ہے کہ مذہبی زندگی کا اظہار اگر کبھی مخصوص تشبیہوں اور استعاروں میں ہوا تو یہ دیکھا جائے کہ عضوی اعتبار سے کن احوال و کیفیات کے ماتحت اس کی بدولت ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی کے نقطۂ نظر سے انسانی شخصیت کا راز کیا ہے۔ مانا کہ مذہبی زندگی کی تاریخ میں جنسی تشبیہوں اور استعاروں کا تھوڑا بہت دخل ضرور رہا ہے، علیٰ ہذا یہ کہ مذہب نے زندگی سے فرار اور گریز کے خیالی طور وطریق بھی وضع کیے، بلکہ کوشش کی کہ ایک ناخوشگوار حقیقت سے موافقت کا ذریعہ بن سکے۔ لیکن یہ وہ باتیں ہیں جن سے مذہب کا حقیقی نصب العین سرمو متاثر نہیں ہوتا۔ یعنی اس کی یہ کاوش کہ ہم اپنی متناہی خودی کو زندگی کے دائمی اور سرمدی عمل سے قریب تر لائیں اور پھر اسے از سرِ نو تعمیر کریں، تا آنکہ باعتبار مابعد الطبعیات ہمیں وہ مرتبہ و مقام حاصل ہو جائے جس کا ہم اپنے موجودہ ماحول کی گھٹتی ہوئی فضا میں صرف ہلکا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا نفسیات کی بدولت اگر حیاتِ انسانی میں فی الواقعہ کچھ معنی پیدا ہوں گے تو جب ہی کہ وہ اپنا الگ تھلگ اور آزادانہ منہاج وضع کرے۔ یوں ہی اس کے پیشِ نظر ہم کوئی ایسا طریق بحث اختیار کر سکیں گے جو آج کل کی طبائع اور مزاج کے عین مطابق ہو۔ ممکن ہے نفسیات جن افراد کو بظاہر دماغی مریض تصور کرتی ہے ان میں فی الواقعہ کوئی ایسی ہستی بھی نکل آئے جسے عقل و فکر سے غیر معمولی بہرہ ملا ہو اور جو اس قسم کا کوئی طریق وضع کر سکے۔ ہمارے نزدیک یہ امتزاج غیر ممکن نہیں۔ جدید یورپ میں نیٹشے جس کی زندگی اور سرگرمیوں سے کم از کم ہم اہلِ مشرق کے نزدیک تو نفسیات مذہب کی رو سے بڑے دلچسپ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، خلقی طور پر اس قابل تھا کہ اس کام کا بیڑا اٹھا سکتے۔ اس کے دل و دماغ کی سرگزشت پر نظر ڈالیے تو مشرقی تصوف کی تاریخ میں اس قسم کی اور بھی مثالیں مل جائیں گی۔ بے شک نیٹشے نے اپنے اندر عالم لاہوت کی ایک جھلک دیکھی اور وہ ایک حکمِ قطعی بن کر اس کے سامنے آئی ہم اس کو حکمِ قطعی ہی کہیں گے کیوں کہ یہی جھلک تھی جس کی بدولت اس میں ایک پیغمبرانہ سی ذہنیت پیدا ہو گئی، وہ ذہنیت جو اس قسم کی تجلیات کو کسی نہ کسی طرح زندگی کی مستقل قوتوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ لیکن نیٹشے کو اس میں بجز ناکافی اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ اس لیے کہ اس کے روحانی اسلاف میں شوپن ہاوئر، ڈارون اور لانگے ایسی ہستیاں شامل تھیں اور یہ انہیں کا اثر تھا کہ نیٹشے ان تجلیات اور مشاہدات کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکا۔ بجائے اس کے کہ وہ کسی ایسے روحانی اصول کی جستجو کرتا جس سے ایک عامی کے اندر بھی روحانیت کی دنیا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک لامتناہی مستقبل اس کے سامنے ہے، نیٹشے یہ سمجھا کہ اس نے جس عالم کی جھلک دیکھی ہے اس کا اظہار ہو گا تو انتہائی امارت پسندی کے کسی نظام کی شکل میں۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے:

آنچہ او جوید مقام کبریاست
ایں مقام از علم وحکمت ماوراست

خواست تا از آب وگل آید بروں
خوشۂ کزگشت دل آید بروں

یوں ایک بڑا ذہین وفطین انسان ضائع ہوگیا اور زندگی کی وہ جھلک بھی لا حاصل ثابت ہوئی جس کے لیے وہ صرف اپنی اندرونی قوتوں کا مرہون منت تھا۔ محض اس لیے کہ اسے کوئی مرشد کامل نہ ملا جو اس کی رہنمائی کرتا۔ پھر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ شخص جسے دیکھ دیکھ کر اس کے دوست بھی سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق شاید کسی ایسی سرزمین سے ہے جہاں کوئی انسان نہیں بستا، خوب جانتا تھا کہ اس کی روحانی ضروریات کیا ہیں۔ وہ کہتا تھا ''یہ صرف میں ہوں جسے ایک زبردست مسئلہ درپیش ہے۔ معلوم ہوتا ہے میں کسی جنگل میں کھویا گیا ہوں کسی ازلی زندگی میں۔ کاش کوئی میری دستگیری کرتا میرے کچھ مرید ہوتے۔ میرا کوئی آقا ہوتا۔ اس کی اطاعت میں کیسا لطف ملتا'' وہ یہ بھی کہتا تھا۔ ''مجھے اسی طرح کے انسان کیوں نہیں ملتے جن کی نگاہیں مجھ سے بھی بلند ہوتیں، جو مجھ کو حقارت سے دیکھتے۔ شاید اس لیے کہ میں نے ان کی تلاش میں پورے خلوص سے کام نہیں لیا، حالاں کہ میں ان کے لیے تڑپ رہا ہوں۔''

دراصل مذہب اور سائنس کی منزل مقصود، گو ان کے منہاجات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ایک ہے۔ دونوں کی آرزو ہے کہ حقیقت کی تہہ اور کنہ تک پہنچیں، حتیٰ کہ مذہب جیسا کہ ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں۔ سائنس سے بھی کہیں بڑھ کر حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا خواہش مند ہے۔ مگر پھر دونوں کے نزدیک ''موجود حقیقی'' تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کہ ہم اپنے محسوسات و مدرکات کی چھان بین کرتے رہیں۔ لیکن ہم اس نکتے کو جب ہی سمجھیں گے جب اپنے محسوسات و مدرکات میں بحیثیت حقائق طبیعی جن سے حقیقت کے کردار کی جیسا کہ معمولاً ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں ترجمانی ہوتی ہے اور محسوسات و مدرکات میں اس حیثیت سے کہ حقیقت کی کنہ اور اندرونی ماہیت کے فہم میں ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ بطور حقائق طبیعی تو ہم ان کی توجیہ، نفسیاتی اور عضویاتی دونوں پہلوؤں سے، ان کے سوابق کو دیکھتے ہوئے کریں گے لیکن اس لحاظ سے کہ حقیقت کی کنہ اور ماہیت کے بارے میں ان کے اندر کچھ معنی پائے جاتے ہیں ہم ان کا مطلب کسی اور ہی معیار سے کام لیتے ہوئے سمجھیں گے۔ یا پھر یوں کہئے کہ سائنس کی دنیا میں تو ہم ان کے معنی حقیقت کے خارجی کردار کی رعایت سے سمجھتے ہیں، لیکن مذہب کی دنیا میں اس طرح کہ وہ جس حقیقت کی نمائندگی کر رہے ہیں، ان کے معنی اس حقیقت کی اندرونی ماہیت کی رو سے سمجھیں۔ لہٰذا سائنس اور مذہب دونوں کے اعمال ایک طرح سے پہلو بہ پہلو یعنی باہم متوازی جاری رہتے ہیں۔ فرق ہے تو اتنا کہ سائنس کا عمل بے تعلقی کا عمل ہے جسے گویا ہم زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے سرانجام دیتے ہیں۔ برعکس اس کے مذہب کی صورت میں خودی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے رجحانات کا رخ چوں کہ اس طرف ہے کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ لہٰذا ان سب کو باہم مجتمع کیا جائے محض اس لیے کہ ہم کوئی ایسا طرز عمل اختیار کر سکیں جو ان سب کو اپنے اندر سمیٹ لے اور جس کی بدولت ہمارے محسوسات و مدرکات باہم مل کر ایک نئی شکل میں متشکل ہو جائیں۔ لہٰذا یہ دونوں عمل جن سے فی الحقیقت ایک دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے جب بغور ہمارے مطالعہ میں آتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دونوں اپنے اپنے مخصوص حلقہ کار میں محسوسات و مدرکات کے تزکیہ و تمحیص میں لگے رہتے ہیں۔ ہم اپنا مطلب ایک مثال سے واضح کر دیں گے۔ مہیوم نے علت کے تصور کی جو تنقید کی ہے اس کا تعلق فلسفہ کی بجائے دراصل سائنس کی تاریخ سے ہے۔ سائنس کی اختباریت، یا سیت پسندی کا تقاضا ہی یہ تھا کہ ہم ان تصورات سے احتراز کریں جن کی نوعیت داخلی ہے۔ لہٰذا ہیوم کی تنقید کا مطلب یہ تھا کہ علوم اختباری یعنی سائنس کا دامن قوت کے تصور سے پاک ہو جائے کیوں کہ قوت وہ تصور ہے جس کی بنا بقول ہیوم مدرکات حواس پر نہیں۔ گویا یہ پہلی کوشش تھی جو موجودہ ذہن نے اس لیے کہ کہ سائنس کا عمل غیر حسی تصورات سے پاک ہو جائے۔

آئن سٹائن کے تصور کائنات سے جو اس نے ریاضیات کے نقطۂ نظر سے قائم کیا گویا اس عمل کی جس کی ابتدا ہیوم نے کی تھی تکمیل ہوگئی۔

جیسا کہ ہیوم کی تنقید کا تقاضا تھا اس نظریے نے قوت کے تصور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ کچھ ایسے ہی تزکیے کا، جیسا کہ اس جلیل القدر ہندی صوفی کے ارشادات سے جن کو ہم نے ابھی پیش کیا تھا ظاہر ہوتا ہے وہ شخص بھی آرزومند ہے جس کو نفسیات مذہب سے عملی دلچسپی ہے۔ اس کی حس معروضیت بھی ایسی ہی تیز ہے جیسے سائنس داں کی اپنے حلقہ معروضیت میں۔ وہ بھی ایک مشاہدے کے بعد دوسرے مشاہدے میں قدم رکھتا ہے۔ اس کی حیثیت بھی تماشائی کی نہیں، بلکہ ایک ناقد اور مبصر کی ہے۔ وہ بھی اپنے دائرہ تحقیق کے پیش نظر جن طریقوں سے کام لیتا ہے ان کے اصول وقواعد کے مطابق محسوسات ومدرکات کی چھان بین کرتا اور ہر ایسے عضو کو خواہ وہ عضویاتی ہو، یا نفسیاتی مگر جس کی نوعیت داخلی ہے ان کے مشمول سے خارج کر دیتا ہے، کیوں کہ اس کی آرزو بھی یہی ہے کہ اس حقیقت تک پہنچے جس کی حیثیت فی والواقعہ معروضی ہے۔ یوں بالآخر وہ اپنا گزر جس تجربے اور واردے سے کرتا ہے اس سے زندگی کا ایک نیا عمل اس پر منکشف ہوتا ہے۔ اصلی، اساسی، ابدائی۔ پھر یہ خودی کا ایک ازلی راز ہے کہ جہاں اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا اسے یہ ماننے میں مطلق تامل نہیں رہتا کہ یہی دراصل اس کی ہستی کی حقیقی اساس ہے۔ بایں ہمہ یہ کوئی پراسرار تجربہ نہیں۔ نہ اس میں جذبات کو دخل ہے۔ چناں چہ اسلامی تصوف نے تو اس خیال سے کہ ہمارے مشاہدات میں جذبات کی آمیزش نہ ہونے پائے موسیقی تک کو عبادت میں جگہ نہیں دی۔ بعینہٖ اس نے صلوٰۃ باجماعت پر زور دیا کہ ایسا نہ ہو ہمارے مراقبوں اور ہمارے ذکر وفکر سے مصالح جماعت کو نقصان پہنچے۔ بہرحال یہ تجربہ سرتاسر فطری اور طبعی ہوگا اور حیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو خودی کے لیے سب سے زیادہ اہم، کیوں کہ یہی اس کا فکر کی حدود سے آگے بڑھنا اور یہی اس کا وجود سرمدی کو اپناتے ہوئے اپنی ناپائیداری کی تلافی کرنا ہے۔ یہاں کوئی خطرہ ہے تو یہ کہ اس آخری تجربے سے پہلے سالک راہ کو جو مشاہدات ہوتے ہیں ان سے لطف اندوزی یا انہماک واستغراق میں وہ کہیں اپنی تلاش اور جستجو کا عمل ترک نہ کر دے۔ مشرقی تصوف کی تاریخ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطرہ بے بنیاد نہیں، چناں چہ ہم نے جس ہندی بزرگ کے ارشادات کا حوالہ دیا ہے ان کی تحریک اصلاح میں بھی یہی نکتہ مضمر تھا اور اس کے وجود بھی ظاہر ہیں۔ خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھے، بلکہ یہ کہ کچھ بن جائے۔ پھر یہ درحقیقت کچھ بن سکنے ہی کی کوشش ہے جس میں بالآخر اسے موقعہ ملتا ہے کہ اپنی معروضیت کا زیادہ گہرا ادراک پیدا کرتے ہوئے زیادہ عمیق اور مستحکم بنا پر ''انا الموجود'' کہہ سکے، یعنی وہ اپنے وجود کی کنہ اور اساس کو پالے۔ یہ اس لیے کہ اس حقیقت کا انکشاف ہوگا تو دیکارت کے ''میں سوچتا ہوں'' سے نہیں بلکہ کانٹ کے ''کرسکتا ہوں'' سے۔ خودی کا منتہائے جستجو یہ نہیں کہ اپنی انفرادیت کے حدود توڑ ڈالے۔ اس کا منتہا ہے اس انفرادیت کو زیادہ صحت کے ساتھ سمجھ لینا۔ لہٰذا اس کا آخری عمل فکر کا عمل نہیں۔ وہ ایک حیاتی عمل ہے جو اس میں گہرائی اور پختگی پیدا کرتا ہے اور اس کے ارادوں کو تقویت دیتے ہوئے ایک شان خلاقی کے ساتھ اس تیقن کا باعث ہوتا ہے کہ دنیا محض دیکھنے یا افکار وتصورات کی شکل میں سمجھنے کی چیز نہیں، بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنے مسلسل عمل سے بار بار بناتے اور بنا کر پر بناتے رہتے ہیں۔ یہ خودی کے لیے سرور وابتہاج کا انتہائی لمحہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انتہائی آزمائش کا بھی۔

زندہ یا مردہ یا جان بلب — از سہ شاہد کن شہادت راطلب
شاہد اول شعور خویشتن — خویش رادیدن بنور خویشتن
شاہد ثانی شعور دیگرے — خویش کا بینی بہ نور دیگرے
شاہد ثالث شعور ذات حق — خویش کا بینی بہ نور دیگرے
پیش ایں نور اربمائی استوار — می وقائم چوں خدا خود راشمار

برمقام خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مرد مومن درنسا زد باصفات مصطفیٰ راضی نشد الابذات
چیست معراج آرزوئے شاہدے امتحانے روبروئے شاہدے
شاہد عادل کہ بے تصدیق او زندگی مارا چوگل را رنگ وبو
درحضورش کس نماند استوار دربماند ہست اوکامل عیار
ذرہ از کف مدہ تابے کہ ہست پختہ گیر اندر گرہ تابے کہ ہست
تاب خود را بر فزودن خوشتراست پیش خورشید آزمودن خوشتر است
پیکر فرسودہ را دیگر تراش امتحان خویش کن موجود باش
ایں چنیں موجود محمود است وبس ورنہ تار زندگی دود است وبس

16.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے درجہ ذیل باتیں سیکھیں۔

☆ اقبال کائنات کے بارے میں دین ودانش، مذہب وفلسفہ اور ایمان وعقل کا نقطہ ہائے نگاہ کو بیان کرنے میں تقابلی مقابلہ کرتے ہیں۔

☆ علامہ اقبال عقل وعشق کے امتزاج کے حامی ہیں۔

☆ اقبال کی رائے میں صوفی اور پیغمبر کی وجدانی کیفیت میں بہت بڑا فرق ہے۔

☆ علامہ اقبال کے یہ خطبات اسلامی حکمت اور مغربی فلسفہ کا نچوڑ ہیں۔

☆ علامہ اقبال نے ان خطبات میں موجودہ زمانے کے فکری مسائل اور فلسفیانہ موضوعات پر اسلامی حکمت کے حوالے سے تنقید کی ہے۔

☆ اقبال نے ان خطبات میں مغرب کے جدید علوم کی روشنی میں حکمت اسلامیہ کے بعض اہم مسائل کی تشریح کرنے کی کوشش بھی کی ہے

16.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
روزافزوں	:	دن بہ دن ترقی کرنے والا
نقطۂ اتصال	:	دو چیزوں کے ملنے کی جگہ
ادق	:	نہایت باریک
افادیت	:	نفع پہنچانا
مرئی	:	جو دیکھنے میں آئے
غیر مرئی	:	جو آنکھوں سے دکھائی نہ دے، خیالی
ادراک	:	حقائق کو جاننے کی ذہنی صلاحیت

علت	:	وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب ہو
معلول	:	وہ چیز جو کسی علت کے نتیجے میں وجود میں آئے
استدلال	:	دلیل پیش کرنا
خلوت	:	تنہائی
استقرائی	:	تلاش اور تفحص سے متعلق
محرک	:	حرکت کرنے والا
ملل	:	ملت کی جمع
رجائیت	:	پرامید ہونا
افادیت	:	فائدہ مندی

16.6 نمونہ امتحانی سوالات

16.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اقبال نے اپنے خطبات کب اور کن شہروں میں دیے؟

2۔ اقبال کے خطبات کس عنوان سے شائع ہوئے؟

3۔ خطبات اقبال کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ کس نے اور کس نام سے کیا ہے؟

4۔ اقبال کے یہ خطبات پہلی مرتبہ کب شائع ہوئے؟

5۔ کس مشہور فلسفی نے ان خطبات کے بارے میں کہا تھا کہ یہ خطبات دور جدید کے احیاء علوم الدین کی حیثیت رکھتے ہیں؟

6۔ خطبات میں شامل پہلے خطبے کا عنوان کیا ہے؟

7۔ ان خطبات کی کل تعداد کتنی ہے؟

8۔ خطبات اقبال کے چند اہم موضوعات کی نشاندہی کیجیے۔

9۔ خطبات اقبال کے دو اہم مترجموں کے نام لکھیے۔

10۔ ''خطبات اقبال ایک مطالعہ'' کس کی تصنیف ہے؟

16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اجتہاد سے کیا مراد ہے؟

2۔ اقبال کے پہلے خطبہ کا مختصر خلاصہ لکھئے۔

3۔ الاجتہاد فی الاسلام کے موضوع کی وضاحت کیجیے۔

4۔ کیا مذہب کا امکان ہے؟ پر ایک مختصر نوٹ قلم بند کیجیے۔

5۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں کن موضوعات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ بیان کیجیے۔

16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے یہ خطبات اسلامی حکمت اور مغربی فلسفہ کا نچوڑ ہیں۔ وضاحت کیجیے۔

2۔ خطبات کے فکری لوازم کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

3۔ نظریہ تخلیق کے بارے میں اقبال کی کیا رائے ہے۔ وضاحت کیجیے۔

16.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	خطبات اقبال ایک مطالعہ	الطاف احمد اعظمی
2۔	خطبات اقبال۔ نئے تناظر میں	محمد سہیل عمر
3۔	خطبات اقبال۔ ایک جائزہ	محمد شریف بقا
4۔	خطبات اقبال۔ ترجمہ و تلخیص	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
5۔	خطبات اقبال پر ایک نظر	سعید احمد اکبر آبادی

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات : ۷۰ Marks : 70 وقت: 3 گھنٹے Time:3 hours

ہدایات:

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہیں۔ (10x1 = 10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال:1

(i) 'علامہ اقبال' کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

1877 (a) 1880 (b) 1890 (c) 1900 (d)

(ii) علامہ اقبال کی والدہ محترمہ کا کیا نام تھا؟

(a) کریم بی بی (b) امام بی بی (c) سردار بیگم (d) مختار بیگم

(iii) علامہ اقبال کو میونخ یونیورسٹی، لندن سے کس سنہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل ہوئی؟

1900 (a) 1905 (b) 1908 (c) 1910 (d)

(iv) علامہ اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ کون سا ہے؟

(a) بانگ درا (b) بال جبریل (c) ضرب کلیم (d) ارمغان حجاز

(v) نظم ''طلوع اسلام'' میں کتنے بند ہیں؟

15 (a) 12 (b) 10 (c) 09 (d)

(vii) نظم ''طلوع اسلام'' کس سنہ میں لکھی گئی؟

(a) 1920 (b) 1922 (c) 1924 (d) 1928

(vii) نظم ''خضر راہ'' اقبال کے کس مجموعے میں شامل ہے؟

(a) بانگ درا (b) بال جبریل (c) ضرب کلیم (d) ارمغان حجاز

(viii) ''اقبال سب کے لیے'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (b) جگن ناتھ آزاد (c) خلیفہ عبدالحکیم (d) آل احمد سرور

(ix) کلیات مکاتیب اقبال کا مرتب کون ہے؟

(a) شیخ محمد عطااللہ (b) شیخ اعجاز احمد (c) سید مظفر حسین برنی (d) عبداللہ قریشی

(x) اقبال کے خطبات کی تعداد کتنی ہے؟

(a) 12 (b) 10 (c) 08 (d) 07

حصہ دوم

2۔ اقبال کی ابتدائی تعلیمی زندگی پر نوٹ لکھیے۔

3۔ اقبال کے اردو شعری کارناموں کا تعارف پیش کیجیے۔

4۔ اقبال کے تصور مرد مومن کی وضاحت کیجیے۔

5۔ نظم ''خضر راہ'' کا پس منظر بیان کیجیے۔

6۔ اقبال کے تصور اسلام پر مضمون قلم بند کیجیے۔

7۔ اقبال کے مجموعے کلام ''ارمغان حجاز'' کا تعارف پیش کیجیے۔

8۔ اقبال کے خطوط میں سیاسی نظریات پر اظہار خیال کیجیے۔

9۔ اقبال کے پہلے خطبہ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

حصہ سوم

10۔ علامہ اقبال کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

11۔ اقبال کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

12۔ اقبال کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

13۔ نظم ''مسجد قرطبہ'' کا تجزیہ پیش کیجیے۔

14۔ خطوط اقبال کا فکری و فنی مطالعہ پیش کیجیے۔